Done
Cat

سلسلۂ نصابیات تعلیمِ جامعہ عثمانیہ

تاریخ یورپ

تصنیف

اے۔ جے۔ گرانٹ

ترجمۂ

مولوی حمید احمد صاحب انصاری۔ بی۔ اے

مستجل و رفیق جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۵۰ھ م سنہ ۱۳۴۰ف م سنہ ۱۹۳۱ء

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب لانگمنس گرین اینڈ کمپنی کی اجازت سے
جن کو حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ
کرکے طبع و شائع کی گئی ہے

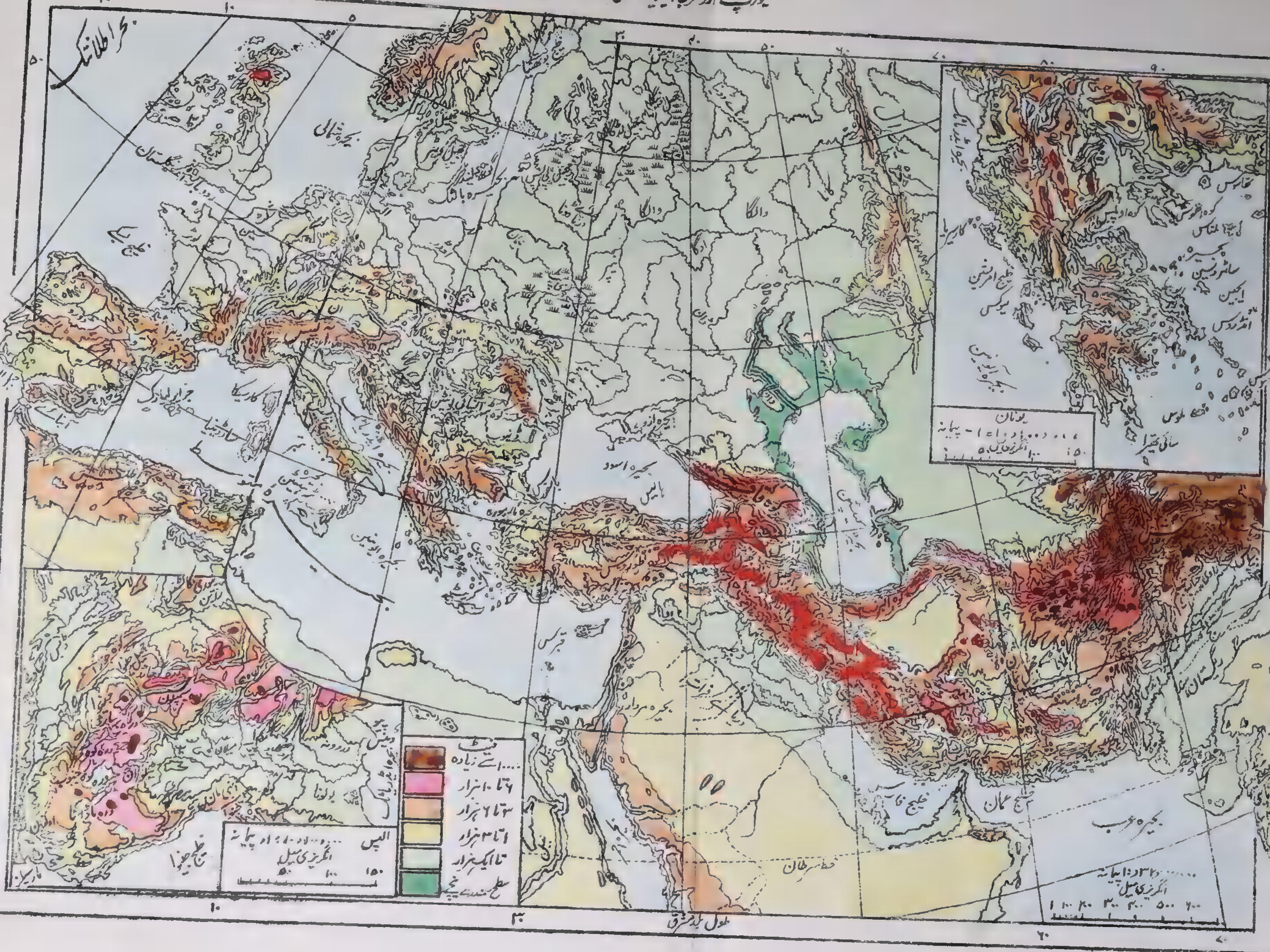
JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No. 456778
Date 22-5-03
SRINAGAR

940

فہرست مضامین تاریخ یورپ

حصۂ اول حصۂ دوم حصۂ سوم

یورپ اور مغربی ایشیا کا سطحی نقشہ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ یورپ

حصۂ اوّل

قرون اولیٰ

باب اوّل

تاریخ یورپ کا دورِ اوّلیں

یورپ کے تاریخی روایات اور تمدن میں چند ایسے ممتاز اور بدیہی خصوصیات ہیں جو مصر اور ایشیا کے تمدنوں میں مفقود ہیں۔ مگر چونکہ براعظم یورپ ایشیا اور افریقہ سے ملحق ہے اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قرون ماضیہ میں یورپ کی تہذیب، ایشیا اور مصر کے تمدن قدیم کی خوشہ چیں رہی ہے۔ دونوں تمدنوں میں کیا حقیقی تعلق تھا یا یونان نے مصر۔ لیڈیا۔ فینشیا اور اسیریا سے کس قدر فیض حاصل کیا؟ یہ ایسے مسائل ہیں جن کی اب تک تحقیق نہیں ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی ابتدائی تاریخ، جن تیرہ و تار بادلوں میں چھپی ہوئی ہے وہ تحقیق جدید کی تیز کرنوں کی تاب نہیں لا سکتے اور رفتہ رفتہ چھٹتے جاتے ہیں جس سے تاریکی کے بجائے اب

دُھندلی سی روشنی نظر آرہی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ تاریخ قدیم کے متعلق کچھ قابلِ وثوق حالات معلوم ہوں ضرورت ہے کہ تحقیقات کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو۔ اخفاوات کا کام اور سرگرمی سے کیا جائے۔ کتبے پڑھے جائیں اور گم شدہ زبانوں کے حروف معلوم ہوں۔ ماہرین فن جدید قیاسات پیش کرینگے اور ان پر ردّ و قدح ہوگی اگر ان مختلف اور متضاد آراء سے ممکن ہے کہ ایک حد تک انکشافِ حقیقت ہو۔ اس وقت صرف یہ ممکن ہے کہ تاریخ قدیم کے چند پہلوؤں پر سرسری نظر ڈالی جائے۔

مشہور یونانی شاعر ہومر کی رزمیہ نظمیں تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے نہایت ہی اہم و ممتاز ہیں کیونکہ ان کے مطالعہ سے ایک حد تک حقیقت حال منکشف ہوتی ہے اور انھیں سے تاریخ یورپ کی ابتدا ہے۔ اہل یورپ کے علمی ذخیروں میں یہ نظمیں سب سے قدیم ہیں اور زمانۂ حال تک ان سے بہتر یا ان کی ہم پلہ نظمیں نہیں لکھی گئیں۔ ان نظموں کی قدامت سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ یہ وحشیوں کے بے سرے ترانے ہیں بلکہ یہ نظمیں اس خاص صنف کلام یعنی رزمیہ شاعری کے بہترین اور قابل قدر نمونے ہیں۔ ہومر کی دو نظمیں ہیں جن میں سے ایک کو ایلیڈ اور دوسری کو آڈیسی کے نام سے مشہور ہے۔ دونوں نظموں کا موضوع ایک مشہور جنگ ہے جو یونانیوں اور ساکنین شہر ٹرائے کے مابین مدت تک جاری رہی۔ ایلیڈ میں جو شروع سے آخر تک بالکل رزمیہ رنگ میں ہے شہر ٹرائے کے محاصرے کا ذکر ہے اور خصوصاً مشہور یونانی سورما آکی لیس کی برافروختگی کا تذکرہ ہے جس کی وجہ سے یونانیوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اور ان کا سب سے جری سپاہی، یونانی سردار اگامیمنن کی بدسلوکی سے رنجیدہ ہو کر اپنے خیمے میں پڑا رہا۔ اصل قصہ تو صرف اسی قدر ہے مگر اس کے سلسلے میں شاعر نے یونانیوں اور ٹرائے والوں کی معرکہ آرائیوں کے نہ صرف عجیب و غریب قصے بیان کئے ہیں بلکہ ان کے رزم و بزم کے نقشے دکھائے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس انسانی جنگ میں دیوتا بھی وقتاً فوقتاً مداخلت کیا کرتے تھے اور گو رزمیہ رنگ غالب ہے مگر شرکائے جنگ کی حرماں نصیب بیویوں اور والدین کے درد مفارقت کو خوب دکھایا ہے۔ دوسری نظم یعنی آڈیسی کا موضوع اس سے زیادہ وسیع ہے

اس میں ایک یونانی سردار یولی سیس کی جہاں نوردی کا ذکر ہے جو محاصرۂ ٹرائے کے ختم ہو جانے کے بعد سرگرداں رہا اور بحری سفر کی صعوبتوں اور دیوتاؤں کی ناراضگی کی وجہ سے ایک مدت دراز کے بعد اپنے وطن پہنچا اور مختلف مقامات کی سیر کی۔ اس نظم سے اس زمانے کے طرز زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور نہ صرف سپاہیوں اور جنگجو لوگوں کا ذکر ہے بلکہ عورتوں کا بھی مثلاً اس کی وفادار بیوی پی نی لوپی، ساحرہ کرکی اور شہزادی ناسی کا، جسے شاعر نے حسن اور عالم دوشیزگی کا بہترین نمونہ بنایا ہے۔ شاعر ہم کو مختلف مجالس اور مختلف مذاق کے لوگوں میں لیجاتا ہے۔ کبھی ملاحوں میں کبھی شہروں کے سیاسی جلسوں اور کبھی تجارتی لوگوں کے کھیلوں میں گویا اس زمانے کے رسم و رواج کی ایک پوری تصویر ہے۔ اڈیسی الیڈ سے رزمیہ عظمت و شان میں کم مرتبہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ یورپین لٹریچر میں اس سے بہتر کوئی افسانہ نہیں۔ ہومر کی نظموں میں یورپ کی ابتدائی تاریخ کے متعلق سب سے پرانا مواد ملتا ہے۔ ایک مدت تک یہ مسائل زیر بحث تھے کہ ان نظموں کا مصنف کون ہے۔ تاریخی واقعات سے ان کو کہاں تک تعلق ہے اور سوسائٹی کی جو تصویر اس کے صفحوں میں کھینچی گئی ہے وہ کہاں تک صحیح ہے لیکن گزشتہ پچاس سال میں ایک قسم کا نیا مواد بھی مل گیا ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ اور ارباب حفر (Excavatoss) نے ایسا کام شروع کر دیا ہے۔ ۱۸۷۳ء میں شلائی مان نے ٹرائے میں زمین کھودنا شروع کیا اور زمین کے نیچے سے ایسے خزانے برآمد کئے جو ہزاروں سال سے دبے ہوئے تھے۔ اس محقق نے دوسرے مقامات پر بھی کامیابی کے ساتھ حفر کا کام کیا۔ اس کی کامیابی سے دوسروں کی بھی ہمت افزائی ہوئی مگر کسی کو اس قدر کامیابی نہ ہوئی گو ان کا اسلوب کار زیادہ با اصول تھا۔ شلائی مان کی تحقیقات نہایت دلچسپ اور مفید تھی مگر ڈاکٹر ایونس نے ۱۸۹۳ء میں کریٹ میں جو نئی باتیں معلوم کیں ان سے تاریخ قدیم کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئے تھے ان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ ڈاکٹر ایونس نے ایک گم شدہ تہذیب

کے آثار دریافت کیے جس کا مورخین کو کبھی وہم گمان بھی نہ ہوا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یورپ کے تہذیب و تمدن کا آغاز ہومر کی نظموں سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال قبل ہوا ہے۔ کتبے بھی دریافت کیے گئے مگر وہ ایسے حروف میں لکھے ہوئے ہیں جو اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔ جو مواد اس تحقیقات سے ہم پہنچا ہے اس سے بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً تمدن یورپ کی قدامت کس قدر ہے اور اس کو مشرق کی تہذیب و تمدن سے کیا تعلق ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ مدت تک اس تحقیقات میں مصروف رہینگے مگر اب ان نظریات کو چھوڑ کر ہمیں اصلی تاریخ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔

ہومر کی تصویریں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہومر کے نام سے جو نظمیں منسوب کی جاتی ہیں وہ اس کی ہیں یا کسی دوسرے مصنف یا مصنفین کی۔ ان امور کا ابھی قطعی تصفیہ نہیں ہوا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کے سیاسی اور تمدنی حالات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ باوجود افراط و تفریط صحیح ہے۔ علاوہ اس کے ادبی حیثیت سے یورپین تمدن کی یہ پہلی جھلک دلچسپی سے خالی نہیں۔

شاعر ہمیں ایک ایسا تمدن دکھاتا ہے جس میں یونانی قوم بے شمار دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہے جن کے ہاتھوں میں انسان کی بھلائی اور برائی تھی۔ زیس دیوتاؤں اور انسانوں کا باپ، دیوتاؤں پر حکمراں تھا مگر اسے کامل اختیارات حاصل نہ تھے۔ دیوتا طاقت کے لحاظ سے انسان سے افضل تھے کیونکہ وہ حیات و ممات کے پابند نہ تھے مگر ان کی اندرونی حالت انسان سے بہتر نہ تھی۔ زیس بھی نہ قادر مطلق تھا نہ احکم الحاکمین۔ اس کے اخلاق و عادات بھی ویسے ہی تھے جیسے ٹرائے کے سورماؤں کے۔ تمدن ابتدائی حالت میں تھا۔ مردوں کا پیشہ کاشتکاری اور جنگجوئی تھا اور بعض تجارت بھی کرتے تھے۔ غلامی پر تمدن کا دار و مدار تھا۔ اسیران جنگ غلام بنائے جاتے تھے۔ عورتوں کا اثر غالب تھا مگر قانوناً ان کی حیثیت غلاموں سے بہتر نہ تھی۔ دیہات میں پیتل سب سے زیادہ استعمال میں آتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ دور

حجریت ختم ہو گیا تھا اور عہد حدیدیت شروع ہو چکا تھا کیونکہ لوہے کا بھی جا بجا ذکر آتا ہے۔

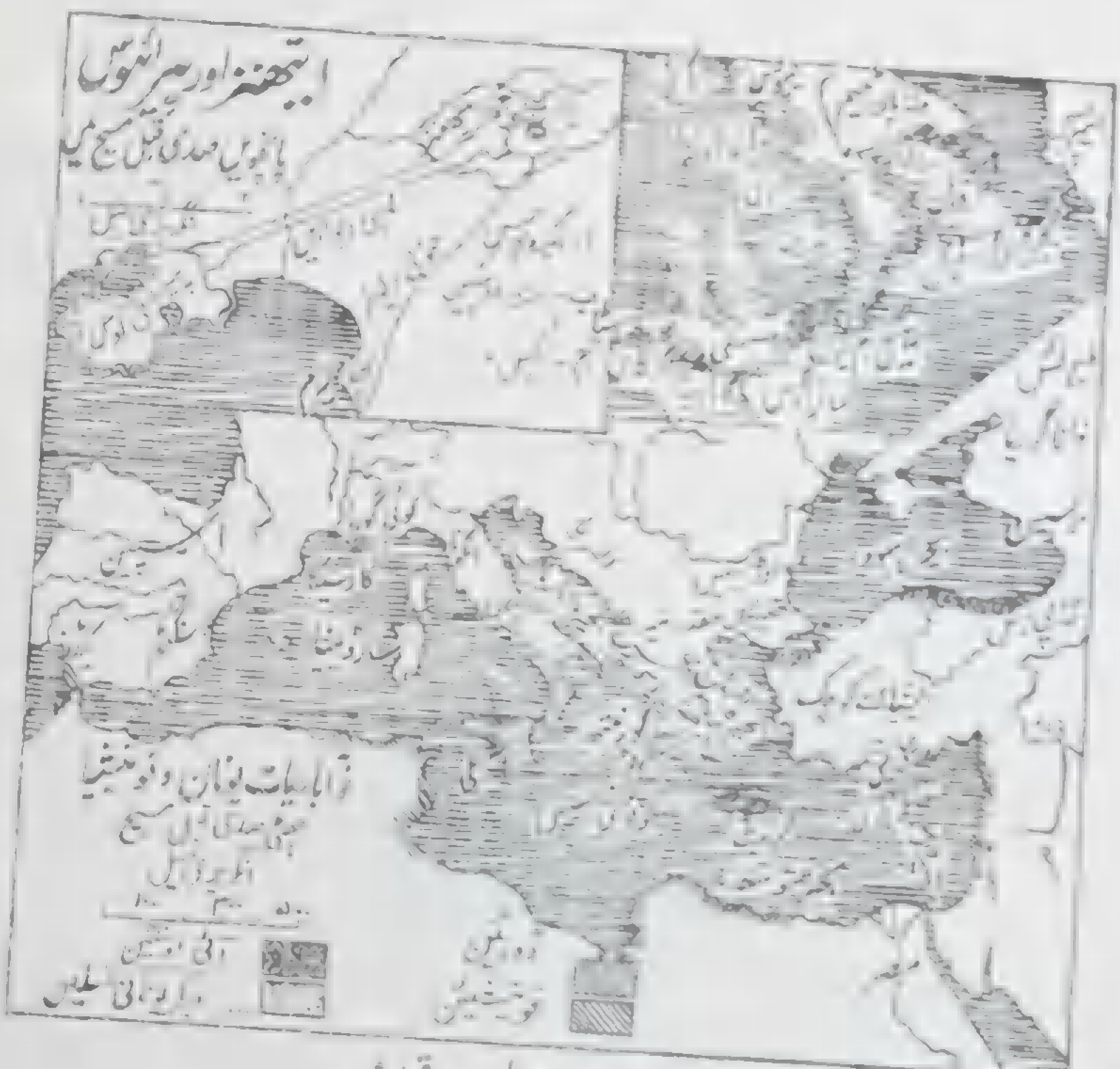
یونانیوں کی سیاسی حالت جو اس نظم میں بیان کی گئی ہے وہ مورخین کے لئے اور بھی دلچسپ ہے کیونکہ اسی خاکے پر یونان کی سیاسی عمارت کی بنیاد پڑی ہے اور یورپ کی سیاسی ترقی پر بھی اس کا بہت کچھ اثر پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم میں ایک بادشاہ ہوتا تھا مگر اس کو یہ منصب نہ صرف حسب و نسب کی بنا پر حاصل ہوتا تھا بلکہ دلاوری اور شجاعت اور فہم و ذکاوت کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ بالکل خود مختار نہیں ہوتا تھا کیونکہ تمام اہم سیاسی امور امراء کے مشورے سے طے ہوتے تھے اس لئے ہومر کے زمانے کی ریاستوں میں مجلس امراء کا دوسرا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مجلس بھی تھی جو بادشاہ اور مجلس امراء سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ بادشاہ اور اس کے امراء کسی کام کو شروع تو کر سکتے تھے مگر ان کو یہ آزادی نہ تھی کہ نہایت ہی اہم امور میں رعایا سے مشورہ لیئے بغیر قطعی تصفیہ کر لیتے اس لیئے اس قسم کے جملہ امور مجلس عام میں پیش ہوتے اور اس مجلس کو اختیار تھا کہ بادشاہ کے تجاویز کو قبول کرے یا ان پر عمل کرنے سے انکار کر دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابتدائی خاکے میں حکومت کے یہ وہی اشکال ہیں جن کو اب ہم ملکیت امرائیت اور جمہوریت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

باب دوم

یونان کی ابتدائی تاریخ

تمدن یورپ کی تاریخ میں سب سے نمایاں خصوصیت اس کی وسعت پذیری ہے یعنی جو خیالات اور جذبات ایک محدود طبقے میں مقید تھے وہ رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئے۔ یورپ کے ایک دورافتادہ گوشے (یونان) میں تہذیب اور تمدن کی ابتدا ہوئی۔ پھر بحیرۂ روم کے ساحلوں پر جو ممالک واقع ہیں ان میں پھیلی۔ وہاں سے اس کے اثرات مغربی یورپ میں پہنچے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ دنیا کے اکثر ممالک اس سے فیض یاب ہو گئے۔ یورپ نہ صرف یونان بلکہ روما اور شام اور دوسرے ممالک کا ممنون منت ہے مگر یونان کا اثر غالب اور ابھی تک باقی ہے کیونکہ زمانۂ حال کے تمدن کے جملہ ترقی پذیر عناصر کی ابتدا یونان ہی سے ہوئی ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ نہ تو اس کا رقبہ ہی زیادہ ہے اور نہ اس کے فوجی اور سیاسی کارنامے ہی دوامی اہمیت رکھتے ہیں پھر بھی اس ملک کی تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

یونان کا رقبہ بہت ذرا سا تھا مگر اس سے مغالطے میں نہ پڑنا چاہیئے۔ کیونکہ جس ملک کو اس وقت ہم یونان کہتے ہیں اس سے یونان کا رقبہ مسیحؑ سے چھ سو سال قبل بہت زیادہ تھا اور لفظ یونان (یا ہیلاس) کا اطلاق ان تمام ممالک پر تھا جہاں یونانی بودوباش رکھتے تھے۔ علاوہ یونان کے یونانی



نوآبادیات یونان و فونیشیا چھٹی صدی قبل مسیح میں

ایشیائے کوچک کے مغربی ساحلوں پر آباد تھے۔ بحیرۂ ایجین کے جزائر میں، سسلی اور جنوبی اٹلی اور بحیرۂ اسود، افریقہ اور بحیرۂ روم کے سواحل پر بھی وہ آباد تھے۔ مگران منتشر آبادیوں میں سیاسی اتحاد نہ تھا۔ یونانی بستیوں کا روئے زمین کے ایک وسیع رقبہ پر پھیل جانا یونانی تارکان وطن کی اولوالعزمی کا نتیجہ تھا مگر یہ یونانی نوآبادیوں کی سیاسی حالت زمانۂ حال کی نوآبادیوں سے بالکل مختلف تھی کیونکہ یونانی نوآبادی ابتدا ہی سے آزاد اور خود مختار ہوتی اور آبائی وطن سے سوائے یگانگت اور رسوم کی یکسانی کے کوئی تعلق نہ رہتا۔ یونان کی تاریخ بہت سی منتشر ریاستوں کی تاریخ ہے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا تھا کہ بوجہ ضرورت چند ریاستیں متحد ہو جایا کرتیں مگر باوجود روشن خیال مدبرین کی لگاتار کوششوں کے یونانی ریاستوں میں کبھی قومی اتحاد نہیں ہوا جس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ خطۂ یونان مقدونیہ کے پنجۂ ستم کا شکار ہوا حالانکہ مقدونیہ والے نیم مہذب تھے۔ یہ ریاستیں جو بحیرۂ اسود سے جبل الطارق تک پھیلی ہوئی تھیں سیاسی تمدنی اور مذہبی حالات میں ایک دوسرے سے غایت درجہ مختلف تھیں مگر بعض امور میں یک جہتی بھی تھی۔

مذہب کا اصل اصول ہر جگہ ایک ہی تھا۔ ہر جگہ مقامی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی مگر بڑے دیوتا جن کا ہومر کی نظموں میں ذکر ہے ان کے معتقدین ہر جگہ موجود تھے۔ ان میں اکثر تو ایسے ہیں جن کا تعلق عناصر یا رموز فطرت سے ہے مثلاً زیس (Zeus) آسمان ہے۔ پوسی ڈن (Poseidon) سمندر ہے۔ اپالو (Apollo) آفتاب ہے۔ ڈی می ٹر (Demeter) زمین اور پرسی فنی (Persephone) بویا ہوا تخم ہے مگر جیسے جیسے یونانیوں کی تخئیل میں ترقی ہوتی گئی دیوتاؤں کے خواص بھی اعلیٰ تر ہوتے گئے اور ان کی طرف اعلیٰ ترین اخلاق و عادات منسوب کیے جانے لگے اس طرح مذہب جہالت کی آلائشوں سے پاک ہوتا گیا۔ یونانی بستیوں میں دیوتاؤں کے بے شمار مندر تھے مگر ان میں بعض کو خاص فوقیت حاصل تھی اور یہ تمام قوم یونانی کی ملک خیال کیے جاتے تھے۔ دو مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے ایک اپالو کا مندر ہے جو ڈلیفی (Delphi) میں واقع تھا یہ دیوتا اپنے معتقدین کے سوالات کا جواب دیا کرتا جو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ اس قسم کے مندروں کو جہاں معتقدین کے سوالات کے جواب دیئے جاتے اورایکل (Oraele) کہتے تھے مگر ڈلیفی کے مندر کی وقعت اور شہرت سب سے زیادہ تھی اور اس کے اثر سے ایک اہم مگر ضعیف اتحاد اقوام یونان میں پیدا ہو گیا تھا۔

یہ مندر خلیج کورنتھ کے شمال میں یونان کے بلند ترین سلسلۂ کوہی کے دامن میں واقع تھا اور اس مقام کے بھیانک اور وحشت انگیز نظارہ سے معتقدین کے دلوں میں دیوتا کا ہیبت و جلال پیدا ہوتا۔ یہ عظیم الشان مندر چھوٹی چھوٹی عمارتوں کے وسط میں واقع تھا اور قریب میں کھیل اور ورزش کے لئے ایک میدان تھا۔ تمام یونانیوں کو یہ حق حاصل تھا کہ اس مندر میں آئیں اور اپنی مشکلات حل کرائیں۔ یونان کی تہذیب پر اس کا بہت اثر پڑا ہے کیونکہ بسا اوقات ریاستیں سیاسی معاملات میں مشورہ چاہتیں مثلاً کسی جدید نوآبادی کا قایم کرنا یا دستوری حکومت قائم کرنا۔ اخلاقی امور بھی تصفیہ کے لئے پیش کئے جاتے اور اکثر اوقات مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے درخواست کی جاتی۔ اس قسم کے سوالات کا جواب مبہم الفاظ میں دیا جاتا جس کے مختلف اور متضاد معنی نکل سکتے۔ ایک یونانی سردار پرہس رومیوں سے برسر پیکار تھا۔ اس نے جنگ کا نتیجہ دریافت کیا تو ایسے الفاظ میں جواب دیا گیا جس سے فتح و شکست دونوں کا ترشح تھا۔ ڈلیفی کے پجاریوں کے حرکات و افعال اب تک سربستہ راز ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی ذات سے مذہب اور اخلاق و عادات کا معیار نہایت اعلیٰ رہا۔ اپالو جس کی ڈلیفی میں پرستش ہوتی تھی روشنی، صحت اور علم کا دیوتا مانا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک مندر پی لوپونیس کے مغرب میں دریائے ال فیس کے کنارے اُلمپیا میں واقع تھا جس میں بہت سی عمارتیں ایسی تھیں

جن کو یونان کے فن تعمیر کے بہترین نمونے کہہ سکتے ہیں۔ اس مقام کے قریب زلیس اُلم پیس دیوتا کی یادگار میں ایک تہوار منایا جاتا جس میں مختلف کھیل اور کرتب ہوتے جو اصطلاحاً اُلم پیائی کھیل کہے جاتے۔ ان کھیلوں کی ابتدا قیاساً ۷۷۶ سنہ قبل مسیح ہوتی ہے۔ پہلے پہلے صرف ۲۰۰ گز کی دوڑ ہوا کرتی۔ اور جو شخص اس میں سبقت لے جاتا اس کو فاتح الحلبہ کہتے، مگر رفتہ رفتہ دوسرے کھیلوں کا بھی رواج ہوتا گیا مثلاً گھونسہ بازی، کشتی، کود پھاند، تیر اندازی، رتھوں کی دوڑ، مگر اس میں اخراجات کی وجہ سے صرف امرا شریک ہو سکتے تھے۔ گھونسہ بازی اور کشتی ایسے کھیل تھے جن سے وحشت کی بو آتی ہے مگر دوسرے کھیل ایسے تھے جن میں جان کا خطرہ بالکل نہ تھا اور اس سے یونانیوں کی امن پسندی کا ثبوت ہوتا ہے۔ ان کھیلوں میں صرف یونانی شریک ہو سکتے تھے جس سے یونانیوں میں ایک قسم کا اتحاد تھا اور یہی ان کی قومیت کی نشانی تھی۔ جن ایام میں یہ کھیل ہوتے ان میں آپس کی خانہ جنگیاں بھی بند ہو جاتیں اور تمام ریاستوں کے باشندے اس میں امن و امان کے ساتھ شرکت کرتے۔

تمام یونانیوں کے سیاسی خیالات میں باوجود اختلافات کے ایک حد تک یگانگت کا بھی عنصر موجود تھا۔ کسی ریاست میں شاہی حکومت تھی کہیں امرا کا زور تھا، اور کہیں جمہوریت غالب تھی مگر یونان کی تمام ریاستیں "شہری ریاستیں" تھیں یعنی ان کی حدود ارضی کسی نہ کسی شہر کے رقبہ کے اندر تھیں۔ اس امر کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے کیونکہ زمانہ حال میں صفحۂ ہستی پر کسی ملک میں اس قسم کی ریاستیں موجود نہیں۔ ہر ایک یونانی شہر یا تو ایک علیحدہ خود مختار ریاست تھا یا کم از کم اس کے باشندوں کا یہ مطمح نظر تھا کہ انکا شہر ایک علیحدہ خود مختار ریاست ہو جائے۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ چند شہر بہ رضا و رغبت متحد ہو جاتے یا کوئی طاقتور شہری ریاست اپنے ہمسایہ شہروں کو اپنے زیر اثر کر لیتی مگر اس قسم کے اتحاد باوجود مفید ہونے کے یونانیوں کے احساسات کے خلاف تھے اس لیئے انکی ہستی چند روزہ ہوتی

تھی۔ بعض شہروں کی آبادی کثیر اور رقبہ وسیع ہوتا مگر بعض شہر ایسے تھے جو زمانۂ حال کے لحاظ سے محض قصبے یا دیہات کہے جا سکتے ہیں مگر ان کو بھی کامل آزادی حاصل تھی۔ یہ آزادی چھوٹی ریاستوں کے لئے وبال جان تھی۔ کیونکہ ان کی حکومت اور فوج علیحدہ ہوتی اور اکثر اوقات سکہ بھی علیحدہ ہوتا یگانگی کا دوسرا عنصر باوجود اختلافات کے مجالس عامہ کا وجود تھا جو تمام ریاستوں میں تھیں۔ نیابت جس پر یورپ کی مجالس سیاسی کا دارومدار ہے اس کا وجود نہیں پایا جاتا مگر تمام ریاستوں میں یہ رواج تھا کہ اہم سیاسی امور پر بحث کرتے اور ان کو طے کرنے کے لئے شہر کے تمام باشندے جمع ہوتے۔ یونانی ریاستوں کے دستور سلطنت کے مطالعہ میں خصوصاً یہ پیش نظر رہے کہ مختلف ریاستوں میں اس مجلس عامہ کا کس قدر اقتدار تھا۔

تمدن یونان کی ترقی میں ان تمام ریاستوں کا حصہ تھا جو ایشیائے کوچک بحیرۂ ایجین اطالیہ اور صقلیہ میں پھیلی ہوئی تھیں مگر فی الحال ہمیں صرف ان ریاستوں سے سروکار ہے جو جزیرہ نمائے بلقان کے جنوبی حصہ میں واقع ہیں جسے اب یونان کہتے ہیں۔ جغرافیائی حالات کا اثر ہر قوم کے تمدن اور طرز زندگی پر پڑتا ہی اور یہی حال یونان کا بھی ہے تھیسلی کے شمال تک تمام ملک یونان کہا جاتا تھا اور کوہ الپس اور سلسلۂ کوہی جسے کام بونی کہتے ہیں اس کی شمالی سرحد پر واقع تھے۔ مگر تمدن یونان کا مرکز اس حصے میں واقع تھا جو درۂ تھرموپائی کے جنوب میں ہے۔ اس حصہ کے جغرافیائی خصوصیات دو ہیں ایک تو سمندر کا قرب اور دوسرے پہاڑوں کا ہر جگہ پیش نظر ہونا۔ وسیع میدانوں کا وجود بالکل نہیں اور ہر جگہ اونچے اونچے پہاڑ نظر آتے ہیں جن کی بلندی نو ہزار فٹ تک ہے۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے تجارت اور آمد و رفت میں بہت دقت ہوتی ہے اور اسی سبب سے ملک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے ہیں جن میں ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کی وجہ سے سیکڑوں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں پیدا ہو گئیں جن کا اس سے قبل ذکر آیا ہے۔ سلسلۂ کوہی کے سبب سے آمد و رفت میں دقت تھی مگر سمندر کے قریب سے اس کا نعم البدل ہو جاتا اور آمد و رفت کا بھی بڑا

ذریعہ تھا۔ چھوٹے جہازوں کے لئے بے شمار چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں خصوصاً مشرقی سواحل پر تھیں جو ایشیا کے مقابل تھے۔ یونان کے اسی سبب سے ایشیا سے زیادہ تعلقات رہے ہیں اٹلی سے آمد و رفت اس سے زیادہ دشوار تھی۔ اس کے علاوہ بحیرۂ ایجین میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزائر ہیں جن کو طے کرتے ہوئے یونانی ملاح آسانی سے ایشیا پہنچ جاتے کیونکہ زمین کبھی ان کی نظروں سے غائب نہ ہوتی۔

اس سے ظاہر ہے کہ یونان کے باشندوں میں پہاڑوں کے سبب سے مفارقت پیدا ہوتی مگر سمندر ان کے لئے ذریعہ اتحاد تھا اور ان دونوں سے ملک کی حفاظت ہوتی کیونکہ اگر یہ قدرتی حفاظت نہ ہوتی تو یونان کسی نہ کسی مشرقی سلطنت کا جزو بن گیا ہوتا۔

قوم یونان میں چند مختلف عناصر موجود تھے جن میں سے دو قابل ذکر ہیں یعنی ڈورین اور آئونین۔ ہومر کی نظموں میں اول الذکر کا پتہ نہیں چلتا۔ دونوں اقوام کے عادات و خصائل میں بہت اختلاف تھا۔ ڈورین لوگوں نے جنوبی یونان پر ہومر کے زمانہ کے بعد حملہ کیا اور انکی فتوحات سے یونان میں بہت سے انقلاب پیدا ہو گئے۔ ڈورین اقوام آئونین لوگوں سے شجاعت توانائی اور جنگجوئی میں فوقیت رکھتی تھیں مگر تمدن میں ان سے گری ہوئی تھیں۔ ڈورین ریاستوں میں اہم ترین اسپارٹا تھا اور اس کے بعد کورنتھ اور آرگوس۔ آئونین اقوام کا ہیولانگاہ ایشیائے کوچک اور جزائر ایجین میں تھا۔ خاص یونان میں ان کی صرف ایک بڑی ریاست تھی یعنی ایتھنز اور اہالیان ایتھنز اپنے آپ کو اقوام آئونین کا ہادی اور رہبر خیال کرتے تھے۔ یہ قوم ڈورین لوگوں سے زیادہ مہذب تھی تجارت خاص مشغلہ تھا مگر جنگجوئی میں ان کی مد مقابل نہ تھی۔ اسی تمدنی فوقیت کا نتیجہ تھا کہ سرزمین یونان اسی قوم یعنی آئونین کے نام سے مشرقی ممالک میں مشہور ہوئی سنسکرت میں "یادن" کا لفظ اس قوم کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور عرب "یونان" کہتے تھے جو اسی لفظ "آئونین" سے مشتق ہیں۔

جن چار ریاستوں کا ذکر اوپر آیا ہے ان کے تاریخی اور تمدنی حالات نہایت اہم ہیں کیونکہ تاریخ یونان کا انحصار انھیں پر ہے خصوصاً ایتھنز اور اسپارٹا پر۔ اسپارٹا ایک تیز بہنے والی پہاڑی ندی کے کنارے واقع ہے جو گرمی میں بھی خشک نہیں ہوتی۔ جنوب کے علاوہ اس کے ہر طرف سلسلہ ہائے کوہی واقع تھے اور جنوب میں میدان بھی یوروٹاس ندی ایک تنگ درے میں سے بہتی ہوئی نکل گئی تھی جس کی آسانی سے دشمن کے مقابلے میں حفاظت کر سکتے تھے۔ اسپارٹا کے ڈورین باشندے اس وادی کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ ان لوگوں نے ابتدائی زمانہ میں اس ملک پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا مگر مفتوح اقوام کے افراد ان کے درمیان موجود تھے اور ان کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ اسپارٹا کی تاریخ میں یہ امر قابل لحاظ ہے کیونکہ اسپارٹا کے رسم و رواج میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ کسی نہ کسی طرح قومیت قائم رکھی جائے اور اس سبب سے اسپارٹن لوگوں کی تعلیم و تربیت کا مقصد اور غایت یہ تھی کہ ان کے افراد میں شجاعت اور توانائی پیدا ہو اور جنگ میں گھبرانے یا دشمن کو پیٹھ دکھانے کو ننگ و عار خیال کریں۔ مردوں کو وسط زندگی تک عیالداری سے کوئی تعلق نہ رہتا۔ نوجوانوں کی تعلیم کے لئے بڑے بڑے مدارس تھے جہاں بچے ہوش سنبھالتے ہی بھیجدیئے جاتے۔ واضح رہے کہ یہ مدرسے صرف تربیت کے لئے تھے نہ کہ تعلیم کے لئے ان مدرسوں کی تربیت کا خاص مقصد یہ تھا کہ لڑکے چاق چوبند مضبوط اور توانا ہوں، ان کو مختلف قسم کی ورزشیں اور کرتب سکھائے جاتے۔ کھانا نہایت سادہ ہوتا۔ اس تربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ قوم کے افراد ہر قسم کی صعوبت برداشت کر لیتے اور سخت سی سخت جسمانی تکلیف سے بھی ان کی جبین پر شکن نہ آتی تھی۔ قوم پرستی کا اعلیٰ ترین خصائل میں شمار تھا۔ دماغی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نوجوانوں کا وقت زیادہ تر فوجی قواعد شکار اور مصنوعی جنگ میں صرف ہوتا تھا جو بعض اوقات مہلک بھی ہو جاتی علم ادب و فنون لطیفہ کا مذاق بہت کم تھا مگر ان کو اپنے تمدن پر ناز تھا اور اہالیان ایتھنز

کو حقارت سے دیکھتے اور کہتے کہ یہ زنانے ہیں ان پر لفظ "مرد" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس قوم کا دستور سیاسی قریب قریب وہی تھا جس کا پتہ ہومر کی نظموں میں چلتا ہے کیونکہ یہاں بادشاہ بھی تھے اور مجالس امرا اور عوام بھی موجود تھیں مگر اختلافات پیدا ہو چلے تھے کیونکہ بجائے ایک بادشاہ کے اسپارٹا میں دو بادشاہ تھے اور ان کی رقابت سے قوت شاہی میں ضعف آچلا تھا۔ مگر اصل طاقت پانچ عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھی جن کو ایفور کہتے تھے۔ ان عہدہ داروں کا انتخاب جملہ شہری ایک سال کے لئے کرتے اور ان کو اندرونی اور خارجی پالیسی پر پورا اختیار دیدیا جاتا۔ ہومر کے زمانہ میں اس قسم کے عہدہ داروں کا وجود نہ تھا۔ زمانۂ حال میں اسپارٹا کے حالات میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی مگر یونانی اس ریاست کو حد درجہ وقعت کی نگاہ سے دیکھتے کیونکہ اس قوم میں وہ خصوصیات تھیں جو عموماً یونانیوں میں مفقود تھیں مثلاً ضبط قومی مستقل مزاجی اور امن و امان قایم رکھنے کی اہلیت۔ دوسری یونانی ریاستوں میں انقلابات ہوتے رہتے مگر اسپارٹا میں پشت ہا پشت تک ایک ہی پالیسی قائم رہتی۔ ایران کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں اس کے قبل کی اسپارٹا کی تاریخ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں مگر اس کے قبل بھی اسپارٹا کئی جنگوں میں شریک تھا اور فتح کا سہرا ہمیشہ اسی کے سر رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حکومت کا رقبہ دوسری یونانی ریاستوں سے زیادہ وسیع ہو۔ اس نے میسینیا کے زرخیز خطہ پر قبضہ کر لیا تھا اور آرگوس سے بھی کچھ ملک اس نے چھین لیا تھا اور ان مقبوضات پر سختی کے ساتھ حکمراں تھے۔ اہل اسپارٹا نے مفتوح قوموں کو آزادی دینا اور اپنا ہمسر بنانا کبھی پسند نہ کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ فتح کر سکتے تھے مگر تدبیر مملکت کی خاص رمز یعنی مفتوح اقوام کی تالیف قلوب کا راز ان سے ہمیشہ نہاں رہا۔

اسپارٹا کی قوت کا مرکز خاکنائے کورنتھ کے جنوب میں تھا اور اہل اسپارٹا اس کے شمال میں بلاوجہ فوج کشی کرنا قرین مصلحت خیال نہ کرتے۔

نا گنائے مذکورہ کے شمال میں ممتاز ترین سلطنت ایتھنز تھی۔ اسپارٹا کی طرح ایتھنز قدرتاً محفوظ و مامون نہ تھا کیونکہ جس صوبۂ اٹیکا میں یہ شہر واقع تھا وہ کوہستانی تو ضرور تھا مگر بہ سبب پستی کے کسی پہاڑ سے ریاست کی حفاظت نہ تھی اور جنوب و مشرق دونوں جانبوں سے سمندر سے حملہ ہو سکتا۔ ایتھنز کا شمار ابتدا ہی سے بحری ریاستوں میں تھا اور سمندر ہی پر اس کا دار و مدار تھا۔ اس شہر کی ابتدا ایک کوہی قلعہ ایک روپولیس سے ہوئی جو سمندر سے قریب چار میل پر واقع ہے۔ اس قلعہ کے زیر سایہ آبادی کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ ایتھنز کی مذہبی اور تمدنی ہستی کا مرکز بن گیا۔ یہ خطۂ ملک یونانیوں کے خیال کے مطابق زرخیز تھا اور پائرس کا بندرگاہ تمام یونان میں بہترین خیال کیا جاتا تھا۔ شہر میں ایتھنا دیوی اور پوسی ڈن (سمندر کا دیوتا) کی خاص طور پر پرستش ہوتی تھی۔

ایتھنز کے باشندے بمقابلہ اسپارٹا ایک ہی نسل سے تھے۔ کیونکہ ان کے درمیان کوئی محکوم قوم آباد نہ تھی جس سے تشویش رہتی۔ غلاموں کی تعداد کثیر تھی مگر ان کے وجود سے کسی قسم کی زحمت نہ تھی اور اس وجہ سے ایتھنز میں اسپارٹا کی طرح ہر وقت فوجی تیاری کی ضرورت نہ تھی اور اس کے تمدن پر فوجی عنصر غالب نہ تھا۔ ایتھنز کی ابتدائی تاریخ کا افسانوں سے الگ کرنا اور اصلی واقعات کی تہ تک پہنچنا نہایت دشوار ہے مگر ان افسانوں سے ظاہر ہے کہ ابتداءً اٹیکا میں مختلف قومیں آباد تھیں اور ان سبھوں کے ایک جگہ آباد ہونے اور خلط ملط ہونے سے شہر ایتھنز وجود میں آیا۔ غالباً ابتداء زمانہ میں ایتھنز میں بادشاہوں کی حکومت تھی۔ مجلس امراء بھی تھی جو مجلس اریوپیگس کے نام سے موسوم تھی اور ایتھنز کی ایک سیاسی مجلس ہے جسے ہومر کے زمانہ میں مجلس عوام کہتے تھے۔ مگر دور تاریخی کے آغاز سے قبل ہی اس نظام سلطنت میں تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ امراء کی دستبرد سے حکومت شاہی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سنہ ۶۵۰ ق۔م کے قریب ایتھنز کے تاریخی حالات صاف صاف معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت امراء کا تسلط تھا۔ مگر امراء کی حکومت سے یہ لوگ

خوش نہ تھے اور کئی مرتبہ کوشش کی گئی کہ ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے یا کم از کم ان کے اختیارات محدود کر دئیے جائیں۔ حکیم سولن کا نام جب صفحۂ تاریخ پر آتا ہے اس وقت بھی امراء برسر حکومت تھے اور عوام سے پرخاش چلی جاتی تھی۔ حکیم مذکور کی نظموں سے ان مشکلات کا پتہ چلتا ہے جو اس کے سامنے تھیں اور کس طرح اس نے ان کے رفع کرنے کی کوشش کی۔ یہ مشکلات دو قسم کی تھیں ایک تو سیاسی یعنی حکومت امراء سے عوام کی ناراضی اور دوسرے تمدنی کیونکہ ایٹی کا کے زراعت پیشہ لوگوں کی حالت نہایت ہی سقیم تھی۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے ایتھنز کے امراء سے قرض لیا تھا اور بہ سبب عدم ادائی ان کے حلقہ بگوش ہو کر غلامی میں بک گئے تھے۔ حکیم سولن کے حالات میں افسانے کی بو پائی جاتی ہے مگر اس کے تدبر اور بے نفسی میں شک نہیں۔ اس نے ایتھنز کے ان باشندوں کو جو غلام ہو گئے تھے آزاد کرا دیا اور امراء کو غلام بنانا قانوناً ممنوع کرا دیا۔ دستور سلطنت کی بھی اس نے اصلاح کی جس سے گو دستور قدیم برائے نام جاری رہا مگر امراء کی ہمہ گیری کا خاتمہ ہو گیا اور عوام کا عنصر بہت بڑھ گیا۔ جو دستور اس کی کوشش سے قائم ہوا اس کو جمہوریت تو نہیں کہہ سکتے مگر جمہوریت کے عناصر نظام سلطنت میں داخل ہو گئے اور دیگر عناصر کے داخل ہونے کا راستہ کھل گیا۔ سولن حد درجہ کی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسی کو دستور ایتھنز کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد اور بھی تغیر ہوئے اور یونان کی اکثر سلطنتوں میں سیاسی ترقی کی رفتار یکساں تھی۔ تمام سلطنتوں میں اولاً شاہی حکومت تھی، اس کے بعد امراء کا دور دورہ ہوا۔ امراء کی حکومت جب ناقابل برداشت ہو جاتی تھی تو رعایا میں سے کوئی شخص ان کو زیر و زبر کر دیتا تھا جسکو یونانی اصطلاح میں ٹائرنٹ کہتے ہیں۔ ٹائرنٹ کا بھی ایک دور زمانہ کے بعد خاتمہ ہو جاتا تھا اور ان کی جگہ جمہوریت یا عمومیت قائم ہوتی تھی یہی حالت دنیا کے دوسرے حصوں اور قریب تر زمانے میں بھی ہوتی ہے۔

سولن کو بھی یہ خدشہ ہوا تھا کہ خدانخواستہ ایتھنز بھی کسی ٹائرنٹ کے زیر حکومت نہ آجائے اور اپنی دستوری اصطلاحات سے ایتھنز کو اس خطرہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر پھر بھی ایتھنز کی بھی یہی حالت ہوئی شہر میں مختلف جتھے قائم ہو گئے جو میدانی، ساحلی اور کوہی کے ناموں سے موسوم تھے مگر غالباً اس سے زمینداروں، تجار اور کاشتکاروں سے مراد تھی پسیس ٹریٹس فرقۂ کوہی کا سرغنہ تھا۔ اس کی ذاتی حفاظت کے لئے ایک گارڈ مقرر کیا گیا تھا اور جب اس نے دیکھا کہ اس کی طاقت مستحکم ہو گئی ہے اس نے قلعے پر قابض ہو کر تمام ایتھنز کو اپنے قبضۂ قدرت میں کر لیا۔ اہل ایتھنز کو اس کے نام سے نفرت ہو گئی اور اس کے بیٹے قاتلوں کو اپنے محسنوں میں شمار کرتے تھے۔ مگر جب تک پسیس ٹریٹس زندہ رہا اس کی شخصی حکومت سے ایتھنز کو نہ صرف بہت کم نقصان پہنچا بلکہ اس نے بہت احسان بھی کیا ہے۔ سولن نے جو دستور قائم کیا تھا اس میں کوئی ظاہری تغیر نہیں کیا گیا مگر تمام اختیارات اجیر سپاہیوں کی اس فوج کے ہاتھ میں تھے جس کا قبضہ قلعے پر تھا۔ شہر میں امن قائم تھا اور تمدن کے مختلف شعبوں میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ صنعت و حرفت زراعت و تجارت کو فروغ دینے میں کوشش کیجاتی تھی۔ اس زمانہ میں ایتھنز تمام یونان کے شہروں سے ادب و فنون لطیفہ میں سبقت لے گیا۔ غیر ملکی صناع ایتھنز میں بلائے گئے جن کی صناعی کے نمونے زمانہ حال کے احفادات میں ملے ہیں۔ مقدس پہاڑ کے قریب اور اس کے اوپر مندر بنائے گئے۔ اس ٹائرنٹ نے ہومر کی نظموں کو جمع کرنے کی سب سے پہلے کوشش کی۔ اگر تمام ٹائرنٹ اس شخص کی طرح منصف مزاج ہوتے تو یہ نام کبھی بدنام نہ ہوتا۔ مگر اہل ایتھنز پورے طور پر خودمختار رہنا چاہتے تھے۔ اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ اس کے بیٹے کے زمانہ میں پھر بغاوت ہوئی مگر وہ بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد ایتھنز کے چند امیروں نے ڈیلفی اور اسپارٹا سے ساز باز کر کے اس ٹائرنٹ کے خاندان کو ایتھنز سے نکال باہر کیا۔ اس طرح ایتھنز میں پھر جمہوریت قائم ہو گئی

اور ہپیس پرسٹیس کے بیٹے ہی پیاس نے شاہ ایران کے ظلِ عاطفت میں جا کر پناہ لی اور جب ایرانیوں نے ۴۹۰ ق.م میں ایران پر حملہ کیا تو اس فوج کے ساتھ بطور راہ نما کے آیا۔

آزاد حکومت کے قیام کے بعد ایتھنز نے سولن کے قائم کردہ دستور کی پابندی گوارا نہ کی۔ ایک زمانہ تک معاملات میں ابتری رہی مگر اسکے بعد جمہوریت کی طرف اور ترقی ہوئی جو اصلاحات ہوئیں وہ کلیس تھی نیس کے نام سے وابستہ ہیں۔ اہم ترین تغیر یہ تھا کہ حریت کی بنا وسیع تر کر دی گئی۔ اس وقت تک احرار میں شمار صرف ان لوگوں کا تھا جن کا ایٹی کا کی چار قوموں میں سے کسی سے تعلق تھا اور اس جماعت میں شریک ہونا نہایت ہی دشوار تھا۔ ایتھنز کی آبادی میں ایک تعداد کثیر ایسے لوگوں کی تھی جو تجارت وغیرہ کی غرض سے آکر آباد ہو گئے تھے اور احرار کی جماعت میں ان کا شریک کیا جانا قرین مصلحت تھا۔ کلیس تھی نیس نے یہ تصفیہ کیا کہ قدیم اقوام سے تعلق جماعت احرار میں شرکت کے لئے لازمی نہ ہو۔ جدید اور فرضی اقوام قائم کی گئیں اور اس طرح سے ایتھنز میں جماعت احرار کی تعداد میں کثیر اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ اور بھی اصلاحات عمل میں آئیں مگر ان کا تذکرہ بعد میں ہوگا۔

یونان کی شہری ریاستوں میں سے اہم ترین اسپارٹا اور ایتھنز تھے مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ یونان کی تاریخ انھیں دو ریاستوں کی تاریخ ہے۔ ان کے بعد کورنتھ کا درجہ ہے۔ تجارتی اغراض کے لیئے یونان میں کوئی شہر اس سے بہتر موقع پر واقع نہیں تھا۔ کورنتھ اس تنگ خاکنائے پر واقع ہے جو وسطی یونان اور پیلوپونیسس کے درمیان واقع ہے۔ متعدد بندرگاہیں بھی تھیں نہ صرف شرقی کنارے پر بلکہ خلیج کورنتھ پر بھی اسی طرح یونان کے شہروں میں کوئی شہر ایشیائے کوچک، سسلی، اٹلی اور بحیرۂ روم کے مغربی ممالک سے بھی تجارت کے لئے اس سے بہتر موقع پر نہ تھا۔ زمانۂ قدیم میں اس شہر کو دوسرے شہروں پر سیاسی فوقیت حاصل نہ تھی مگر تجارتی شہروں میں اہم ترین تھا۔ ازمنۂ قدیم میں تجارت کا اثر ریاستوں کی باہمی

تعلقات اور ان کے مستقبل پر اس قدر بدیہی نہیں ہے جتنا کہ زمانہ حال میں ہے مگر تجارتی شہروں کی دولت اور اولوالعزمیوں کا اثر یونان کی تاریخ پر بہت کچھ ہے ابتدا ہی سے کورنتھ دولت عیش و عشرت اور غلاموں کی کثرت کے لئے مشہور تھا۔ سیاسی تاریخ میں کورنتھ میں بھی وہی تغیرات ہوئے تھے جو دوسری ریاستوں میں ہوئے تھے۔ ابتدائً شاہی حکومت تھی مگر اس کے خاتمہ پر امراء کی حکومت رہی جس کے بعد ٹائرنٹس کا ۶۵۵ ق م سے ۵۸۱ ق م تک دور دورہ تھا۔ مگر ان کے ہٹنے کے بعد جمہوریت نہ قائم ہوئی بلکہ چند افراد کے ہاتھ میں حکومت آگئی۔ کورنتھ اور ایتھنز کے درمیان عرصہ تک رقابت کا سلسلہ جاری رہا کیونکہ ان ریاستوں کے سیاسی اصول میں اختلاف تھا اور تجارتی رقابت مزید برآں تھی۔

کورنتھ کے جنوب و شرق میں آرگوس کی ریاست اور شہر واقع تھا۔ جس میدان میں یہ شہر واقع تھا اس میں زمانہ قبل از تاریخ کے آثار موجود تھے۔ باشندگان آرگوس نسلاً ڈورین تھے اور ایک زمانہ میں اسپارٹا کے ہمسر تھے مگر اہل اسپارٹا نے ان کو شکست دے کر ان کے ملک کا ایک ٹکڑا چھین لیا جس کی وجہ سے ان دونوں ریاستوں میں دوامی دشمنی پیدا ہو گئی۔ دوسری یونانی ریاستوں کے تعلقات کبھی کشیدہ اور کبھی خوشگوار ہو جاتے تھے مگر ان دونوں ریاستوں میں ہمیشہ دشمنی ہی رہی۔

بخوف طوالت دوسری ریاستوں کے صرف نام گنائے جا سکتے ہیں۔ خشکی پر علاوہ ریاست ہائے مذکورۂ بالا کے شمال میں تھیبس واقع تھا جو ضلع بوائے شیا کی ریاستوں میں ممتاز تھا۔ اس ریاست کے باشندے ایک زمانے میں بد تہذیب اور بے حس خیال کئے جاتے تھے مگر ایک زمانے کے بعد اسی ریاست نے جنگجوئی اور تدبر میں اپنی افضلیت ثابت کر دکھائی۔ خاکنائے کورنتھ پر شہر میگارا واقع تھا جو اب ایک ذرا سا قصبہ ہے مگر ایک زمانہ میں تجارت میں ایتھنز اور کورنتھ کا ہمسر تھا اور اس کے باشندوں نے بہت سی مشہور نو آبادیاں قائم کیں جن میں سے ایک بائی زینٹیم

(قسطنطنیہ) ہے جو اب بھی ایک یورپین سلطنت کا دار الخلافہ ہے۔ پیلو پونیس کے مغرب میں شہر ایلس واقع تھا جس کے سپرد اولمپیا کے کھیلوں کا انتظام تھا مگر اس میں سیاسی یا فوجی اہمیت نہ تھی۔ مشرق کے شہروں کے کارنامے بھی قابل فروگذاشت نہیں ہیں۔ جزائر ناکسوس کیوس اور ساموس کے باشندے ذی ثروت اور ترقی یافتہ تھے۔ جزیرہ لیس بوس ایک ادبی تحریک کا مرکز تھا جس میں مشہور شاعرہ سیا فو نے نام و نمود حاصل کیا۔ ایشیا کے ساحل پر بلدہ ہائے می لے ٹس، اے فی سس اور ہالی کارناسس واقع تھے جو بلحاظ آبادی یا دولت ممتاز تھے یا ممتاز لوگوں کے زاد بوم ہونے کا انھیں فخر تھا یا وہاں سے اہم تحریکوں کی ابتدا ہوئی۔

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان میں ایک جری اور ترقی کن قوم کی آبادی تھی جو دائرہ سیاسی میں مختلف طرز کی حکومت کی یکے بعد دیگرے آزمائش کرکے آزادی اور حریت کی طرف قدم بڑھا رہی تھی، جس سے یورپ کی ترقی پر معتد بہ اثر پڑا ہے۔ فنون لطیفہ اور فلسفہ میں بھی ان لوگوں کو دخل تھا اور وہ ان مسائل اور مشکلات کو حل کرنے میں مصروف تھے جن پر تمدن یورپ کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ یونان کا چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہونا سیاست فنون لطیفہ اور فلسفہ میں جدید خیالات کے نشوونما کے لئے از حد مفید ہوا کیونکہ اس سے آپس میں قابل تحسین رقابت پیدا ہوئی، کمالات کے مقابلہ کرنے کا موقع ملتا تھا اور جدید عقائد کو دبانا دشوار تھا۔ مگر اس آپس کے تفرقہ سے ایک سخت خطرہ کا سامنا ہوا جب کہ ایک ایسی وحشی طاقت نے حملہ کیا جو متحد اور طاقتور تھی۔ یہ حملہ پانچویں صدی ق.م. کے اوائل میں ہوا۔

باب سوم

جنگ ایران اور اسکے نتائج

بعض مورخین کا قول ہے کہ تاریخ یورپ مشرق و مغرب کے مجادلہ کی تاریخ ہے مگر یہ قول صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تمدن یورپ کے سب سے خطرناک دشمن مشرق سے وارد ہوئے گو انھوں نے یورپ پر کبھی جنوب سے حملہ کیا کبھی مغرب سے اور کبھی شمال سے۔ تمدن یورپ کے عناصر ثلاثہ تخیل و فنون لطیفہ یونان، قانون و نظام رومی اور مسیحیت کی دینی اور اخلاقی تعلیم ہیں جس میں بعد میں ان علوم طبعی کا اضافہ ہوا جو یونانی تخیل سے بعد ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ سرزمین یورپ کے دشمن ان ملکوں سے نکلے جو دریائے دجلہ و فرات کے کنارے واقع ہیں اور شام و عرب سے یہ دشمن نہایت خطرناک اس لئے تھے کہ یہ جاہل اور وحشی نہ تھے بلکہ اپنے ساتھ مذہب و اخلاق بھی لائے جو یورپ کے مذہب و اخلاق سے بہتر ہونے کے دعویدار تھے اور بعد میں تو علوم طبعی بھی اپنے ساتھ لائے۔ مجادلہ مشرق و مغرب کے تین دور ہیں۔ پہلا دور یونان و ایران کی رقابت سے شروع ہوتا ہے یعنی سائرس شاہ ایران کی فتوحات سے اس کی ابتدا ہے (۵۵۹ ق م) اور سکندر اعظم کی فتوحات (۳۳۱ ق م) پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دوسرا دور مسلمانوں اور عرب نسلوں کے ابتدائی محاربات سے شروع ہوتا ہے اور سنہ مسیح کی آٹھویں صدی میں ختم ہوتا ہے جبکہ مسلمانوں کو

قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) اور ٹورس (۷۳۲ء) میں شکست ہوئی تیسرے دور میں محاربات صلیبی ہیں جن میں اہل یورپ اور ترکوں کا مقابلہ رہا۔ اس وقت تم کو معارکۂ مشرق و مغرب کے پہلے دور سے سروکار ہے جو سب سے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس زمانے میں یورپ کی تہذیب ایک تنگ گوشہ میں محدود و محصور تھی اور بصورت ناکامی اس کا فنا ہونا ناممکن نہ تھا۔

اس وقت جب کہ سرزمین یونان ننھی ننھی ریاستوں میں منقسم تھی جنکی سخت باہمی رقابت کے سبب سے ان کا تمدن و تہذیب معرض خطر میں تھا، دریائے فرات کی وادی میں عظیم الشان سلطنتیں قایم ہو رہی تھیں تین صدیوں تک ایشیا کی سیادت کا سہرا اسیریا کے سر تھا مگر کسی سبب سے جس کا ہمیں علم نہیں اس کی قوت میں زوال پیدا ہوا اور شمالی وحشی قوموں کے حملوں سے جانبر نہ ہو سکی۔ کئی ریاستیں اس کے آثار پر قایم ہوئیں جن میں سے لیڈیا واقع ایشیائے کوچک میڈیا بابل اور مصر کی ریاستیں سب سے بڑی تھیں۔ مگر ۵۵۰ ق م کے قریب سلطنت میڈیا کو ایران کے پہاڑیوں نے زیر و زبر کر دیا۔ اس ایرانی گروہ کے بادشاہ کا نام یونانیوں میں سائرس مشہور تھا اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ سلطنت اسیریا کے تمام مقبوضات اس کے قبضۂ قدرت میں آجائیں۔ لیڈیا پر اس نے ۵۴۶ ق م میں قبضہ کر لیا اور ایشیائے کوچک بھی اس کی دستبرد سے بچ نہ سکا۔ لیڈیا کے قبضہ کے بعد ایشیائے کوچک میں جو یونانی بستیاں تھیں وہ ایرانیوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں اور سلطنت ایران میں شامل کر لی گئیں۔

سائرس کا ۵۲۹ ق م میں انتقال ہو گیا مگر اس واقعہ سے ایرانی فتوحات کا خاتمہ نہ ہوا بابل ان کے قبضہ میں آچکا تھا اس کے بعد مصر کی باری آئی اور ہندوستان میں بھی ایران کے فتح و ظفر کے علم پہنچ گئے۔ ۵۲۱ ق م میں دارا شاہ ایران نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا سرزمین عالم میں اس وقت کوئی بادشاہ اس کا ہمسر نہ تھا۔ لیکن باوجود اس کے شکوہ بے پایاں کے ایشیائے کوچک کے باشندے غیر ملکی حکومت سے

نالاں تھے اور آخر میں انھوں نے بغاوت کی جو بے سود ثابت ہوئی۔ باہمی رقابت اتحاد کے منافی تھی اور ان کے مزاج میں حریت پسندی حد اعتدال سے بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کسی قسم کی روک تھام پسند نہ کرتے تھے۔ آخر کار وہ ریاست ہائے یونان سے امداد کے طلب گار ہوئے۔ ایتھنز اور اریٹریا سے کچھ لوگ ان کی مدد کے لئے آئے۔ ان لوگوں نے ایرانی شہر سارڈس کو جلا ڈالا مگر اس کے بعد وہ اپنے گھروں کو واپس گئے اور ایشیائے کوچک کے یونانی اپنی قسمت کو روتے رہے۔ ۴۹۴ ق م میں ایرانیوں نے انکے بیڑے کو جلا دیا اور شہر ملیٹس کی فتح کے بعد اس بغاوت کا قلع قمع ہو گیا۔

مسلسل فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاتح کو ایک ملک فتح کر لینے کے بعد دوسرے ملک پر دست درازی کی ترغیب و تحریص ہوتی ہے۔ ایشیائے کوچک کے بعد خاص خطۂ یونان ایرانیوں کے پیش نظر تھا اور یونان کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ہوتا اگر اہل ایتھنز نے سارڈس پر حملہ کرکے اسے جلا نہ دیا ہوتا۔ یورپ پر دارا کے پہلے حملہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک تھریس و مقدونیہ نے ایران کی حلقہ بگوشی قبول کر لی اور ایران کی سرحد یونان کی سرحد تک پہنچ گئی (۵۱۲ ق م) ایشیائے کوچک کے یونانیوں کی بغاوت فرو کر لینے کے بعد دارا جنوبی یونان کی ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا خصوصاً ایتھنز اور اریٹریا کی طرف جنھوں نے سارڈس کو جلا دیا تھا۔ سنہ ۴۹۲ میں دارا نے ایک فوج بحیرۂ ایجین کے شمالی ساحلوں کی طرف بھیجی مگر بیڑے کے ڈوب جانے کے سبب سے یہ فوج ذلت و خواری کے ساتھ واپس ہوئی۔ دوسرے سال اس نے پھر فوج کشی کی تیاری کی اور تمام فوج سمندر کی راہ سے روانہ کی۔ یہ فوج ڈاٹس اور آرٹافرنس کے زیر کمان تھی اور ایتھنز کا ٹائرنٹ ہپیاس جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ان کے ساتھ بطور راہ نما تھا۔ ابتداءً قسمت نے مساعدت کی۔ نیکسوس ڈیلوس اور اریٹریا ایرانیوں کے قبضے میں آ گئے۔ اس کے بعد ہپیاس کے مشورے سے یہ فوج ایک تنگ آبنائے سے گزرتی ہوئی میراتھون کے میدان جنگ میں خشکی پر اتری۔ یونان

کا پہلا مورخ ہیروڈٹس اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "تم دیکھتے ہو کہ آزادی کیسی بیش بہا نعمت ہے"۔ کیونکہ جذبۂ حریت نے اس جنگ کا فیصلہ کیا۔ ایتھنز کا سرعسکر ملیٹاڈس تھا جو ایک زمانہ میں ایران کی فوج میں شریک تھا۔ اہل ایتھنز کو صرف ایک چھوٹی سی ریاست کی امداد حاصل تھی مگر جذبۂ حریت کے نشہ میں اہل ایران کی کثیر التعداد فوج کو انھوں نے شکست فاحش دی اور ڈاٹس اور آرٹافرنس اپنی ہزیمت خوردہ افواج کو لے کر سنہ ۴۹۰ میں ایران کو واپس ہوئے۔

جنگ مراتھان کی اہمیت کے متعلق اکثر مورخوں نے مبالغہ سے کام لیا کیونکہ یہ جنگ فیصلہ کن نہ تھی۔ اس کی وجہ سے دارا کے عزم بالجزم میں فرق نہ آیا اور یونان کو اپنے تسلط میں لانے کا اس نے پھر عزم کر لیا مگر مصر میں بغاوت ہوگئی جس کی وجہ سے اس کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا اور اس کے بعد موت نے اس کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ایک عرصہ قلیل کے بعد اس کا بیٹا زرکسیز تاجدار ایران ہوا۔ یہ پہلا ایرانی بادشاہ تھا جس کو فوجی معاملات سے مس نہیں تھا اور امور مملکت میں بھی درک نہ رکھتا تھا۔ یونان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ بجائے ایک جری اور ذی ہمم بادشاہ (دارا) کے اس کو زرکسیز ایسے کمزور اور عیش پسند بادشاہ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ باوجود اپنی عیش پسندی اور ناقابلیت کے زرکسیز نے بھی یونان کی فتح کی غرض سے ایک کثیر التعداد فوج جمع کرنا شروع کی تاکہ پھر شکست نہ ہو۔ اس معرکہ آرائی میں ہم کو دو ملکوں کے اخلاق و عادات کے موازنہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایرانی وحشی نہ تھے کیونکہ ان کا تمدن ترقی یافتہ تھا۔ امور سیاسی میں بھی انھوں نے کافی ترقی کی تھی اور پابند مذہب بھی تھے۔ بعض خصوصیات ان میں ایسی تھیں جن میں وہ یونانیوں پر فوقیت رکھتے تھے کیونکہ ہمعصروں کو بھی اس بات کا اقرار تھا کہ بہادری اور سچائی میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمدن یورپ کو ایک ایسے دشمن سے پالا پڑا تھا جس کے غلبے سے اس کے فنا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس معرکے میں حریت

کی بقا و فنا کا فیصلہ تھا یونانیوں میں تحریر و تقریر کی آزادی تھی اور تمام باشندوں کو امور سیاسی میں دخل دینے کا حق تھا۔ ان کے مذہب سے تخیل کو تقویت ہوتی تھی اور اس کے اصول ایسے نہ تھے جو کسی پر گراں ہوتے۔ کثرت ازدواج کا ان میں رواج نہ تھا۔ ادبیات فنون لطیفہ اور فلسفے کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اگر ایران کو کامیابی ہوتی تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہوتا کہ اس کی سلطنت میں ایک صوبے کا اور اضافہ ہو جاتا۔ یونان کی فتح سے اس کے باشندوں کو دو صدی تک آزادی نصیب رہی اور اس مدت میں انھوں نے اپنے تخیلات اور قوانین کو ترقی دی اور اسی زمانے میں انھوں نے یورپ کی دماغی ترقی کی بنیاد ڈالی۔

جنگ ایران کے حالات ہمیں ہیروڈٹس کی تحریروں سے معلوم ہوتے ہیں جو یورپ کا پہلا مورخ ہے اور اس کا طرز بیان نہایت دلاویز اور دلکش ہے۔ یہ جنگ اس کی طفولیت اور جوانی کے زمانے میں ہوئی اور اس کے ہموطنوں نے اس جنگ کے دوران میں جو شجاعت کے جوہر دکھائے انکے حالات بلا کم و کاست اور صحت کے ساتھ لکھنے کی اس نے کوشش کی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ واقعات کے ساتھ اس نے افسانہ کو ملا دیا ہے محاربات اور فوجی نقل و حرکت کے خاکے جو اس نے کھینچے ہیں اکثر مبالغہ آمیز ہیں خصوصاً متخاصمین کی تعداد کے اندازہ کرنے میں اس نے فاش غلطیاں کی ہیں۔ مگر جنگ ایران کے افسانے بھی تاریخ کے جزو ہیں اور اس واقعے سے یونانیوں کو ہمیشہ فخر و مباہات کا موقع رہا کہ ان کی قلیل التعداد فوج نے ایران کی افواج قاہرہ کو شکست دے کر میدان کارزار سے بھگا دیا۔ زمانہ حال کی تاریخی تنقید سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے بھی یونانیوں کی کامیابی قابل ستائش ہے۔

ہیروڈٹس کے مبالغہ آمیز بیانات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کا انبوہ جس کی تعداد پچاس لاکھ نفوس بیان کی جاتی ہے بحیرۂ ایاس فرس کی طرف روانہ ہوا اور ایک ہفتہ تک شب و روز کوچ کرتے ہوئے یونانی انجنیروں کے

بنائے ہوئے پلوں پر سے گزر کر یورپ کے ساحل پر پہونچا زرکسیز خود اپنی فوج کا سپہ سالار تھا اور تھریس اور مقدونیہ سے گزرتے ہوئے درہ ٹیمپ پر پہنچا جہاں یونانی مقابلہ کر سکتے تھے مگر انھوں نے اس کو بلا حفاظت چھوڑ دیا تھا جس سے حملہ آوروں نے خیال کیا کہ یونانی تاب مقاومت نہیں لا سکتے۔ مگر درۂ تھرموپائلی پر پہنچکر جہاں سے وسطی یونان کا راستہ گیا ہے انھیں معلوم ہوا کہ ایک فوج ان کے مقابلہ کے لئے تیار ہے۔

زرکسیز کے مقابلہ پر تمام ملک یونان تیار نہ تھا۔ آرگوس کو اسپارٹا کی سیادت منظور نہ تھی اس لئے وہ الگ رہا۔ تھیبس ایتھنز کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے ایرانیوں سے مل گیا۔ سیراکیوز جو یونانی مستعمرات میں سب سے بڑا تھا صرف اس شرط پر شریک ہونے کو تیار تھا کہ جنگ کی عنان اس کے ہاتھ میں رہے۔ اس سے انکار کیا گیا اور وہ الگ رہا۔ ڈیلفی کے مندر کے پجاری بھی جذبۂ قومی سے عاری تھے اور اپنے دیوتا کی زبان سے کہلوایا کہ "فتح جنگ کے دیوتا کی ہوگی جو مشرقی گاڑی میں آرہا ہے"۔ جنگ کا خمیازہ ایتھنز اور اسپارٹا کو بھگتنا پڑا۔ ایتھنز کی بے نفسی اور قوم پرستی خصوصاً قابل ستائش ہے کہ اس نے اپنی تمام بری اور بحری فوجیں اسپارٹا کے تحت میں کر دیں گو اس کے جہازات تعداد میں زیادہ تھے۔ جنگ مراتھان کے بعد ایتھنز میں کئی اہم انقلابات ہو چکے تھے۔ اولوالعزم اشخاص ایتھنز کی سیادت کے لئے آپس میں مجادلہ کر رہے تھے۔ ان میں سے ایرس ٹائیڈز قدامت پسند تھا۔ وہ اس خیال کا سخت مخالف تھا کہ ریاست کے تمام ذرائع بحر سے پر صرف کئے جائیں اور اس امر پر زور دیتا رہا کہ ایتھنز کی نجات ایک زبردست فوج رکھنے پر منحصر ہے۔ بیڑے کے قیام کا زبردست حامی تھمس ٹاکلیس تھا جو کلیس تھینس کی اصلاحات کے طفیل میں ایتھنز کے زمرۂ احرار میں شامل ہوا تھا۔ اس نے ایتھنز کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور ایرس ٹائیڈس کو بن باس ہونا پڑا۔ جب زرکسیز نے یونان پر حملہ کیا ایتھنز کے پاس ایک زبردست بیڑا تھا اور سمندر میں اس کو وہی فوقیت حاصل تھی جو اسپارٹا کو خشکی پر تھی۔ مگر اتحاد حاصل

کرنے کی غرض سے اسپارٹا کی ماتحتی اس نے قبول کرلی۔

یونانی سپہ سالاروں کا خیال تھا کہ درہ ٹیمپ سے مقابلہ شروع کیا جائے اور وہاں ایک فوج کا دستہ بھیجا بھی گیا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ وہاں مقابلہ دشوار ہے اس لئے یہ خیال ترک کر دیا گیا اور ایک چھوٹی سی یونانی فوج لیونی ڈاس شاہ اسپارٹا کے زیرکمان درۂ تھرموپائیلی کی حفاظت کے لئے بھیجی گئی اور ایک یونانی بیڑہ جس میں ایتھنز کے جہازات تعداد غالب میں تھے درۂ مذکور کے سمندر کا راستہ بند کرنے کے لئے بھیجا گیا مگر باوجود اہل اسپارٹا اور دوسرے یونانیوں کے بے مثل ایثار کے زرکسیز نے درہ فتح کرلیا اور قریب تھا کہ تمام وسطی یونان اس کے تصرف میں آجائے۔ اگر اس نے جرأت کے ساتھ ایک زبردست حملہ کیا ہوتا تو یہ امر ناممکن الوقوع نہ تھا مگر ایک ایسا تغیر ہوا جس نے جنگ کے رخ کو بالکل بدل دیا۔

اہل ایران یا یونان کسی نے بحری فوج کی قوت کا اندازہ نہ کیا تھا کہ اس سے جنگ میں کیا کام نکل سکتے ہیں۔ ایرانیوں کے نزدیک تو جہازوں کا مصرف صرف یہ تھا کہ ان پر فوج کے لئے سامان خورد و نوش لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جائے یا بصورت شکست ان پر بیٹھ کر بھاگ نکلیں۔ یونانی بھی جہازوں کو حفاظتی جنگ اور بری افواج کی امداد کے لئے استعمال کرتے تھے مگر اس جنگ کا فیصلہ جہازوں نے کیا۔ یونانی بیڑہ خلیج سلامس میں لنگر ڈالے ہوئے تھا کہ اہل ایتھنز کو اپنا شہر خالی کرنے میں مدد دے انہیں مطلق یہ خیال نہ تھا کہ بیڑے سے جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مگر اتفاقات اور ایتھنز کے سرغنہ تھیمس ٹاکلز کی حکمت عملی سے جنگ ہو ہی گئی۔ شاہ ایران کو فتح کا یقین تھا مگر اس کی افواج کثیرہ تنگ سمندر میں نقل و حرکت نہ کر سکتی تھیں جس کے سبب سے ان کو سخت شکست ہوئی۔ برخلاف اس کے یونانی اپنے زاد و بوم کے لئے لڑ رہے تھے اور مقامی حالات سے واقف تھے اور بہ نسبت اپنے حریفوں کے جہازوں کا استعمال زیادہ عمدگی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اسی لئے وہ مظفر و منصور ہوئے۔

جنگ سلامس یونان کی تاریخ میں فیصلہ کن جنگ خیال کی جاتی ہے کیونکہ اس سے یونان کی آزادی اور یوروپین تمدن دونوں دوامی فنا سے بچ گئے۔ مگر یہ دل خوش کن نتیجہ ہرگز نہ پیدا ہوتا اگر زرکسیز میں ذرا سا بھی جرات یا استقلال ہوتا۔

اس کا بیڑا اب بھی یونانیوں کے بیڑہ سے بڑا تھا۔ اس کی فوج قریب قریب محفوظ تھی۔ مگر جنگ سے اس کا دل اکتا گیا تھا اور مارڈونییس کو فوج کا سپہ سالار کر کے ایران کو واپس چلا گیا۔ جنگ کے بعد ایام سرما میں ایرانیوں کے سپہ سالار نے کوشش کی کہ اسپارٹا اور ایتھنز میں نفاق پیدا ہو جائے لیکن گو ایک حد تک اسپارٹا نے ایتھنز کی امداد میں پہلو تہی کی مگر ان میں اتحاد قایم رہا۔ سلامس کی فتح سے ان تمام ریاستوں میں جوش بڑھ گیا جن میں قومی احساس باقی تھا اور دوسرے سال موسم بہار میں ایک یونانی فوج بوائے شیا میں داخل ہوئی اور وہیں ۴۷۹ ق۔م میں پلاٹیا کی جنگ عظیم وقوع میں آئی۔ اس جنگ میں اتفاقات سے نہیں بلکہ فوجی تفوق کے سبب سے یونانیوں کو فتح و ظفر نصیب ہوئی اور ان کو معلوم ہوا کہ ایران ایک مصنوعی ہاتھی ہے جس میں بھوسا بھرا ہوا ہے اور بجائے خوف کے ایرانی سپاہیوں اور ان کے طرز جنگ کو حقارت سے دیکھنے لگے۔ اسی اثنا میں مائی کالی کی بحری جنگ میں جو ایشیائے کوچک کے سواحل پر ہوئی۔ یونانیوں کو فتح حاصل ہوئی جس سے ثابت ہو گیا کہ سلامس کی فتح محض اتفاقی نہ تھی۔

باوجود ان شکستوں کے ایشیائے کوچک اور جزائر میں بہت سے یونانی شہر ابھی تک ایرانیوں کے قبضہ میں تھے اور یہ اندیشہ ہر وقت پیش نظر تھا کہ زرکسیز کی افواج کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے پھر کوئی زبردست ایرانی فوج نہ آ جائے۔ اس لئے جنگ پلاٹیا کے بعد یونانیوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ افواج ہر وقت تیار رکھی جائیں اور اس مقصد کے لئے تمام یونانی ریاستیں ایک زبردست اتحاد میں شریک ہوں۔ یونانی ریاستوں کا یہ اتحاد تاریخ یونان میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہی ایک موقع ہے کہ یونان کی ریاستوں

میں اتحاد کا شائبہ پیدا ہوا اور اس کا سلسلہ نہایت ہی قلیل زمانہ تک رہا مگر اس سے دو زبردست اتحاد پیدا ہوئے جن میں یونان جنگ ہائے پیلوپونیس کے زمانہ تک منقسم تھا۔ اس کے علاوہ اس اتحاد سے ایران کے خلاف جنگ جاری رہی اور تجدید کا مقصد یہ تھا کہ سرزمین یونان کو ایران کے طوق غلامی سے آزادی نصیب ہو۔

ہم مجبور ہیں کہ اس جنگ کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کریں۔ افواج یونان کی کمان چند وجوہ سے بجائے اسپارٹا کے ایتھنز کے ہاتھ میں آگئی جس کو ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے۔ پہلے تو ایرانی بحیرۂ ایجین کے جزائر سے نکال دیئے گئے۔ اس سے یونانیوں کی ہمت افزائی ہوئی اور بجائے مدافعت کے انھیں خود حملہ کرنے کا حوصلہ ہوا۔ خوش قسمتی سے انھیں کی مون سا تجربہ کار سپہ سالار مل گیا اور اس کی بیدار مغزی کی وجہ سے یوری میڈن کے قریب انھوں نے ایران کی بری اور بحری افواج کو شکست دی اور مصر تک ایرانیوں سے لڑتے ہوئے پہنچ گئے۔ یہاں پہلے پہلے تو شاندار فتوحات نصیب ہوئیں مگر بعد میں انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ۴۵۰ھ ق م میں انھوں نے ایک فوج جزیرۂ قبرس کو فتح کرنے کے لئے بھیجی۔ ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی مگر بدنصیبی سے اثنائے جنگ میں کی مون کا انتقال ہو گیا۔ ۴۴۸ھ ق م میں ایران و یونان میں صلح اس شرط پر ہوئی کہ آئندہ سے کوئی ایرانی بیڑہ ایشیائے کوچک کے سواحل یا بحیرۂ ایجین کے اطراف میں نہ آنے پائے۔ حکومت ایران اس کے بعد بھی یونان کے ہمسایوں میں سب سے طاقتور تھی مگر یونان پر حملہ کرنے کی اسے پھر جرأت نہ ہوئی۔

مگر جنگ ایران کا اختتام دل خوش کن نہیں ہے۔ اگر یونان کی تمام ریاستیں متحد ہو جاتیں تو اس بدنصیب ملک کا انجام کچھ بہتر ہوتا۔ مگر آتش حسد کا فرو ہونا مشکل تھا۔ ایران کی فوج کی موجودگی میں بھی کئی ریاستیں جنگ سے الگ رہیں اور جب یہ خطرہ ہمیشہ کے لئے دفع ہو گیا تو پھر میدان پلاٹیا میں جو اتحاد قائم ہوا تھا اس کا باقی رہنا اور بھی دشوار تھا۔ اتحادیوں کے طرز عمل کے متعلق ایتھنز

اور اسپارٹا کے درمیان وسیع اختلافات تھے۔ ایتھنز والوں کی رائے تھی کہ بے دھڑک حملہ کرنا چاہیئے مگر اسپارٹا والے دور دراز ممالک میں قسمت آزمائی کو حماقت خیال کرتے تھے۔ ۴۷۷ ق۔م میں پاسانیس شاہ اسپارٹا چند الزامات کا جواب دینے کے لئے قسطنطنیہ سے واپس بلایا گیا جہاں کی افواج کا وہ سپہ سالار تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد بیڑہ کی کمان دوسرے حلیفوں کی رائے سے ایتھنز والوں کو پیش کی گئی اور انھوں نے قبول کر لی۔ جب دوسرا سپہ سالار اسپارٹا سے آیا اس کو سوا اس کے چارہ نہ تھا کہ یا تو واپس جائے یا ایتھنزیوں کی ماتحتی قبول کرے۔ اس لئے اسپارٹا کا بیڑا واپس چلا گیا اور حلیفوں کے تمام بیڑے ایتھنز کے تحت میں آ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین یونان میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ اسپارٹا خشکی کی ریاستوں کا مرکز تھا اور ایتھنز بھی کچھ عرصہ تک اس میں شامل رہا۔ مگر بحری ریاستوں نے اپنی جماعت الگ بنا لی جس کو اتحاد ڈے لین اس مناسبت سے کہتے تھے کہ اس کے جلسے ڈیلوس میں ہوتے تھے۔ اس کی صدارت ایتھنز کو دی گئی۔ اتحاد ڈے لین یونانی سیاسیات میں ایک جدید اور امید افزا تجربہ تھا۔ ریاستیں خود اس میں بہ طیب خاطر شریک ہوئیں کیونکہ امید تھی کہ اس کے وجود سے ایرانیوں کو حملہ کرنے کی جرات نہ ہوگی اور سواحل بحر ایجین پر امن و امان قائم رہیگا۔ جملہ معاملات بطریق احسن طے کر لئے گئے اور یہ بھی طے ہو گیا کہ ہر ریاست کو کس قدر جہاز سپاہی اور نقد روپیہ فراہم کرنا چاہیئے۔ ہر سال موسم بہار میں جملہ شرکائے اتحاد کے نمائندوں کا ایک جلسہ ہوا کرتا جس میں سال آئندہ کا نظام العمل طے ہوتا۔ اس اتحاد میں زمانۂ حال کے دستور اشتراکی کی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر اتحاد یونان کی حوصلہ افزا امیدیں جلد خاک میں مل گئیں۔ جب ایران کے حملوں کے توارد کا خوف جاتا رہا اکثر ریاستوں سے مقررہ رقوم کے ادا کرنے میں پہلوتہی ہونے لگی مگر شرائط اتحاد کی رو سے کسی ریاست کو علیحدہ ہونے کا اختیار نہ تھا اور ایتھنز کی یہ پالیسی تھی کہ علیحدہ ہونے والے کو بجبر اتحاد سے الگ نہ ہونے دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد ڈے لین دیگر الفاظ میں شہنشاہیت ایتھنز ہو گیا اور اس کے حلیف اس کے

باجگذار ہو گئے یعنی ایتھنز کی اب صرف صدارت نہ تھی بلکہ شہنشاہیت۔ ہم اس امر کا احساس کر سکتے ہیں کہ یونان کو اس بات کی ضرورت تھی کہ وہاں "شہری ریاست" سے زیادہ طاقتور ریاست پیدا ہو اور ایتھنز کی شہنشاہیت اس کا پیش خیمہ تھا۔ مگر ایتھنز کے ہمعصر اس کو ایک جابر حاکم خیال کرتے تھے جو دوسری ریاستوں پر بلا روک حکومت کر رہی تھی جن کو خود مختار ہونے کا استحقاق تھا۔

آئندہ سے یونان کی ریاستیں دو گروہوں میں منقسم ہو گئیں ایک تو اسپارٹا اور اس کے حلفاء اور دوسرے ایتھنز اور اس کے حلفاء اور ان دونوں ہمسر سلطنتوں میں بہت جلد جنگ چھڑ گئی ایتھنز کو یہ ہوس ہوئی کہ علاوہ جزائر کے سرزمین یونان کے ایک حصہ کثیر کو اپنے قبضہ میں لائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے وسط یونان کی ریاستوں سے ایتھنز والے برسرپرخاش ہو گئے اور پھر اسپارٹا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ابتداءً ایتھنز کا پلہ بھاری رہا مگر خشکی پر اس کے سپاہی نہ اسپارٹا کا مقابلہ کر سکتے تھے نہ تھیبیوں کا۔ ۴۴۵ق م کے ختم ہونے تک ایتھنز کی سلطنت کا خشکی کے حصہ کا خاتمہ ہو گیا اور اسپارٹا سے صلح کرنے پر مجبور ہوا جسے سی سالہ صلح کہتے ہیں۔ اس صلح کے مطابق ہر دو اتحادات نے جس کے صدر اسپارٹا اور ایتھنز تھے ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کیا اور یہ طے ہو گیا کہ کسی اتحاد کے کسی اراکین کو اس سے علحدہ کر کے اپنے اتحاد میں شریک کرنے کی کوشش نہ کی جائیگی۔ اور اگر آپس میں کسی قسم کی غلط فہمی یا اختلاف ہو تو جنگ کے قبل ثالثی سے کام لیا جائے۔ ۴۴۵ق م میں گویا ایتھنز کی فوجی فتوحات کی آرزو کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اسی زمانہ میں یہ ریاست اپنی عظمت کے انتہائی درجہ پر پہنچ رہی تھی۔ تاریخ یورپ میں اسکی طرز حکومت، تمدنی زندگی، ادبیات، اور فنون لطیفہ ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں جن کا تذکرہ باب آئندہ میں ہوگا۔

باب چہارم

یونان پیریکلیس کے زمانے میں

پیریکلیس نے اپنی ایک مشہور تقریر میں ایتھنز کے خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایتھنز یونان کا مکتب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایتھنز میں یونانی تمدن کے بہترین عناصر موجود تھے اور اس شہر کے باشندوں نے یونان کے سامنے ایک ایسا صحیح نظر پیش کیا تھا جس کی سب پیروی کر سکتے تھے۔ پیریکلیس کا دعوے بیجا نہ تھا۔ گو یہ صحیح ہے کہ اہل ایتھنز ضبط اور استقلال کا سبق اسپارٹا سے سیکھ سکتے تھے اور یونان کے دوسرے اضلاع نے بھی فنون لطیفہ اور فلسفہ کی ترقی میں حصہ لیا ہے اور یونان کے سیاسی خیالات کی اشاعت میں بھی ان کا حصہ ہے۔ مگر باوجود ان امور کے اس میں شک نہیں کہ تمام یونان ایتھنز کے کمالات سے فیضیاب ہوا ہے جس طرح کہ یونان خود تمام یورپ کے لئے منبع علم و فضل ہے۔

ایتھنز کا تمدن

ایتھنز کے تمدن میں بہت کم ایسے خصوصیات ہیں جو یونان کی دوسری ریاستوں میں نہیں پائے جاتے۔ ایسے اشخاص کی تعداد جن کو "شہریت" کے پورے حقوق حاصل تھے ان کی تعداد قریب ۔۔۔۔۵ کے تھی۔ مگر علاوہ شہریوں کے ایک تعداد کثیر ایسے اشخاص کی تھی جن کا شمار شہریوں میں نہیں تھا۔ ان میں وہ غیر ملکی شامل

تھے جو ایتھنز میں بغرضِ تجارت مقیم تھے اور شہریت کے حقوق سے محروم تھے کیونکہ کلیس تھینس کی اصلاحات سے کسی غیر ملکی کا حقوقِ شہریت حاصل کرلینا سخت دشوار ہوگیا۔ یہ آزاد غیر ملکی جو میٹک کے نام سے موسوم تھے اکثر بندرگاہ میں مقیم تھے اور ریاست ایتھنز کی تجارت زیادہ تر انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کے علاوہ غلام بھی تھے۔ ان کی ٹھیک تعداد کا اندازہ کرنا دشوار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ احرار سے ان کی تعداد زیادہ تھی۔ زمانۂ قدیم کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہ ہوتی تھی۔ ان کے آقاؤں کو انکے جان ومال پر پورا اختیار تھا اور بہ جلینی کی یادداشت میں لاریم کی کانوں میں بھیجدئے جاتے جہاں سے زندہ بچکر آنا محال تھا۔ مگر ایتھنز کے باشندے نرم دل اور خدا ترس تھے اور بمقابلہ دوسری یونانی ریاستوں کے اپنے غلاموں سے انسانیت کا سلوک کرتے۔ غلاموں کا کوئی مخصوص لباس نہ تھا، اپنے آقا کے گھر یا خاندان کے دوسرے ارکین کی طرح رہتے اور ان کے تعلقات اپنے آقاؤں سے خوشگوار تھے۔ اس زمانے کے محققین جن کے پیش نظر اسپارٹا کی سختی تھی ایتھنز میں غلاموں کی آزادی کو خطرناک خیال کرتے تھے مگر غلاموں کے ساتھ جو عمدہ سلوک وہ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کی ریاست میں غلاموں نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ زمانۂ جنگ میں اور خصوصاً جنگ پیلوپونیس کے اختتام پر اکثر غلام میدانِ جنگ سے فرار ہوگئے۔ مگر ایتھنز کی تاریخ میں غلاموں کی کسی ایسی اہم بغاوت کا پتا نہیں چلتا جیسا کہ اسپارٹا میں ہیلیٹون کی بغاوت ہوئی جس سے اس ریاست کی زندگی کا چراغ گل ہوتے ہوتے رہ گیا جس زمانے کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں اس کے بعد عقلاء ایتھنز غلامی کے جواز و عدم جواز پر بحث کرنے لگے تھے۔ یوری پی ڈیس کا خیال تھا کہ بعض غلاموں کے خصائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بہ نسبت اپنے آقاؤں کی آزادی کے زیادہ مستحق ہیں اور ارسطو نے لطائف ودلائل غلامی کے جواز میں پیش کئے ہیں جس کو وہ تمدن کے بقا کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔

ایتھنز کی عورتوں کے حالات کے ضبط تحریر میں لانے کی زیادہ ضرورت

نہیں کیونکہ معاملات سلطنت میں انھیں بہت کم دخل تھا۔ ہومر کے زمانے میں جو آزادی عورتوں کو نصیب تھی وہ پیریکلیس کے زمانہ میں قریب قریب مفقود ہو گئی تھی۔ شہری زندگی کی ترقی اور مشرقی ممالک سے آمد و رفت بڑھ جانے کے سبب سے مشرقی پردہ کا رواج ایتھنز کی عورتوں میں ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے زنانہ قید سے سوا تہواروں اور دوسری رسوم کے نکلنے کے انھیں بہت کم مواقع ملتے۔ ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ زن و شوہر کی عمروں میں اکثر بہت فرق ہوتا اور باہمی موانست کا ہونا نکاح کے لئے ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا جیسا کہ آجکل مغربی ممالک میں رواج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایتھنز کی عورتوں کا اس کی تمدنی زندگی یا فنون لطیفہ یا فلسفے کی ترقی میں کوئی حصہ نہ تھا۔ گو بعض عورتیں اس کلیہ سے مستثنیٰ تھیں مگر عقلائے یونان کی توجہ اس مسئلے کی طرف منعطف ہو چکی تھی اور ان میں سے اکثر عورتوں کی بے بسی اور جہالت کو رفع کرنے کی کوشش میں تھے۔ ارسٹوفانیس نے اپنے ناٹکوں میں عورتوں کے "آزادی" حاصل کرنے اور امور مملکت میں حصہ لینے کا مذاق اڑایا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ رسم نکاح موقوف کر دی جائے اور ذکور و اناث کی تعلیم ایک ہی اصول پر ہو اور مختلف پیشوں کے اختیار کرنے میں کوئی روک نہ ہو۔ ان انقلاب آمیز خیالات کے مقابلہ میں زینوفن رسم نکاح کا مداح ہے اور اپنی ایک تحریر میں زن و شوہر کے خوشگوار تعلقات کو اخلاق کی بنیاد خیال کرتا ہے

یونان میں ایتھنز جمہوریت کا بہترین نمونہ تھا۔ مگر یونانی لفظ "جمہوریت" کا استعمال انھیں معنوں میں نہیں کرتے تھے جو اب اس کا مفہوم ہے کیونکہ خود ایتھنز میں لے ٹک اور غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں سے بہت زیادہ تھی اور ان کو سیاسی معاملات میں بالکل دخل نہ تھا۔ ایتھنز کو جمہوریت کہنے سے یہ مراد ہے کہ شہریوں کی جماعت میں کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس کو بوجہ امارت یا شرافت خاص حقوق حاصل تھے اور رعایا کی عام مجالس کو ریاست کے تمام سررشتوں کی نگرانی کا اقتدار حاصل تھا۔ ایتھنز کا دستور

سیاسی زمانۂ حال کے اصول سیاست سے بالکل مختلف تھا اور یہ اختلاف مجلس عوام اور خصوصاً اس کے وسیع اختیارات میں حاصل تھا۔ ہر مہینہ میں ایک بار یا دو بار تمام شہری یا کم از کم سب جتنے آسکیں، مقام "نکس" میں جمع ہوتے اسس جماعت کو "ایک لی سیا" کہتے تھے اور اس کے اقتدارات کی کوئی انتہا نہ تھی۔ زمانۂ امن و جنگ دونوں کے معاملات اس میں طے ہوتے۔ محصولات پر مباحثہ ہوتا۔ سربرآوردہ عہدہ داروں کا عزل و نصب ہوتا اور اسی جماعت سے وضع قوانین اور عدالت العالیہ کا کام بھی لیا جاتا۔ تاریخ عالم میں کسی ریاست میں مجلس عوام کو اس قدر وسیع اقتدارات حاصل نہ تھے۔

تمام مجالس وزرا اور حکام اسی مجلس ایک لی سیا کے تابع فرمان تھے۔ ریاست کے سربرآوردہ عہدہ داروں "جنرل" تھے جو تمام شہریوں کی رائے سے منتخب ہوتے اور ریاست کا تمام عملی کام انھیں کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر زمانۂ حال کے یورپین نظام سیاسی کی طرح ایتھنز میں "پارٹیاں" نہیں تھیں نہ کوئی شخص وزیر اعظم تھا یا اس عہدہ دار کے مماثل اقتدار رکھتا تھا اور جب "پارٹیز" کا وجود نہ تھا تو ظاہر ہے کہ نہ مجلس وزرا تھی نہ نیابت کا طریقہ تھا اور اگر ایسا ہوتا تو یہ شہریوں کی جماعت عام کے اقتدارات کے منافی ہوتا جو ایتھنز کے نظام سیاسی کا اصل اصول تھا۔ اس نظام کے علاوہ عہدہ داروں کے تقرر کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ ایتھنز میں عہدہ داروں کی تعداد کثیر تھی اور جمہوریت کا اقتضا یہ تھا کہ ان کی تعداد میں کثرت ہوتا کہ کسی ایک فرد یا چند افراد کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ نہ رہے۔ چند مستثنیات کے علاوہ ان تمام عہدہ داروں کا انتخاب قرعہ اندازی سے ہوتا جس کا نتیجہ تھا کہ کسی عہدہ کے لئے کسی قابل اور بیدار مغز شخص کا انتخاب شاذ و نادر ہوتا۔ جمہور ایتھنز میں اس سے عجیب و غریب کوئی شے نہیں، مگر اہل ایتھنز اسی کو جمہوریت کا اصل اصول خیال کرتے۔ ان کے خیال میں اس سے یہ فائدہ تھا کہ ہر شخص کو منتخب ہونے کے لئے برابر کا موقع تھا خواہ اس میں لیاقت یا کسی کام سے مناسبت ہو یا نہ ہو۔ قرعہ اندازی کے سبب سے کسی عہدہ دار کو یہ موقع نہ ملتا کہ مجلس عامہ کے اقتدار کو کلاً یا جزاً سلب

کر لے۔عہدہ داروں کی کثرت بھی ایتھنز کی ایک خصوصیت ہے۔ایک یونانی مصنف نے قریب چھ ہزار عہدہ داروں کے نام گنائے ہیں۔آزاد شہریوں کی قلیل تعداد کا خیال کرتے ہوئے ظن غالب یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی منصب حاصل تھا خواہ وہ بطور جوری کے کیوں نہ ہو جو ایتھنز میں مقدمات کا تصفیہ کرتے تھے۔جو عہدہ دار قرعہ اندازی سے منتخب ہوتے تھے ان میں سربرآوردہ اراکین "مجلس پنج صدی" تھے جو مجلس ایک لی سیا کے زیر نگرانی سلطنت کے معمولی کاروبار کو طے کرتے تھے مگر اس کا نظام ایسا قائم کیا گیا تھا کہ اس کو کوئی آزادی نہ ہو اور ہر بات میں وہ ایک لی سیا کی تابع ہو۔مگر اہل ایتھنز کو قرعہ اندازی سے خطرات کا احساس تھا اور وہ جانتے تھے کہ چند عہدہ دار ایسے بھی ہیں جن کا انتخاب قرعہ اندازی سے نہیں ہو سکتا۔اس لئے دس جنرلوں کا انتخاب غلبۂ آراء سے کیا جاتا اور جب ایتھنز کی مالی حالت خراب ہوگئی تو عہدہ داران مالیہ (فنانس) کا انتخاب بھی بذریعۂ انتخاب ہونے لگا گو پیرکلیس کے زمانہ میں ان کے لئے بھی قرعہ اندازی کا رواج تھا۔

پیرکلیس کا دعوےٰ تھا کہ نظام جمہوری جو ایتھنز میں رائج تھا اس سے آزادی مساوات اور استحکام حاصل تھا۔ہمارے قانون سے امیر و غریب ہر شخص کے لئے معدلت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور جب کوئی فرد کسی طور پر نام و نمود حاصل کرتا ہے تو وہ ریاست کی پبلک ملازمت میں داخل کر لیا جاتا ہے جو اس کی خدمات کا صلہ ہے نہ کسی قسم کا حق ہم ایسے شخص کو جو پبلک معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتا نہ صرف بے ضرر بلکہ بیکار خیال کرتے ہیں اور اگر ہم میں سے سب افراد کسی کام کی ابتدا نہیں کر سکتے تو کم از کم ہم میں بھلے برے کی تمیز موجود ہے۔ہماری رائے میں بحث و مباحثہ سے قوت فعلیہ میں ہرج نہیں ہوتا بلکہ نقصان جو پہنچتا ہے اس علم کے نہ ہونے سے ہوتا ہے جو کسی فعل کے قبل مباحثہ میں سے حاصل ہوتا ہے۔ایتھنز کی حریت و مساوات میں تو کوئی شبہہ نہیں مگر آئندہ چل کر معلوم ہوگا کہ اس کا دستور کارگر نہ تھا کیونکہ آخر میں ایتھنز کو اپنے اس تیقن کا خمیازہ بھگتنا پڑا کہ سلطنت کی خدمت

کے لئے کسی خاص لیاقت یا تعلیم و تجربہ کی ضرورت نہیں۔

امورِ مملکت میں پیریکلیس کے اقتدارات

اگر جمہوریت ایتھنز نے اس زمانہ میں امن و جنگ دونوں میں اپنی فوقیت ثابت کی تو اس کا سہرا بلا شبہ اس پرعظمت شخص کے سر ہے جس کے ہاتھ میں اس کی عنان حکومت تھی۔ پیریکلیس گروہ شرفا میں سے تھا مگر ابتدا ہی سے اس نے عوام کا ساتھ دیا اور جمہوریت ایتھنز پر اس نے آخری رنگ چڑھایا۔ فلسفیوں، صناعوں، شاعروں اور کاریگروں کا دوست تھا اور ایتھنز نے یونان میں فنون لطیفہ میں جو فوقیت حاصل کی وہ اس کی دلچسپی اور تربیت کی بدولت تھی۔ بہ حیثیت صدر جمہور اس کی حالت عجیب تھی۔ وہ صدر نشین یا وزیر اعظم نہ تھا۔ جمہوریت نے اسکو کسی ایسے عہدہ سے سرفراز نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے وہ سلطنت پر پورے طور پر حاوی ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ پندرہ سال تک وہ "جنرل" کے عہدہ پر فائز رہا مگر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کے علاوہ نو اور عہدہ دار بھی اس کے ہم مرتبہ تھے اور قانون وقت کے مطابق جب چاہتے اسے معزول کر سکتے تھے۔ مگر اس کی سیاسی قوت دوسری قسم کی تھی جس کو ہم اب مشکل سے سمجھ سکتے یا اپنے خیالات کے مطابق کر سکتے ہیں۔ جمہور کا وہ معتمد علیہ مشیر تھا۔ اس کی تقریریں بغور سنی جاتیں اور اس کے مشورہ پر عمل کیا جاتا۔ اس کا اقتدار ایسا تھا کہ اس کا احساس یا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا اور ہر وقت اسے اندیشہ لگا رہتا کہ کہیں اس کے ہاتھوں سے عنان حکومت نہ نکل جائے اور آئندہ محاربۂ عظیم کی ابتدا میں ایسا ہوا بھی۔ مگر اس کے جسمانی رعب، پرتاثیر فصاحت، اعلیٰ تدبر اور مستقل مزاجی کا زبردست سکہ اس کے ہموطنوں پر ایسا جما ہوا تھا کہ زمانہ حال میں بہت کم وزرا امر حقیقی معنوں میں طویل مدت تک برسر کار رہے ہیں گو فصاحت اور مجلس عوام میں اقتدار رکھنے کے سوا اس کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا۔

پیر کلیس کی جس تقریر کے اقتباسات ہم نے پیش کئے ہیں اس میں اسکی شان تدبّر اور جوش تقریری کی جھلک پائی جاتی ہے مگر ایتھنز کی عظمت کے اسباب جو وہ خیال کرتا ہے تعجب انگیز ہیں۔ پیر کلیس نے ایتھنز کے جنگی فتوحات اور اس کی سلطنت کی وسعت رقبہ پر اظہار فخر کیا ہے اور دعوے کیا ہے کہ اس کی عظمت و شکوہ پر آئندہ نسلوں کو حیرت ہوگی۔ مگر یہ امید غلط ثابت ہوئی۔ فتوحات کا دروازہ بند ہو گیا اور اس کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا مگر اس کے کارناموں پر زمانے کو اب تک تحیر و استعجاب ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی عظمت کا دار و مدار فتوحات اور وسعت سلطنت پر نہیں ہے بلکہ اس کے باشندوں کے تمدنی کمالات پر اور اس ترقی پر ہے جو انھوں نے علوم و فنون کے ہر شعبہ میں کی۔

پیر کلیس کے زمانہ میں ایتھنز کو عمارات کے لحاظ سے "عروس البلاد" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ معمولی مکانات کی تعمیر میں تو زیادہ تکلفات نہیں کئے گئے مگر ایک روپولیس (قلعۂ ایتھنز) اور اس کے قرب و جوار میں متعدد عالیشان عمارتیں وجود میں آگئیں جن سے فن تعمیرات میں ایک نیا دور پیدا ہوا۔ ایتھنز کی حفاظت کے لئے اس کی طویل دیواریں کافی تھیں جو سمندر تک چلی گئی تھیں اس لئے اس کی حفاظت کے لئے کسی قلعہ کی ضرورت باقی نہ رہی اور قلعۂ مذکور اس کی مذہبی زندگی کا مرکز ہو گیا جہاں جملہ رسومات ادا کی جانے لگیں۔ پیر کلیس ہی کی تحریک اور اہتمام سے پارتھی نان کے پر شکوہ مندر کی تعمیر شروع ہوئی جس کو فیڈئیس کے تراشے ہوئے مجسمات سے آراستہ کیا گیا جس کے ٹکڑے اب بھی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ پارتھی نان کے علاوہ ایک روپولیس پر دو اور مندر بھی تھے اور اس ٹیکری ہی کے دامن میں تھیٹر اور بڑے بڑے ہال بنے ہوئے تھے۔ فنون تعمیر و بت تراشی میں ایتھنز کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ فیڈئیس کا مایۂ ناز مجسمہ ایتھنا دیوی کی مورت تھی جس کے لئے پارتھی نان کا مندر بنا تھا۔ یہ مورت سونے اور ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے ضائع ہو گئی۔ اس کی صناعی کا اندازہ صرف سکوں سے ہو سکتا ہے جس پر

اس کے خط و خال کندہ تھے یا زمانۂ بعد کی بھدی نقلوں سے مگر خوش قسمت دیکھنے والوں پر اس کا اثر وہی ہوتا تھا جو مذہبی تصاویر کے بہترین نمونوں کا ہو سکتا ہے۔ اس سورت کے علاوہ پارتھی نان کے بیرونی حصہ بھی مجسمات سے آراستہ تھے جو یا تو فیڈیس کے خود تراشے ہوئے تھے یا اس کی نگرانی میں تراشے گئے تھے۔ ان مجسمات کے بڑے بڑے ٹکڑے اب بھی موجود ہیں اور اس سے یونانی بت تراشی کی خوبی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ایکروپولیس کے جنوب و مشرق میں ڈایونیسیس کا تھیٹر تھا جس سے تمام یورپ فیضیاب ہوا ہے کیونکہ ڈراما کی غایت صرف حظ نفس نہ تھی بلکہ اس سے روحانی مذہبی اور اخلاقی تعلیم بھی مقصود تھی۔ یونانیوں کے ادبی کمالات میں ڈراما نویسی نہایت ہی ممتاز ہے۔ قدیم یونان کے کھنڈروں میں تھیٹروں کے آثار ہر جگہ پائے جاتے ہیں اس کا اثر ان کے علم و ادب کی ہر شعبہ میں موجود ہے یہاں تک کہ رسوم مذہبی اور سیاسیات بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکے۔ ایتھنز کا تھیٹر اس قدر وسیع تھا کہ اس کی آزاد آبادی کی ایک تعداد کثیر اس میں وقت واحد میں آسکتی تھی۔ ڈراما کی نقلوں کی ابتدا ڈائونیسیس (شراب کا دیوتا) کی پرستش سے ہے۔ جس میں ان نقلوں کا ایک خاص حصہ تھا اور باوجود امتداد زمانہ ان نقلوں سے مذہبی عنصر بالکل غائب نہ ہوا۔ ایک وقت میں چار ایکٹروں سے زیادہ مکالمہ میں شریک نہ ہوتے۔ سینری (پردے) بالکل سادے ہوتے اور بدلے نہ جاتے۔ حزنیہ ناٹکوں میں نقالوں کی گفتگو خطیبانہ لہجہ میں اور ایک ہی طرز میں ہوتی۔ مگر کسی ملک میں ڈراما کو قومی زندگی میں اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ یونان میں کیونکہ مذہب و اخلاق و سیاسیات کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اس کو بنایا جاتا تھا اور زمانۂ حال میں جو کام اخبارات اور مذہبی خطبات سے لیا جاتا ہے اس زمانہ میں وہ کام ڈراما سے لیا جاتا۔ ڈراما کی دو قسمیں تھیں حزنیہ اور طربیہ حزنیہ میں متانت اور سنجیدگی کا پہلو غالب تھا اور طربیہ میں شوخی اور ظرافت کا۔ مگر طربیہ نویس بھی اپنا زور طبع تمدنی معاملات یا حسن و عشق کی داستانوں تک محدود نہ رکھتے بلکہ صاف صاف اور اکثر معاندانہ

پہلو سے اپنے زمانہ کے سیاسی مسائل پر بحث کرتے یا فلسفیوں کا مذاق اڑاتے۔
ایتھنز کے ممتاز ترین ڈراما نویس پیرکلیس کے زمانہ میں موجود تھے۔ حزنیہ نویسوں کا سرتاج اے سی کلیس تھا جو اندازاً ۵۲۵ قم میں پیدا ہوا اور ۴۵۶ قم میں انتقال کر گیا۔ ان تاریخوں کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جنگ ایران کے زمانہ میں تھا مگر اس کی موت کے قبل ایتھنز میں پیرکلیس کا اثر پیدا ہو چکا تھا۔ اے سی کلیس کے جانشین سوفوکلیس نے قریب ۹۰ سال زندگی پائی ۴۹۵ قم یعنی جنگ ماراتھان سے پانچ سال قبل پیدا ہوا اور ۴۰۶ قم میں انتقال کیا یعنے اپنے محبوب وطن کے دشمنوں کے قبضہ میں آجانے کے دو سال قبل۔ اے سی کلیس کی طرح اس میں بلند نظری نہ تھی مگر وہ اپنے مضامین کو اس خوبی کے ساتھ ترتیب دیتا ہے کہ ڈراما کے دیکھنے والوں کے قلوب پر اثر ہو۔ لیکن اگر وہ بلند نظری میں اپنے پیش رو سے کم ہے تو اس کے معاوضہ میں اس میں شوخی اور انسانیت زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے اگر وہ ایتھنز کا سب سے بڑا شاعر نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یونانی شاعری کی بہترین خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ اس دور کا تیسرا شاعر یوری پیڈس ہے مگر اس میں اور شاعران مذکورۂ بالا میں ایک خاص امتیاز ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی وہی ہے جو دوسروں کا تھا یعنی ایتھنز اور یونانیوں کے سورماؤں کے کمالات۔ مگر نہ تو اے سی کلیس کی طرح اس میں حسن اعتقاد یا صوفیانہ رنگ ہے نہ سوفوکلیس کی طرح حسن پرستی میں محو رہتا ہے۔ اس کی ذات سے یونان کی شاعری میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس میں ارتیاب، نکتہ چینی، بداعتقادی کا رنگ غالب ہے۔ عورتوں اور غلاموں پر جو مظالم ہوتے تھے اس کے دل پر خاص اثر ہوتا ہے۔ اس کی یہ انقلابی تعلیم اسکی ممتاز خصوصیت ہے اور اسی کے سبب سے اس کے کمال شاعری کے متعلق متضاد آرا ہیں۔
آرسٹوفینس کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طریقہ پر اس نے طربیہ ناٹک لکھیں ان کا رنگ زمانۂ ماسبق کی طربیات سے بالکل جداگانہ ہے اور باوجود مسخراپن اور بذلہ سنجی کی حد کر دینے کے شعر گوئی میں اس نے کمال

دکھایا ہے۔ اگر شیکسپیر بھی کہ ہمس یں دکھانے کے لئے کوئی تماشہ لکھتا تو غالباً وہ اسی شاعر کے رنگ میں ہوتا۔

یہ تمام مصنف شاعر تھے اور بحر و قافیہ کے پابند تھے مگر یورپ میں اسی عہد میں نثاری کا آغاز ہو چکا تھا ان مصنفین میں اولین ہیروڈوٹس تھا یہ ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا مگر اس کی تمام عمر ایتھنز میں گزر رہی۔ ہیروڈوٹس کی مایۂ ناز تصنیف جنگ ایران کی تاریخ ہے مگر اس میں اس نے نہ صرف یونان بلکہ ایران لیڈیا اور مصر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جیل یونانی کی تاریخ میں اس تصنیف سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی دور از قیاس واقعات کو بھی روایتاً بیان کر دیتا ہے۔ فوق العادت واقعات میں بھی اس کو شک نہیں ہوتا۔ مگر زمانۂ حال میں جن اصول پر تاریخ لکھی جاتی ہے اس کے اصل اصول اس کی تصنیف میں موجود ہیں کیونکہ وہ کوشش کرتا ہے کہ واقعات کے تہ تک پہنچ جائے اور مختلف راویوں کی شہادت کو وزن کرتا ہے گو اس میں اس کو کامیابی کم ہوتی ہے۔ اور دوسرا مورخ تھوسی ڈیڈس بظاہر بہت بعد کا معلوم ہوتا ہے گو واقعہ یہ ہے کہ دونوں ہمعصر تھے۔ تھوسی ڈیڈس نے جنگ پیلوپونیس کی تاریخ لکھی ہے جس کا ذکر آئندہ آئیگا۔ اس کا شمار یونان کے ممتاز اہل کمال میں ہے اور اس کی تاریخ کا سلاست بیان میں کوئی جواب نہیں۔ مگر اسی میں اس کا کمال نہیں کیونکہ سیاسی اور تمدنی فلسفہ کا آغاز بھی اسی کی تصنیف سے ہوا۔ جس مہیب جنگ کی تاریخ اس نے لکھی ہے اس جنگ کا کوئی عمدہ نتیجہ تھا تو اس کی یہ تحریر تھی۔

سائنس اور فلسفہ کو بھی اس دور میں نمایاں ترقی ہوئی۔ علوم طبعیات کی ابتدا ایشیائے کوچک میں ہوئی اور طالیس ساکن ملیٹس پہلا مہندس خیال کیا جاتا ہے۔ طالیس اور اس کے جانشینوں نے قدرت کا مطالعہ شروع کیا اور مناظر قدرت کے اسباب و علل پر غور کیا اس سے قبل رموز فطرت کا دارومدار دیوتاؤں اور دیویوں پر تھا۔ علم ہندسہ کے علاوہ ان فلسفیوں کے خیالات ہم کو عجیب اور لغو معلوم ہوتے ہیں مگر حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اس

تحقیق کی بنیاد ڈالی جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ علم طبعی کی ترقی میں ایتھنز کا بہت کم حصہ ہے۔ مگر فلسفہ کی جو خدمت اس نے کی ہے اس میں کسی یونانی ریاست کو برتری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سقراط ایتھنز کا باشندہ تھا۔ سقراط ۴۶۹ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۹۹ ق م میں اپنے ہموطنوں کی جہالت اور اوہام پرستی کا شکار ہوا۔ اس لئے دور پیریکلیس میں اس کا بھی شمار ہو سکتا ہے۔ سقراط حق کا فدائی ہونے کے سبب سے حقیقی معنوں میں فلسفی تھا مگر اس کے ہمعصر خیال کرتے تھے کہ وہ اپنے زمانہ کی سائنس و فلسفہ پر معترض تھا۔ اپنے زمانہ کی تعلیم اور اپنے ہمسروں کے طرز روش کو وہ مخرب اخلاق اور بیہودہ خیال کرتا تھا۔ علوم طبعی کے شیدائیوں کے خیالات کا مذاق اڑاتا۔ حصول علم اس کا بھی مدعا تھا مگر جس علم کا وہ جویاں تھا اس کے خیال میں آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ دیوتاؤں کی فطرت کیا ہے۔ انسان کیا ہے اور وہ شے کیا ہے جس کے حصول کی اس کو کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کی تعلیم کا طریقہ بھی اس کے عقائد کی طرح انوکھا تھا۔ نہ اس کا کوئی مدرسہ تھا نہ اسے شاگردوں کی تلاش تھی۔ اس کی عادت تھی کہ ایتھنز کے چوک میں ہر شخص سے گفتگو کرتا اور اثنائے گفتگو میں اس سے نیکی، جرات، پاکبازی اور دوسری انسانی خصوصیات پر بحث کرتا۔ اور اگر اس مباحثہ میں اپنے متعلمین کو وہ واقعی تعلیم نہ دیتا تو کم از کم اتنا ان کے ذہن نشین کر دیتا جو روزمرہ کے الفاظ ان کی زبان پر ہیں ان کے مفہوم کے سمجھنے میں قاصر ہیں۔ عقائد کی تنقید میں وہ ادب اور بذلہ سنجی سے کام لیتا جس کی وجہ سے ایتھنز کے تمام سمجھ دار نوجوان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اسی طرح اس نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی اور یورپی فلسفہ کی تاریخ میں کوئی فلسفی اس سے زیادہ ممتاز نہیں۔

اس دور کے فلسفہ اور فنون لطیفہ کی ترقی پر نظر غائر ڈالنا اس غرض سے ضروری ہے کہ بلا ریب انہیں کے سبب سے یونان کا سکہ یورپ کی تہذیب پر اب تک جما ہوا ہے۔ دنیا کی بہت سی اقوام یونان سے فنون

حکمرانی اور نبرد آزمائی میں سبقت لیگئی ہیں مگر دنیا کی کسی قوم نے دنیا کے علوم وفنون میں اس قدر قابل قدر اضافہ نہیں کیا ہے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ انکے کمالات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہے کہ جو کچھ کر گئے بلکہ انھوں نے آیندہ ترقی کا دروازہ کھول کر زمانہ حال کی ترقیات کی بنیاد ڈالی۔

باب پنجم

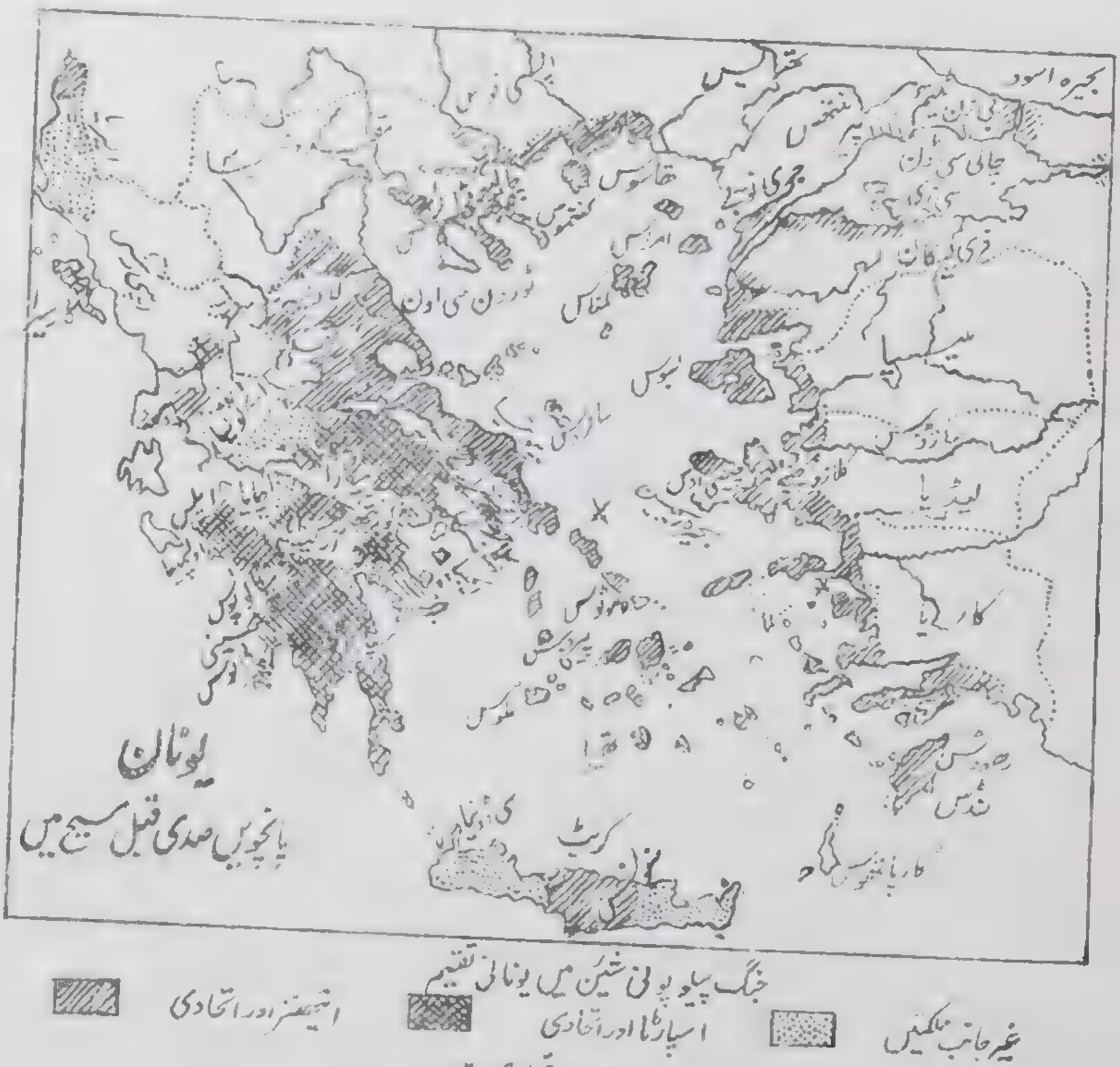
ایتھنز کا زوال اور احیاء

۴۴۵ ق م کی صلح میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ ریاست ہائے یونان کے مستقل اتحاد کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ مگر یونانیوں کے جذبات کا قابو میں لانا دشوار تھا اور اس کے علاوہ باہمی حسد کی وجہ سے صلح دیرپا نہ ہو سکتی تھی اور نہ کسی بیرونی دشمن کا خطرہ تھا۔ ایران کی قوت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مقدونیہ کا ستارہ اس وقت تک چمکا نہ تھا۔ سی سالہ صلح کے دس ہی سال بعد جنگ پیلو پونیس شروع ہوئی جس نے یونان کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔

اس جنگ کے اسباب بدیہی ہیں۔ "توازن قوت" جس پر آب یورپ کی سلطنتیں عمل پیرا ہیں اسکا اس زمانہ میں بھی احساس ہو چلا تھا گو اسکے لئے کوئی خاص نام نہ تھا یونانی سلطنتیں ہمیشہ کسی ایسی سلطنت کے خلاف میں متحد ہو جاتیں جسکی طاقت سے انکی آزادی معرض خطر میں ہوتی۔ ایتھنز کی طرف سے اس امر کا خدشہ پیدا ہو چلا تھا گو سرزمین یونان اور مصر میں اسے شکست ہو چکی تھی۔ اسکی سلطنت کا رقبہ یونانیوں کے خیالات کے مطابق ضرورت سے زیادہ وسیع تھا اور اس رقبہ پر اس کی حکومت جابرانہ تھی۔ اس کی تجارت میں روز افزوں ترقی ہو رہی تھی۔ پائرس بحیرۂ ایجین میں سب سے بڑا بندرگاہ ہو گیا تھا اور تجار اطراف و اکناف سے آکر وہاں آباد ہو رہے تھے۔ اس کی بحری اور بری تیاریوں کی وجہ سے اہل اسپارٹا خائف تھے اور تجارتی سرگرمی سے اہل کورنتھ خار کھاتے تھے، بلکہ ان کو خوف تھا کہ ایتھنز کے سبب سے

تجارت بالکل مندی نہ پڑ جائے کیونکہ مشرق میں سلاسس اور اے جی نا ایتھنز کے قبضہ میں تھے جس سے کورنتھ کو اندیشہ تھا کہ اپنے زبردست بیڑے کی مدد سے ایتھنز جب چاہے اس کی تجارت کو برباد کر سکتا ہے۔

مغرب میں بھی ایتھنز نے اسپارٹا کے باغی غلاموں کی ایک نوآبادی ناپاکٹس میں بسادی تھی۔ یہ مقام خلیج کورنتھ کے تنگ ترین حصہ میں واقع تھا جس کے سبب سے اس کے حکام کو خلیج کورنتھ میں جہاز رانی بند کر دینے کا ویسا ہی موقع حاصل تھا جیسا کہ انگلینڈ کو جبرالٹر کے قبضہ سے بحیرۂ روم میں تفوق حاصل ہے۔ ایتھنز کی سلطنت وسیع تھی مگر اس کے پرجوش باشندوں کی اولوالعزمی اس وسعت کو بھی ہیچ خیال کرتی تھی۔ صقالیہ (سسلی) اور جنوبی اطالیہ کی یونانی نوآبادیاں دولت مند ہونے کے علاوہ ان کی تجارت برسر ترقی تھی اس لئے بہت سے ایتھنیوں کا خیال تھا کہ ان کو بھی اتحاد ایتھنز کے جال میں پھانس لیا جائے۔ یونان کی تاریخ بھی چھوٹے پیمانہ پر یورپ کی تاریخ ہے اور اکثر یورپین جنگوں کے اسباب بھی وہی تھے جو اسں یونانی محاربۂ عظمے کے تھے۔ کورسیرا شہر کورنتھ کی ایک نوآبادی تھی مگر آپس میں کچھ ناچاقی ہوگئی جس کے سبب سے اہل کورسیرا نے اتحاد ایتھنز میں شرکت کی درخواست کی تاکہ کورنتھ کی آتش غضب کے شکار نہ ہو جائیں۔ کورسیرا کے اتحاد ایتھنز کی شرکت میں سی سالہ صلح کی شرائط میں سے کوئی شرط مانع نہ تھی مگر اہل ایتھنز یہ خوب جانتے تھے کہ اگر کورسیرا ان کے اتحاد میں داخل کر لیا گیا تو اس کا نتیجہ خانہ جنگی ہوگا اس لئے یہ معاملہ مدت تک زیر غور رہا مگر آخر کار ایتھنیوں نے کورسیرا کو اپنا حلیف بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ آتش جنگ مشتعل ہوگئی۔ کورنتھ نے اسپارٹا سے امداد کی درخواست کی۔ ایک مدت تک سفارتی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا مگر مصرع "دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا" اس لئے بالآخر ۴۳۱ ق م میں جنگ شروع ہوگئی جو جنگ پیلوپونیس کے نام سے مشہور ہے۔ دنیا میں شاید ہی کسی اور جنگ کی تاریخ اس سے زیادہ شدومد سے لکھی گئی ہو کیونکہ اسں کا مصنف تھوسی ڈیڈس ایتھنی بحیثیت



یونان پانچویں صدی قبل مسیح میں

ایک افسر کے اس جنگ میں شریک تھا کسی بحری جنگ میں اسے ناکامی ہوئی جس کے سبب سے اپنے محبوب وطن سے خارج کر دیا گیا اور بقیۃ العمر اس نے اپنے دشمنوں میں گزاری شرکت جنگ کے سبب سے اسے واقعات سے واقف ہونے کے نادر ذرایع حاصل تھے جس سے دوسرے مورخین بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے۔ اس واقفیت کے علاوہ اس میں دوسرے محاسن بھی موجود تھے مثلاً عمق نظر، بے لوث غیر جانب داری" اور پر اثر طرز تحریر جس کی وجہ سے اس کی تصنیف دنیا کی بہترین تاریخوں میں شمار کی جاتی ہے اور فلسفۂ تاریخ میں اس تحریر سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ایتھنز میں اُس وقت میں جمہوری سلطنت قائم تھی مگر بقول تھوسی دیدس یہ صرف ظاہری صورت تھی مگر اصل میں پیر کلس بلا شرکت غیرے سلطنت ایتھنز پر حکمراں تھا۔ اس جنگ اور دشمنوں کی کثرت سے پیر کلس ہراساں نہ ہوا کیونکہ وہ اسکو ایک خیال کرتا تھا اور اسے یہ بھی امید تھی کہ آخر میں ایتھنز ہی کو فتح نصیب ہوگی۔ اسے یہ خوب معلوم تھا کہ ایتھنز کی بری فوج اس قدر زبردست نہ تھی کہ وہ اسپارٹا کی جری اور باقاعدہ فوجوں کا مقابلہ کر سکے مگر ایتھنز کی فصیلوں کی مضبوطی پر اسے کامل اعتماد تھا۔

اس کے علاوہ ایتھنز کی بحری فوج نہایت زبردست تھی اور اس کے پاس زر و مال بھی اسپارٹا سے بہت زیادہ تھا پیر کلس نے مدافعتی جنگ کا مشورہ دیا کہ اسپارٹا والے تھک کر صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر اس مشورے پر ایتھینی سختی کے ساتھ کاربند ہوتے تو ممکن تھا کہ پھر صلح ہو جاتی۔ مدافعتی جنگ سے نہ فیصلہ کن فتوحات کی امید ہو سکتی اور نہ مختلف فیہ مسائل کے تصفیہ کی۔ جنگ کے ابتدائی زمانے میں کوئی نتیجہ خیز لڑائی نہیں ہوئی۔ ۴۳۱ سنہ اور ۴۳۰ سنہ ق م میں اسپارٹا اور اس کے حلفا افواج کثیر کے ساتھ اٹیکا میں داخل ہوئے مگر ایتھینی اپنی فصیلوں کے اندر گھس آئے اور اسپارٹا والوں کو بلا مزاحمت اپنی زراعت برباد کرنے دی اور خود بحری محاربات سے اہل اسپارٹا کو پریشان کرتے رہے مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔

بد قسمتی سے ۴۳۰ سنہ میں ایتھنز کو ایک ایسی بلائے بے درماں سے پالا پڑا جو اسپارٹا سے زیادہ مہیب تھی۔ اس کی فصیلوں کے اندر مرض طاعون پھیل گیا اور چونکہ دیہات کے باشندوں کے آجانے سے آبادی حد درجہ گنجان ہو گئی تھی اس لئے ہزاروں آدمی اس بلا کی نذر ہوئے جس سے ایتھنیوں میں ایک عام پریشانی پھیل گئی۔ مگر مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی پیرکلیس کو بھی طاعون ہو گیا تھا مگر اس سے صحت پا کر اس نے کسی معمولی سی بیماری میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایتھنیوں کی امیدوں کا دارومدار اسی کی ذات پر تھا کیونکہ اس کے سوا ان میں کوئی شخص ایسا موجود نہ تھا جو اس کا معتمد علیہ ہونے کے علاوہ ایتھنز کی عظمت کو بھی برقرار رکھ سکتا۔ مجلس ایکلسیا کو ایک موقر مشیر کی ضرورت تھی۔ اس مجلس میں بہ حیثیت مجموعی جرأت، حب وطن، اور استقلال کی کمی نہ تھی مگر بغیر کسی ہادی اور رہبر کے قوی اندیشہ تھا کہ فوری جوش میں بلا کافی غور و خوض کے کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جس سے بعد میں پشیمانی ہو۔ جنگ کا سلسلہ برسوں جاری رہا جس میں بہت سے جوش افزا معارکات ہوئے مگر کوئی فیصلہ کن ثابت نہ ہوا۔ اکثر واقعات جن کا ذکر تھوسی ڈیڈس نے بڑے شد و مد سے کیا ہے فی الحقیقت نہایت ہی خفیف تھے۔ ۴۲۵ سنہ میں ایتھنز کے بیڑے نے دو تین سو اسپارٹا کے سپاہی پیلو پونیس کے سواحل پر گرفتار کر لیے۔ اسپارٹا میں احرار کی تعداد اس قدر کم تھی کہ دو سو سپاہیوں کے گرفتار ہو جانے سے ایک عرصہ کے لئے جنگ کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر اس کامیابی سے ایتھنیوں کا دماغ پھر گیا اور چونکہ صلح انھیں کسی طرح منظور نہ تھی۔ اس لئے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ۴۲۴ سنہ ق م میں اسپارٹی جنرل براسی ڈاس ایک چھوٹی سی فوج لیکر چالیسی ڈس پہنچ گیا جو بحیرۂ ایجین کے شمال میں واقع ہے۔ اسپارٹا کی افواج کے لئے ان کا اس دور دراز مقام تک پہنچ جانا اور ایتھنز کے خوفناک بیڑے سے کسی جگہ مڈبھیڑ نہ ہونا ان کے لئے بہت بڑی کامیابی تھی۔ ایتھنی محکوم ریاستوں پر جابرانہ حکومت نہ کرتے تھے مگر ان کی تالیف قلوب میں ایتھنیوں کو کامیابی نہ ہوئی اس لئے براسی ڈاس نے کچھ حکمت عملی اور کچھ ڈرا دھمکا کر اس شہر کے بہت سے باشندوں کو ملا لیا۔ ایتھنز کو اس جنگ میں

کچھ ایسا سخت دھکہ نہیں لگا تھا، اور اس لیے شمالی اضلاع میں اپنا رسوخ دوبارہ قایم کرنے کے لئے انھوں نے ایک عظیم الشان مہم کی تیاری شروع کر دی۔ مگر اس فوج کو جو جمہوری لیڈر کلیون کے زیر کمان تھی ایم فی پولس میں شکست فاحش ہوئی۔ کلیون اور براسی ڈاس دونوں اس لڑائی میں کام آئے۔ دونوں فریق امتداد زمانہ کی وجہ سے جنگ سے عاجز آ گئے تھے اور ۴۲۱ میں صلح اس شرط پر ہوگئی کہ ہر دو فریق اپنے اپنے فتوحات سے دست کش ہوں۔

چھ سال تک برائے نام صلح رہی مگر ایتھنز اور اسپارٹا کی روز افزوں رقابت سے تمام یونان میں ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں۔ ایتھنز میں خود مختلف پارٹیوں میں آپس میں مخالفت تھی۔ قدامت پسندوں کا لیڈر نی کیاس تھا۔ پاکبازی اور ایمانداری کی وجہ سے اس کی بڑی عظمت تھی مگر اخلاقی جرات یا سیاسی فراست سے عاری تھا۔ عوام کا لیڈر السیا بڈس تھا جو اپنے زمانہ میں یونانیوں میں نہایت ہی پرشوکت گزرا ہے۔ اپنے حسن صورت، خوش گوئی اور جنگی اور انتظامی قابلیت کی وجہ سے اس کے ید قدرت میں تھا کہ ایتھنز میں ایک نئی روح پھونک دے مگر ان محاسن پر نفسانیت اس قدر غالب تھی کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ایتھنز کی بربادی میں اس کا حصہ غالب ہے۔ اس نے پہلے کوشش کی کہ اہل پیلوپونیس کو اسپارٹا کے خلاف متحد کرے اور اس میں اس کو قدرے کامیابی ہوئی مگر اسپارٹا نے اتحادیوں کو میدان جنگ میں شکست فاحش دے کر اس اتحاد کو زیر و زبر کر دیا۔ اس کے بعد السیا بڈس نے ایک زیادہ اہم اور پرخطر مہم کا بیڑا اٹھایا۔ ایتھنز اور اسپارٹا کے محاربات میں اب تک کوئی فیصلہ کن جنگ نہیں ہوئی تھی۔ یہ امر تو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا تھا کہ ایتھنز کے سپاہی اسپارٹا کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور اسپارٹا والے کبھی ایتھنز کے بیڑے کے مقابلہ میں نہ آئے گویا کامیابی کے ساتھ ہر ریاست اپنے عنصر میں زبردست تھی۔

جنگ کی ابتدا سے متعدد بلند حوصلہ ایتھنیوں کو صقالیہ اور اٹالیہ

میں اپنی فتوحات کے دائرہ کو وسعت دینے کی آرزو تھی کیونکہ وہاں کسی اسپارٹی جنرل کا براسی ڈس کی طرح خشکی کے راستہ سے پہونچنے کا خوف نہ تھا اور اگر صقالیہ اور جنوبی اطالیہ کے زرخیز علاقے سلطنت ایتھنز میں شامل کر لیئے جاتے تو اسی کا پلہ بھاری رہتا۔ صقالیہ کی ریاستوں کے باہمی مناقشات سے ایتھنز کو مداخلت کا موقع مل گیا۔ السیابڈیس نے مشورہ دیا کہ ایک مہم بھیجی جائے جس کا ظاہر امنشا تو یہ تھا کہ ایک یونانی ریاست کو دوسرے کے خلاف امداد پہونچائی جائے مگر اصل میں صقالیہ کی فتح سے مقصود تھا۔

نی کیاس کی مخالفت کے باوجود مہم کی روانگی طے ہو گئی۔ تین جنرلوں (نی کیاس، السیابڈیس اور لاماکس) کے زیر کمان ایک زبردست فوج بھیجی گئی اس سے بھاری فوج کبھی ایتھنز نے میدان جنگ میں نہیں اتاری تھی اور ایتھنیوں کو امید قوی تھی کہ اس مہم میں کامیابی ہوگی۔ مگر صورت حالات سے ظاہر ہے کہ کامیابی کے قرائن کم تھے گو ایک حد تک اس ناکامیابی کے اسباب اتفاقی تھے۔ صقالیہ میں یونانیوں کی کثیر آبادی تھی جن کے حوصلے بلند تھے اور ان میں جوش مردانگی اب تک باقی تھا۔ نبرد آزمائی میں ایتھنی اکثر یونانی ریاستوں سے کمتر تھے اس لئے اس بات کی بہت کم امید تھی کہ وہ صقالیہ کی آبادی پر دواماً حکومت کر سکینگے خصوصاً اپنے زاد بوم سے اس قدر دور اور سیرا کیوس ایسی زبردست ریاست کے موجود ہوتے ہوئے۔

ایتھنیوں کو ابتدا ہی سے اس مہم میں ہزیمت کا سامنا ہوا کیونکہ صقالیوں کو نہ ان سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ وہ سیرا کیوز کے خلاف ان کی حمایت کرنے کی جرات کر سکتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ دھاوا کر کے سیرا کیوز پر قبضہ کر لیتے مگر ایتھنی جنرلوں کے اختلاف آراء کی وجہ سے یہ موقع بھی نکل گیا۔ اس کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ السیابڈیس پر دیوتاؤں کی بے حرمتی کا الزام لگایا گیا اور ایتھنز میں جواب دہی کے لئے واپس بلایا گیا۔ ایتھنز جانا خلاف مصلحت جانکر اسپارٹا میں جا کر پناہ گزین ہوا اور اپنے وطن کے دشمنوں کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اہل اسپارٹا نے کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا ایک اسپارٹی

فوج دوبارہ اٹیکا میں بمقام ڈیکیسیا قلعہ گزیں کردی گئی اور کچھ سپاہی ایک اسپارٹی افسر کے زیر کمان صقالیہ بھیج دیئے گئے تاکہ ایتھنز کے مخالفین کی مدد کریں۔

اسپارٹا کی ان جوڑ بندیوں سے ایتھنی مہم کا قلع قمع ہوگیا جس کو تھوسی ڈیڈس کے زور قلم نے نہایت ہی درد انگیز فسانہ بنا دیا ہے۔ اسپارٹی جنرل گی لی پس کی آمد کے بعد ایتھنی فوج کی حالت اور بھی سقیم ہوگئی نی کیاس امداد طلب کرنے پر مجبور ہوا۔ ایتھنز سے ایک امدادی فوج مقرر ڈیماستھینیز کے زیر کمان بھیجی گئی مگر اس کا آنا بے سود تھا کیونکہ ایتھنز کا بیڑہ جس پر اس کا ناز تھا سیراکیوز کے بندرگاہ میں بند پڑے رہنے سے بیکار ہو گیا۔ ملاحوں میں مختلف امراض پھیل گئے تھے اور جہاز بیکار ہو رہے تھے کیونکہ لکڑی کے جہاز اگر پانی سے وقتاً فوقتاً نکالے نہ جائیں اور صاف نہ کئے جائیں تو ان کے پیندے گل جاتے ہیں۔ سیراکیوز کے قریب ایک عظیم الشان بحری جنگ ہوئی جس میں ایتھنز کے بیڑے کو شکست فاش ہوئی اور بھاگ نکلنے کا موقع بھی نکل گیا۔ دونوں جنرلوں نے ہتھیار ڈالدیئے مگر موت نے ان کو ذلت و خواری سے بچا لیا۔

اگر اہل اسپارٹا اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھتے تو غالباً جنگ کا خاتمہ ہوگیا ہوتا مگر بقول تھوسی ڈیڈس اہل اسپارٹا "آرام دہ دشمن" تھے یعنی سست اور بے ہمت مگر اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ قدیم سلطنتوں میں اور خصوصاً اسپارٹا کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا اور نہ جنگ کے لیے قومی قرضوں کے لینے کا اس وقت تک رواج ہوا تھا جن کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اہل ایتھنز نے بڑی جرات اور عاقبت اندیشی سے کام لیا جس کی وجہ سے جنگ کا سلسلہ نو سال تک جاری رہا۔ اس جنگ کے آخری دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ایران نے پھر یونانی سیاسیات میں دخل دینا شروع کیا مگر اس سے یہ نہ خیال کیا جائے کہ ایران کی سطوت و جبروت پھر قائم ہوگیا تھا یا اس نے کوئی فوج بھیجی بلکہ روپیہ سے مدد کرتا رہا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرکز جنگ بجائے صقالیہ وغیرہ کے بحیرۂ باسفورس و بحر اسود میں ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایتھنز کو غلہ بحر اسود کے راستہ سے ملتا تھا۔ صقالیہ کی شکست کے بعد ایتھنز کی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے یہانتک کہ جزیرۂ یوبیا بھی اس کے قبضے سے نکل گیا اور اگر اس کے جہاز بحر اسود سے غلہ نہ لا سکتے تو قحط کی وجہ سے مجبوراً اسے ہتیار ڈالدینا پڑتے۔ جنگ کی صورت تو یہ تھی مگر اس اثناء میں ایتھنز کی تحمندی کے آثار و قرائن پیدا ہو گئے تھے کیونکہ السیا بڈز اسپارٹا سے بھی بیزار ہو گیا اور باوجود اس کی غداری کے ایتھینیز اس کو خوش آمدید کہنے پر تیار تھے کیونکہ ایک تو اس کی ٹکر کا آدمی کوئی ان میں نہ تھا اور دوسرے دربار ایران میں اس کا بڑا رسوخ تھا۔ سنہ ۴۱۰ میں اس کے زیر کمان ایتھنز کو اسپارٹا کی فوج اور بیڑے پر بمقام کائزی کس ایک زبردست فتح حاصل ہوئی مگر اس جنگ کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ باوجود اس شاندار فتح کے ایتھینیوں کو اس پر اعتماد نہ ہوا۔ فوج کی کمان اس سے لے لی گئی اور اس وقت سے اس کا نام صفحۂ تاریخ سے ناپید ہو گیا۔ برخلاف اس کے اسپارٹا والوں میں ایک بڑا جنرل لائی سینڈر پیدا ہو گیا جس نے ایرانی شاہزادہ سائرس کے کے مزاج میں دخل پیدا کر کے سنہ ۴۰۵ ق م میں مقام ایگاس پوٹومی واقع مرمرہ ایتھنی فوج اور بیڑے کو شکست فاش دے کر ان سے ہتیار رکھوا لئے۔ اس شکست سے ایتھنز کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے باشندوں میں تاب مقاومت باقی نہ رہی۔ فاتحین نے ایتھنز کا محاصرہ شروع کر دیا اور ناگفتہ بہ مصائب جھیلنے کے بعد ایتھنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے شہر کی دیواریں زمین دوز کر دی گئیں جمہوریت زیر و زبر ہو گئی سلطنت کا تو پہلے ہی خاتمہ ہو گیا تھا اب ایتھنز کا مستقبل نہایت تاریک اور مایوس کن ہو گیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اب اس کا شمار یونان کے درجۂ دوم کے شہروں میں ہو گا اور اس کی حیات و ممات بھی اب اسپارٹا کی مرضی پر منحصر رہے گی۔ مگر سنہ ۴۰۳ ق م میں اس کی خوش قسمتی سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے جس سے اس ذلت و خواری کے بعد اس کی قسمت کا

ستارہ پھر چمکا گو سابقہ قوت اور عظمت اسے حاصل نہ ہو سکی مگر کم از کم آزادی جو دنیا میں سب سے قیمتی چیز ہے حاصل ہو گئی۔

ایتھنز کا احیاء

یونان کی ریاستوں کی باہمی رقابت ایک حد تک احیائے ایتھنز کا باعث ہوئی کیونکہ ان کے اتحاد کی بنیاد اس کی مخاصمت پر تھی اور جب ایتھنز کی حالت دگرگوں ہو گئی تو باہمی مناقشات پھر چھڑ گئے۔ اسپارٹا نے بھی مصلحت وقت سمجھ کر ایتھنز کو سنبھلنے میں مدد دی تاکہ کورنتھ اور تھیبس کے مقابلے کے وقت کوئی اس کا مددگار رہے۔ ایتھنز کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ سلطنت جمہوری پھر قائم ہو گئی۔ اہل اسپارٹا نے ایتھنز میں سلطنت خواص قائم کر دی تھی مگر اس جدید حکومت کے خلاف میں سخت بغاوت پیدا ہو گئی۔ دلدادگان جمہوریت کو اوائل میں فتوحات نصیب ہوئیں مگر بیرونی امداد کے بغیر ان کا اپنے مخالفین پر غلبہ پانا دشوار تھا۔ اس لئے اہل اسپارٹا نے پھر ایتھنز کے معاملات میں مداخلت کی اور دانشمندی سے خواص کی ناگوار حکومت کے بجائے جمہوریت پھر قائم کرا دی۔ مگر ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایتھنز کی دیواریں مسمار کر دی گئی تھیں۔ اس کا بیڑا تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے مقبوضات چھن گئے تھے اور بیرونی ریاستوں سے جملہ تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ تاہم اس کے اچھے دن پھر رہے تھے۔ اسپارٹا نے ایتھنز کو ایرانی امداد سے بچا رکھا تھا جس کی وجہ سے یونانی ایران کے دست نگر ہو گئے تھے مگر اسپارٹا کے بادشاہ ایجلاس کی غیور طبیعت نے اس کو گوارا نہ کیا اور اس نے اسپارٹا کی روایات کے برخلاف ایران پر حملہ کرنے کا قصد کیا ایران کی خلقی کمزوری اس سے قبل ثابت ہو چکی تھی۔ یونانیوں کی ایک جماعت تخت کے کسی ایرانی دعویدار کی امداد میں سلطنت ایران کے وسط تک پہنچ گئی تھی اور وہاں مقام بابل کے

قریب ایران کو شکست فاش دے کر اپنے سپہ سالار کے مرنے کے بعد صحیح وسالم ساحل تک پہنچ گئی اور ایرانی باوجود سخت کوشش کے ان کے ساحل تک پہنچ جانے میں مزاحم نہ ہو سکے۔ اگر ایجلاس کو اس مہم میں کامیابی نصیب ہوتی تو دونوں ملکوں کی تاریخ میں انقلاب عظیم ہو گیا ہوتا۔ مگر اس سے ایشیائے کوچک تک پہنچتے ہی یونان میں اسپارٹا کے خلاف بغاوت ہو گئی جس کا باعث کچھ تو اسپارٹا سے منافرت اور کچھ ایرانی رشوت تھی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے میں اہل اسپارٹا کو ناکامی ہوئی اور ایجلاس کو واپس بلانے پر مجبور ہوئے جب کہ وہ ایران پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا اپنے وطن مالوف کے حکم پر اس نے سر تسلیم خم کیا اور اس کے آتے ہی جنگ کا رخ بدل گیا۔ اس کے بعد بھی یونان میں چھیڑ چھاڑ جاری رہی مگر اس میں صرف ایک واقعہ قابل تحریر ہے۔ اسپارٹا کے خلاف جو عام بدولی پیدا ہو گئی تھی اس سے موقع اٹھا کر ایران نے اس پر سمندر کی راہ سے حملہ کرنے کا قصد کیا ایرانی بیڑہ کا امیر البحر کانن باشندۂ ایتھنز تھا۔ اسپارٹا کے بیڑہ کو نائڈس واقع ساحل ایشیائے کوچک میں شکست ہوئی اور فتحمند کانن ایرانی جہازوں کا بیڑہ لے کر ایتھنز کے بندرگاہ میں آکر لنگر انداز ہوا۔ گو ایرانی جنگ سلامس کا بدلہ لینے نہیں آئے تھے۔ ایتھنز کو انھوں نے اسپارٹا کے مقابلہ میں اپنا حلیف بنا لیا اور ایتھنز کی فصیلیں اب پھر بنا لی گئیں جس سے جنگ پیلوپونیس سے جو نقصانات اس کو پہنچے تھے ان کی تلافی ہو گئی ایتھنیوں کی بحری قوت پھر چمک گئی جس کے سبب سے وہ اسپارٹا سی سلطنت کا مقابلہ کر سکتے تھے جسکی قوت خشکی میں محدود تھی۔ یونانی سیاسیات میں ایتھنز کو پھر کبھی سیادت حاصل نہیں ہوئی مگر اتنا ہو گیا کہ وہ تین سر برآوردہ ریاستوں میں اسکا بھی شمار تھا اسکے مقبوضات جو اسکے قبضہ سے نکل گئے انمیں سے بعض پر اسکا پھر تسلط ہو گیا مگر باوجود اسکے کہ اسکے اہل الرائے گزشتہ غلطیوں میں پھر پڑنے سے بچتے رہے اور اپنے حلفاء سے موانست ومودت کا برتاؤ کرتے رہے مگر یونانی ریاستوں میں اتحاد پیدا ہونا دشوار تھا اور اسی سے ایتھنز کے جدید مقبوضات سے اسکا تسلط جلد اٹھ گیا۔

باب ششم

یونان کی آزادی کا خاتمہ

جنگ پے لوپونے سس کے بعد یونان کی سیاسی اور جنگی کارناموں میں دلچسپی باقی نہیں رہتی گو یونان میں اس دور کے بعد بھی بڑے بڑے اہل الرائے مقرر اور سپہ سالار پیدا ہوئے مگر ان کے کارناموں کا یورپ کے مستقبل پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ یونان کی تمام ریاستیں ایک دوسرے کے مخالف تھیں، اتحاد کے امکان کا ذرا سا شائبہ نہ تھا اور نہ کوئی سلطنت اتنی قوی تھی کہ دوسروں کو جبراً اپنا ہم خیال بنا سکے۔ اس دور کے سیاسی مناقشوں یا جنگوں سے کوئی نتیجہ نہ تھا سوا اس کے کہ مقدونیہ کی نوخیز سلطنت کی قوت کو استحکام ہوا اور یونان میں اس کا اثر بڑھتا رہے مگر اس زمانہ انحطاط میں بھی فنون لطیفہ، ادبیات سائنس اور فلسفہ کی ترقی رک نہ سکی۔ اس کا ذکر آئندہ آئیگا۔ فی الحال اس بدنصیب ملک کی تاریخ کا مختصر سا خاکہ جنگ کیرونیا (۳۳۸ ق م) تک پیش کرینگے جب کہ اس کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

ایتھنز کے زوال کے بعد اسپارٹا کا دور دورہ شروع ہوا کیونکہ کسی دوسری ریاست نے ایتھنز کی طرح اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کیا۔ یونان کی دوسری ریاستیں ایسی بے بسی کی حالت میں تھیں کہ اندیشہ تھا کہ سب اس کی نذر ہو جائینگی۔ اگر اس کے شہریوں میں سیاست اور تدبر ہوتا اور اس کے قومی خصائل میں وہ نقائص نہ ہوتے جن کا متعدد مرتبہ ذکر ہو چکا ہے تو بہت ممکن ہے یونان میں اسکے ذریعہ سے وہی اتحاد پیدا ہوتا جو زمانہ مابعد میں روما کے طفیل اطالیہ میں ہوا تھا مگر

اہل اسپارٹا اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ان کی قدامت پسندی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ فنونِ سپہگری کے سوا کسی اور فن میں مہارت پیدا کرنا ان کے لئے باعثِ عار تھا۔ غیروں کے ساتھ نہ انھیں ہمدردی تھی اور نہ محبت آزاد شہریوں کی تعداد قلیل تھی کیونکہ انھوں نے غیر ملکیوں کو شہریت کے حقوق نہیں دئے تھے۔ وجوہ مندرجۂ بالا کے سبب سے ان کی سلطنت ایتھنز سے بھی کم دیرپا ثابت ہوئی۔

گزشتہ باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایجلاس بادشاہ اسپارٹا ایران پر یورش کرنے کی غرض سے ایشیائے کوچک تک پہنچ گیا تھا اور اسے خود یونان میں اسپارٹا کے خلاف بغاوت ہو جانے کے باعث واپس ہونا پڑا تھا۔ اس بغاوت کے اسباب ظاہر ہیں۔ یونان کی تمام ریاستیں آزادی کی دلدادہ تھیں اور اسپارٹا کی جابرانہ سیادت انھیں ناگوار تھی۔ اس لئے تھیبس، آرگوس اور کورنتھ اس کے خلاف متحد ہو گئے اور ایتھنز بھی جلد اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ مگر اسپارٹا کی فوجی طاقت اب بھی بے مثل تھی اور ایجلاس کی واپسی کے قبل بھی صاف ظاہر تھا کہ متحدین اسپارٹا کے مدمقابل نہیں۔ ایجلاس اور اس کی فوج کی واپسی سے اس کی فتح میں کوئی شک نہیں رہا۔ گو اہل اسپارٹا کو اپنے دشمنوں کو جنگ میں نیچا دکھا سکتے تھے مگر بغیر کسی بیرونی امداد کے یہ ممکن نہ تھا کہ ان سے ہتیار رکھا لیتے اس لئے انھوں نے ایک عجیب و غریب حرکت کی۔ اہل اسپارٹا کو اپنے حب وطن پر ناز تھا اور اپنی ان نادر خدمات پر جو ایران کی جنگ عظیم کے دوران میں انھوں نے انجام دی تھیں اور اس وقت بھی وہ ایران ہی کے خلاف میں برسر پیکار تھے۔ مگر آخر کار وہ ایران ہی سے مدد کے طالب ہوئے۔ شاہ ایران کو رقمی اور فوجی امداد کے معاوضہ میں انھوں نے ان یونانی شہروں کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا جن کو اس جنگ عظیم میں ایران کے جوئے سے نجات ملی تھی۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ یونان کی ریاستوں پر اس جنگ کے بعد ایران من مانے شرائط عائد کرے۔ بظاہر شرائط یہ تھیں کہ تمام ریاستیں آزاد رہیں اور تمام اتحاد توڑ دئیے جائیں مگر اس کی اصل غایت یہ تھی کہ اسپارٹا کی سیادت پھر قائم ہو جائے کیونکہ جس اتحاد میں وہ خود شریک تھا وہ قائم رہا اور برخلاف اس کے دوسرے اتحاد توڑ دئے گئے۔ اس جدید انتظام کی شرائط

سے شہنشاہ ایران کے فرمان کے ذریعہ سے یونان کی تمام ریاستوں کو اطلاع دی گئی اور سب کو بلاچون وچرا سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس صلح کو "صلح بادشاہی" کہتے ہیں جس کی وجہ سے تمام یونان پھر ایران کا حلقہ بگوش ہو گیا اور سلامس اور پلاٹیا کے بعد ایران کو جو زک ہوئی تھی اس کا داغ دھل گیا۔

اسپارٹا کو اس ملت فروشی کے عوض میں اپنے حریفوں پر غلبہ ہو گیا اور مخالفت ایک دم نابود ہو گئی ریاست تھیبس اس کے حریفوں میں سر برآوردہ تھی اور اس کے قلع قمع کرنے میں اہل اسپارٹا نے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اولاً بلدہ ہائے واقع ضلع بوایشیا کی سرگردگی سے تھیبس معزول کیا گیا اور ثانیاً ایام صلح میں سخت دغابازی سے تھیبس کے قلعہ کو فتح کر کے اس میں اپنی فوج ڈالدی۔ ۳۸۲ ق م میں اسپارٹا کا طالع اقبال نصف النہار پر پہنچ گیا مگر ملت فروشی کی سزا اسے جلد ملی۔ ۳۷۹ ق م میں تھیبس میں بغاوت ہو گئی اسپارٹی فوج کے عہدہ دار مار ڈالے گئے اور شہر تھیبس دوبارہ آزاد ہو گیا۔ اس شورش کی وجہ سے پھر خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں۔ ایتھنیوں نے تھیبس کی کچھ دستگیری کی اور اسپارٹا نے کئی بار تھیبس کے علاقہ کو تباہ و برباد کر دیا مگر اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوا آخرکار ایتھنیوں نے جنگ سے تنگ آ کر صلح کی تحریک کی اور "صلح بادشاہی" کے شرائط پر جنگ کے اختتام پر اپنی آمادگی ظاہر کی مگر اہل تھیبس اب اڑ گئے کہ جب تک بوایشیا پر ہماری سیادت تسلیم نہ کی جائے ہم جنگ سے باز نہ آئینگے۔ اسپارٹا والوں نے اس موقع کو غنیمت جانا کہ ایتھنز اور دوسری ریاستوں کے علیحدہ ہو جانے سے تھیبس کا جلد قلع قمع کر دینگے۔ مگر تمام قیاسات کے برخلاف اہل تھیبس نے بے مثال استقلال دکھایا۔

یونان میں وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ ایرانی جنگ میں وہ الگ تھلگ رہے تھے اور عموماً وہاں کے لوگ بے حس اور کم عقل خیال کیے جاتے۔ مگر ان میں ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی تھی اور خوش قسمتی سے ان میں اس زمانے میں دو مدبر پلوپڈاس اور اپامی نونڈاس موجود تھے۔ باوجود ان عیوب کے اہل تھیبس جری سپاہی تھے۔ جنگ پلوپونیس میں انھوں نے

ایتھنیوں کو شکست دی تھی ایجلاس کے مقابلے میں انھوں نے بہادری کا ثبوت دیا تھا اور یونانیوں کی رسم کے خلاف جنگ میں ان کی صفیں گہری ہوئی تھیں۔ مگر باوجود ان خوبیوں کے کسی کو امید نہ تھی کہ تن تنہا وہ اسپارٹا کا مقابلہ کر سکیں گے۔ لیکن جب شاہ اسپارٹا اپنی فوج جرار لے کر بوائے شیا میں داخل ہوا تو اس نے تھیبس کی فوج کو مقابلہ پر تیار پایا۔ ان کے سپہ سالار اے پامی نونڈاس نے فوج کو ایک جدید طریقہ سے صف آرا کیا تھا جس کا یونانیوں کو تجربہ نہیں تھا۔ ان میں یہ قاعدہ تھا کہ فوج کو طویل صفوں میں صف بستہ کرتے اور ہر جانب کے سپاہی ایک ہی وقت میں لڑائی میں شریک ہوتے مگر اے پامی نونڈاس نے قلب لشکر اور میمنہ کو پیچھے رکھا اور میسرہ کو اسپارٹی فوج کے میمنہ پر ڈال دیا۔ اہل تھیبس کی فتح قطعی تھی (۳۷۱ ق م) شاہ اسپارٹا میدان جنگ میں کام آیا اور اس کے سپاہی جانبازی اور بہادری سے لڑے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسپارٹا کی فوج کو شکست قطعی نصیب ہوئی اور اسکے بعد اہل اسپارٹا پھر نہ سنبھلے کیونکہ ایتھنیوں کی طرح ان میں سنبھلنے کا مادہ نہ تھا۔ باد مخالف کے ایک ہی جھونکے سے اسپارٹا کی عظمت کا خاتمہ ہو گیا اور یونان سے اس کا اقتدار ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔

لیکن یونان کے منتشر اجزا کو جمع کرنا ایک دشوار کام تھا جس میں اسپارٹا اور ایتھنز کو ناکامی ہو چکی تھی اس لئے تھیبس کا اس میں کامیاب ہونا مشکل تھا۔ اتحاد کی دو صورتیں تھیں یا تو کوئی ریاست اس قدر طاقتور ہو جائے کہ دوسروں کو جبراً اپنی پالیسی پر چلائے یا ترغیب و تحریص سے اپنا ہمخیال بنا لے تھیبس کی تمام امیدیں صرف ایک شخص اے پامی نونڈاس پر منحصر تھیں جو سپہگری اور تدبیر مملکت دونوں میں یکتائے زمانہ تھا۔ لیکن اس کو اس مہم عظیم میں ناکامی ہوئی کیونکہ یہ کام ایک شخص کے بس کا نہ تھا خصوصاً جب کہ اس کا اقتدار ایک ہی ریاست تک محدود ہو اور صرف اسی کی فوج سے کام لے سکتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے برابر یونان میں کسی شخص کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اے پامی نونڈاس ایک عظیم فوج لے کر پیلوپونیس میں داخل ہوا اور اہل اسپارٹا جوں بھی نہ کر سکے۔

اس کا قصد صرف یہ تھا کہ اسپارٹا کا غرور توڑ دے بلکہ ان اقوام کو آزادی دلائے جو مدت سے اسپارٹا کے جور و ستم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں۔ اسپارٹا کے شمال میں آرکاڈیا تھا جس میں کسی شہر کی اب تک بنیاد نہیں پڑی تھی۔ شہر میگالوپولیس قائم کر کے اے پامی نونڈاس نے اس کو آرکاڈیا کا دارالسلطنت قرار دے دیا۔ اس کے بعد میسینیا میں داخل ہو کر اس نے وہاں کے باشندوں کو بھی آزاد کرایا جنکی آزادی عرصۂ دراز سے اسپارٹیوں نے سلب کر لی تھی اور ان کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھے۔ شہر میسینیا کا قیام بھی اسی کی کوشش سے ہوا۔ یونان کی اکثر شہری ریاستوں نے اس کی اس مہم میں مدد کی۔ مگر افسوس کہ آتش رشک و حسد پھر مشتعل ہو گئی کیونکہ ایتھنز کی طرح تھیبس کی سیادت بھی اہل یونان کو ناگوار خاطر تھی گو ایک عرصہ تک تھیبس کی فتوحات کا سلسلہ کوئی روک نہ سکا اور اس کی اولوالعزمی کے سبب سے یونان کا اثر ان اضلاع میں بھی پہنچ گیا جہاں اب تک نہ پہنچا تھا تھسالیا کی بدانتظامی کو بھی اس نے رفع کیا۔ مقدونیہ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی اس لیئے وہاں بھی اہل تھیبس نے مداخلت کی اور وہاں کے ایک شاہزادہ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس شاہزادہ کا نام فلپ (فیلقوس) تھا جو بعد تخت نشینی فلپ اعظم کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی حکومت پر جس سے یونان اور یونان کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ تھیبس کے قیام کا نمایاں اثر ہوا ہے۔ مگر تھیبس کی سیادت کا بھی جلد خاتمہ ہو گیا ۳۶۲ق م میں اہل اسپارٹا ایتھنز اور چند اور ریاستیں تھیبس کے خلاف متحد ہو گئیں اور پیلوپونیسس میں اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئیں اس لیئے اے پامی نونڈاس پھر پیلوپونیسس میں داخل ہوا اور باوجود مخالفوں کی کثرت کے اپنی عمدہ فوج کے سبب سے اس کو فتح ہوئی۔ مگر افسوس ہے کہ اس جنگ میں وہ خود بھی کام آیا اور چونکہ اس کے ہمقوموں میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا لہذا اس کی زندگی کے ساتھ تھیبس کی چندروزہ سیادت کا خاتمہ ہو گیا اور پھر اس کا شمار چھوٹی ریاستوں میں ہونے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کام کا اس نے بیڑا اٹھایا تھا اس کی قوت سے کہیں زیادہ تھا اور اس کے مدبروں میں کوئی

اب نہ تھا جو اس کی تدبیروں کو بارآور کر سکتا۔

۳۶۲ سے ۳۳۸ ق م تک یونانی ریاستوں میں سیادت کا کوئی دعویدار نہ ہوا اگر اس اثناء میں یونان کی شمالی سرحد پر ایک نئی قوت کے اقبال کا ستارہ چمکا جو سلطنت مقدونیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور جس کو رفتہ رفتہ یونان کے سیاسی معاملات میں روز افزوں دخل ہوتا گیا اور بالآخر تمام یونان اس کا دست نگر ہو گیا۔ یونانی مقدونیوں کو وحشی کہتے تھے اور مقدونیہ کے حملہ کو دارا اور زرکسیز کے حملوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یونانی خون کی آمیزش تھی اور ان کی زبان بھی بگڑی ہوئی یونانی بولی تھی۔ مقدونیہ کے خاندان شاہی کے یونانی نژاد ہونے پر اولمپیا کے کھیلوں میں بھی بھی اعتراض نہیں کیا گیا تھا جس میں صرف یونانی الاصل لوگ شریک ہو سکتے تھے۔ مقدونی غیر ترقی یافتہ یونانی تھے۔ ان کی وہی حالت تھی جو زمانہ ہومر میں یونانیوں کی عام طور پر تھی۔ مقدونی کندہ ناتراش پہاڑی کاشتکار تھے۔ ان کے شہر تعداد میں کم اور چھوٹے چھوٹے تھے اور علوم و فنون کا ان میں بہت کم رواج تھا جن کے سبب سے جنوبی یونان کو اس قدر شہرت ہوئی تھی۔ سیاسی انقلابات اور بغاوتیں مقدونیہ میں بھی ہوئی تھیں مگر سلطنت شاہی اب تک قائم تھی اور اسے پامی نونڈا اس کی موت کے بعد اس کی بنیاد اور بھی مضبوط ہو گئی جب کہ فلپ (جو گرفتار ہو کر تھیبس گیا تھا) ۳۵۹ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے حالات جو کچھ ہمیں معلوم ہوئے ہیں ان کے ماخذ اس کے مخالف یونانی مورخوں اور مقرروں کی تحریرات ہیں مگر اتنا صاف ظاہر ہے کہ فلپ قابل اور فریس ہونے کے علاوہ ایک جری اور بے مثل سپاہی تھا۔ تدبیر مملکت میں اسے خاص ملکہ تھا۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں یونانیوں سے کم نہ تھا اور میدان جنگ میں بھی پورے طور پر ان کا مد مقابل تھا۔ اس کی وفاشعار رعایا اسی کی طرح جری تھی۔ ان کے قوے زبردست اور آپس میں اتحاد تھا جس کی وجہ سے فلپ کو اپنے تمام مہمات میں کامیابی اور فتح ہوئی۔

مقدونیہ کے مقابلہ میں یونان کی حالت نہایت ردی ہو رہی تھی۔ انحطاط کا لفظ تو ہم استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ فنون لطیفہ اور فلسفہ میں اس کی ترقی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ مگر مقدونیہ کی زبردست قوت کے مقابل میں اس کی آزادی کا بقا ذرا دشوار تھا کیونکہ کسی ریاست میں یہ صلاحیت باقی نہیں تھی کہ اس کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو پھر جمع کر سکتا یا کوئی مدبر اس بگڑے زمانہ میں اس کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتا۔ اتحاد کئی مرتبہ قائم ہوئے مگر ان کی غایت صرف یہ تھی کہ کسی زبردست سلطنت کی طاقت توڑ دی جائے۔ اس کے علاوہ ہر ریاست میں مخالف پارٹیاں تھیں اور ذاتی مفاد کے لئے قوم فروشی بھی جائز خیال کی جاتی تھی۔ کسی قوم یا کسی زمانہ کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ ایک طرح تو یونانیوں کا اخلاقی معیار بلند تر ہو رہا تھا۔ غلامی کی خرابیوں کا احساس ہونے لگا تھا اور قوم ہیلاس (یونانی) کے ایک قوم واحد ہونے، اس کی آزادی قائم رکھنے اور بیرونی دشمنوں سے اس کو محفوظ رکھنے کا بھی خیال پیدا ہو گیا تھا مگر افسوس ہے کہ "محاسن سیاسی" میں انحطاط تھا۔ اسپارٹا اور چند دوسرے علاقوں کے علاوہ جہاں کے باشندے کاشتکاری کرتے تھے، فوجی ملازمت سے لوگ جی چراتے تھے اور سلطنت کی حفاظت اکثر غیر ملکی اجیر سپاہیوں کے سپرد تھی اور ان فوجوں کے افسروں کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ کہ چودھویں صدی میں اٹلی میں بعینہ یہی حالت تھی۔ ایتھنز کے باشندے تعیش میں پڑ گئے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت اور روپیہ تھیٹر میں صرف کرتے تھے۔ ڈیماس تھینیس وہاں کا محب وطن مقرر اس کا رونا رویا کرتا تھا کیونکہ اسی عیش و عشرت کی وجہ سے قوم اور حفاظت ملک کے دوسرے انتظامات پر ان کو اپنا روپیہ صرف کرنا ناگوار ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ رشوت کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ مدبران یونان کے اکثر افعال ذاتی اغراض اور جلب منفعت پر مبنی تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے افعال و خواص ایسے ہوں اس کا بقا مقدونیہ کی زبردست سلطنت کے مقابلہ میں دشوار تھا جہاں تمام اقتدارات ایک ہی فریس اور مدبر بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔

شاہ مقدونیہ نے قدم بہ قدم کبھی اپنی فوج کے زور سے اور کبھی ابلہ فریبی سے سرزمین یونان پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ سلطنت ایتھنز اگر اپنے احیاء کے بعد قائم رہتی تو مقدونیہ کے اقتدار کو روک سکتی مگر ٹھیک اسی زمانہ میں اس کی سلطنت کے حصے بکھرے ہوتے لگے۔ ایتھنز کے بیڑے کا زور باقی رہا تھا اور نہ اسکی دھاک تھی اور دو فیصلہ کن مقابلوں میں ان کو حال ہی میں شکست فاش ہوئی۔ ایتھنز نے اپنے حلیفوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گر بے سود ثابت ہوئی اور آخر کار ان کو تن تنہا مقدونیہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے دو اسباب تھے ایک تو یہ کہ اس کی تجارت اور بحری تعلقات مقدونیہ کی زد میں تھے اور دوسرے شہرۂ آفاق مقرر ڈیماسس تھیبس ایتھنز کو فلپ کے خلاف اکسا رہا تھا۔ ڈیماس تھینس نہ سپاہی تھا اور نہ مدبر، اس کی قوت کی بنیاد صرف اس کی فصاحت و بلاغت پر تھی جس میں اس کا ہمسر نہ زمانہ قدیم میں ہوا اور نہ زمانہ حال میں۔ مقررین کی جملہ خوبیاں اس میں موجود تھیں یعنی مزاج، بلند خیالی، طنز، مدلل تقریر اور سامعین کے جذبات کو مشتعل کر دینا۔ مگر تدبیر مملکت میں اسے اس درجہ دخل نہ تھا۔ ایتھنز اور یونان کی گزشتہ عظمت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ تھوسی ڈائڈ اس کی تاریخ کا اس نے بنظر غائر مطالعہ کیا تھا اور وہ عہد پیر کلس کی عظمت زندہ کرنے کا خواب اکثر دیکھتا تھا۔ اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ ایتھنز کو پھر یونان کی سیادت حاصل ہو جائے اور اس کے ذریعہ سے یونان کو آزادی ملجائے۔ ممکن ہے کہ اگر مقدونیہ کی سیادت تسلیم کر لیتا تو ایتھنز کے حق میں بہتر ہوتا اور اس میں بھی شک نہیں کہ اس نے اپنی تقریروں میں مقدونیوں کو بلا سبب بدنام کیا ہے۔ مگر زمانۂ حال کے اکثر محققین اس کے جانب دار ہیں۔ ان کے خیال میں یہی بہتر تھا کہ بجائے محکومیت کو چپکے سے تسلیم کر لینے کے ایتھنز کے لوگ اپنے کو برقرار رکھنے کی کوشش میں نیست و نابود ہو جاتے۔

ایتھنز اور فلپ کے درمیان فلپ کے تخت نشین ہوتے ہی چھیڑ چھاڑ پیدا ہو گئی۔ شہر ایمفی پولیس اس کی سرحد کے قریب تھا۔ اس شہر کے قرب وجوار

میں سونے کی کانیں تھیں۔ فلپ نے اس شہر پر حملہ کر دیا اور ایتھینوں کو یہ باور کرا کے کہ میں اس کو کچھ روز کے بعد ان کے حوالے کر دونگا ان کو مداخلت سے باز رکھا اس کے بعد اولن تھینس کے بحری اتحاد کی طرف متوجہ ہوا جس کی وجہ سے اس کے ساحلی مقبوضات معرض خطر میں تھے۔ ڈیماس تھینیس کو یقین کامل تھا کہ اگر اولن تھینس کو فلپ نے مغلوب کر لیا تو اس کے بعد ایتھنز کی باری آئیگی اس لئے اس نے ایتھینوں کو مشورہ دیا کہ اس اتحاد کی مدد کے لئے فوج بھیجیں۔ ایتھینوں نے اس کے مشورہ پر عمل کیا مگر اس میں عجلت سے کام نہیں کیا اور فوج پہنچتے پہنچتے اس اتحاد کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اس معرکے کے کچھ ہی قبل یونان میں ایک دوسری جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس جنگ کو "جنگ مقدس" کہتے ہیں مگر دراصل یہ تھبیوں اور فوکیوں کے مابین سرحدی جنگ تھی جس کے دوران میں فوکیوں نے ڈیلفی کے مندر کے مقدس خزانے پر اپنی فوجوں کی تنخواہ ادا کرنے کے لئے قبضہ کر لیا تھبیوں کی حالت اس قدر ابتر ہو گئی تھی کہ ان کو فوکیوں نے شکست دیدی اور مجبوراً ان کو فلپ سے امداد کی درخواست کرنا پڑی جس سے فلپ کو اپالو دیوتا کی بےحرمتی کا بدلہ لینے کی غرض سے وسطی یونان کے معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا جس سے اس نے خوب نفع اٹھایا۔ ۳۴۶ء میں اس نے ایتھینوں کو مصالحت پر مجبور کیا اور درہ تھرموپالی پر قبضہ کر لیا جو اس وقت تک فوکیوں کے قبضے میں تھا۔ یہ درہ وسطی یونان کی کلید تھا اور اس پر اس نے اپنا قبضہ ہمیشہ قائم رکھا۔

یونان کی زندگی کے ابھی آٹھ سال اور باقی تھے۔ مگر اس زمانہ کے حالات وقت سے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ماخذ ایتھنز کی مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کی تحریروں کے سوا کچھ نہیں۔ ڈیماس تھینیس نے فلپ کے مخالفوں کو اکسانے اور ان کے مجتمع کرنے میں اپنی فصاحت اور بلاغت کا پورا زور لگایا۔ فلپ کے خلاف جو تقریریں اس نے کی ہیں فلپکس کے مجموعی نام سے مشہور ہیں۔ اس اثنا میں ڈیلفی کے انتظام کے متعلق کچھ جھگڑا ہو گیا

جس سے فلپ کو یونان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا دوبارہ موقع ملا۔ مگر اس کا اصلی منشا اب تمام یونانی خوب سمجھ گئے تھے۔ تھیبس نے ایتھنز کا ساتھ دیا اور چند اور یونانی ریاستیں ان کی شریک ہو گئیں مگر ان کی سعی بلیغ بے سود ثابت ہوئی۔ یونانی اور مقدونی افواج ۳۳۸ میں بمقام کیرونیا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ مقدونیہ کی پیدل فوج کا تو یونانیوں نے کچھ مقابلہ کیا مگر جب مقدونیہ کے سواروں نے زیر کمان سکندر فرزند فلپ دھاوا کیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ یہ سکندر وہی ہے جو بعد میں سکندر اعظم کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور و معروف ہوا۔ اس جنگ نے یونان کی آزادی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور پھر یونانیوں کو کبھی پوری اور حقیقی آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی۔

مقدونیہ کی فتح یونان کے حق میں مفید تھی یا مضر اس کا تصفیہ کرنا آسان نہیں۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یونانیوں نے اپنی آزادی کا عاقلانہ استعمال نہیں کیا تھا۔ مقدونی نہ ظالم تھے، نہ جابر۔ ان کو یونان سے یگانگت تھی اور ان کے دور حکومت میں یونان کی زبان اور علوم کو عظیم الشان وسعت حاصل ہوئی۔ مگر ڈیماس تھینز اور اس کے ہمخیال لوگوں نے مقدونیہ کے مقابلہ میں جو سعی بلیغ کی تھی وہ بے سبب نہیں تھی۔ یونانیوں کے ذوق سلیم اور دماغ سے دنیا کچھ دن اور بھی مستفید ہو سکتی مگر ان کے فنون لطیفہ اور شاعری ایسے نازک پھول تھے جو صرف آزادی کی ہوا میں پنپ سکتے تھے۔

جنگ پیلو پونی سس کے بعد یونانی سیاسیات میں ہم ابتری دیکھتے ہیں وہ ان کی علمی ترقیوں میں حائل نہیں ہوتی۔ اس عہد میں کوئی نامی شاعر تو نہیں پیدا ہوا مگر ارسٹوفینیس ۳۸۸ ق م تک ڈرامے لکھتا رہا۔ بت تراشی میں پراگزیٹیلیس اور دوسرے صناعوں کا کام نہایت نفیس ہے مگر فیڈیاس کی ہمسری کا وہ دعوے نہیں کر سکتے۔ مندر بھی اس زمانہ میں بہت سے تعمیر ہوئے مگر کوئی پارتھینان کے منزلت نہیں پا سکتا تھا۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ یونانیوں کے قوائے عقلی رو بہ انحطاط تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے

علمی مشاغل نے دوسرا پیرایہ اختیار کیا۔ اگر صرف ڈیماس تھیبس کی تقریروں کو لے لیا جائے تو وہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یونانیوں کی جودت طبع میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ سائنس اور فلسفہ میں ترقی جاری تھی۔ سقراط نے جس پودے کی اپنے خون سے آبیاری کی تھی وہ اب بار آور ہو رہا تھا۔ زینوفن، افلاطون اور ارسطو ان تینوں فلسفیوں کو اس سے راست یا بالواسطہ تلمذ حاصل تھا۔ ارسطو اور افلاطون کو فلسفہ میں جو درجہ حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ افلاطون نے سقراط کے سیدھے سادے فلسفہ کو ایسی ترقی دی جس کا اس کے استاد کو خواب و خیال بھی نہ ہوگا کیونکہ ارسطو کو علاوہ فلسفہ کے شاعری اور الٰہیات میں بھی دخل تھا۔ اس کے تخیلات کا تمدن یورپ پر اب تک سکہ جما ہوا ہے اور خود اس کے زمانہ میں اس کے شاگردوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس کے معتقد ہو چلے تھے۔ اخلاق و الٰہیات مذہب و سیاسیات سب سے اس نے بحث کی ہے اور تمام یونانی اور رومی فلسفیوں پر اس کا اثر پڑا ہے۔ مذہب مسیحی پر بھی اس کے خیالات اور تعلیم کا اثر پڑا ہے۔ زمانہ حال کے سیاسیات اور معاشیات میں اس کی تعلیم کا اثر پدیدہی ہے اور اکثر علما اس کی تحریرات سے استدلال کرتے ہیں۔ افلاطون نے اپنے خیالات کو زیادہ تر اپنے استاد سقراط کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارسطو سقراط کی طرح شاعری جذبات اور مذہب کی طرف زیادہ مائل نہ تھا۔ اس نے اس زمانہ کے تمام علوم میں دخل پیدا کر لیا تھا یعنی اخلاق و فنون لطیفہ سیاسیات اور طبعیات سب پر کتابیں لکھی ہیں اور جملہ علوم کو اس نے ترقی دی۔ افلاطون کی طرح اس کی تحریرات میں ادبی شان نہیں ہے مگر اس کی وجہ سے سائنس میں جو اضافہ ہوا ہے وہ پائدار ہے۔ ارسطو سکندر اعظم کا استاد تھا اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ نے بھی اس کی قدر کی۔ رومیوں پر بھی اس کا بیّن اثر پڑا ہے مگر اسکی شہرت ازمنہ وسطیٰ میں معراج کمال تک پہنچی جب کہ حکماء و فلاسفۂ اسلام نے اس کی تعلیم کو پھر تازہ کیا اور اس کے فلسفہ سے دنیا کو دوبارہ روشناس کیا۔ عربوں سے اس کا فلسفہ پھر یورپ میں عروج ہوا اور یہاں تک اس نے

زور پکڑا کہ کتب مقدسہ سے کچھ ہی کم مستند خیال کیا جاتا تھا۔ الحالیہ کے شاعر دانتی نے کہا ہے کہ ارسطو "استاد العارفین" ہے۔ نشاۃ جدیدہ کے بعد اس کی قدر و منزلت میں کچھ کمی آگئی اور اس کی انتہائی عظمت جو یورپین علما کے دلوں میں جاگزیں ہو گئی تھی رو بہ تنزل ہو گئی مگر بغور پڑھنے سے اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اب کافی اندازہ ہو گیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ یورپین تہذیب کی فلسفیانہ بنیاد قائم کرنے میں بہت کم لوگوں کا حصہ ارسطو کے برابر ہے۔

باب ہفتم

سکندر اعظم اور اسکے فتوحات

جنگ کرونیا تاریخ یونان کا آخری باب نہیں ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد یونان کے خصوصیات میں عظیم تغیر واقع ہوگیا، اوّل تو شہری ریاستوں کو یونانی سیاسیات میں جو اہمیت حاصل تھی اس کا خاتمہ ہوگیا کیونکہ یونانی سلطنتیں صرف کسی ایک خاص شہر اور اس کے مضافات پر مشتمل تھیں مگر اب ان کی آزادی سلب ہوگئی (گو اب بھی ان کا وجود یونان میں باقی تھا) روما بھی ایک شہری ریاست تھی۔ اطالیہ اور جرمنی میں شہری ریاستیں از منۂ وسطےٰ میں موجود تھیں مگر دور آئندہ میں یورپ کی تاریخ بڑی بڑی سلطنتوں سے متعلق ہے۔ مقدونیہ کے بادشاہوں نے مشرق میں بڑی بھاری سلطنت قایم کی اور ان کے زوال کے بعد روما کی سلطنت مغرب میں قایم ہوئی۔ مرور زمانہ نے ان سلطنتوں کا بھی خاتمہ کر دیا اور چھوٹی ریاستوں نے انکی جگہ لیلی مگر شہری ریاستوں کے دن پھر نہیں پھرے۔

جنگ کرونیا کے بعد تمام یونان اسپارٹا کے سوا فلپ کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ مگر فلپ کی بالکل یہ خواہش نہ تھی کہ وہ یونان پر جابرانہ حکومت کرے۔ اس کو یہ آرزو تھی کہ یونانی اس کو اپنا نمائندہ خیال کریں۔ تمام یونان مقدونیہ کے زیر اقتدار تھا مگر تمام ریاستوں کو مقامی آزادی حاصل تھی۔ فلپ کی غرض یہ تھی کہ یونان کے انتظامات منضبط کر دینے کے بعد ایران پر یورش کرے مگر وہ ابھی یہ قصد ہی کر رہا تھا کہ کسی قاتل کے خنجر سے وہ اجل کا شکار ہوگیا مگر وہ

اپنا فرض منصبی ادا کر چکا تھا اور جب اس کا لائق بیٹا اس کا جانشین ہوا تو اس سے مقدونیہ کے منصوبوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ۳۳۴ق م میں سکندر ایشیا میں داخل ہوا اور اس کے فتوحات کا وہ عظیم الشان سلسلہ شروع ہوا جس نے تاریخ عالم میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ مقدونیہ سے اس نے مصر کا رخ کیا وہاں سے بحیرۂ کیسپین اور پھر پنجاب کا۔ فتح و نصرت اس کی ہم رکاب تھی اس کے دامن پر شکست کا دھبہ کبھی نہیں لگا۔ سکندر کے فتوحات کا صرف یہی سبب نہیں تھا کہ دنیا میں اس کی برابری کا کوئی جنرل پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہ ایران کی حالت رقبے اور وسعت کے باوجود نہایت ہی ابتر تھی۔ دربار شاہی میں آئے دن جھگڑے رہا کرتے تھے جن میں خون خرابے تک نوبت پہنچ جایا کرتی تھی سلطنت اور فوج کا انتظام نہایت ہی خراب تھا۔ ایرانی فوج کی وہی حالت تھی جو جنگ ایران و یونان میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ فنون حرب میں انھوں نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ لیکن اگر ایران کی حالت اس قدر ابتر اور خراب نہ بھی ہوتی پھر بھی مقدونیہ کا مقابلہ دشوار تھا۔ مقدونیہ کی فوجی طاقت ایک جدید قسم کی قوت تھی۔ اس کے علاوہ شاہی قوت کی بنیاد بھی نہایت مضبوط تھی اور اس اولوالعزمی میں رعایا بادشاہ کی امداد پر کمربستہ تھی۔ مقدونی فن حرب میں یونان کے تمام معلومات سے مستفید ہوئے تھے اور اسے ترقی بھی دی تھی۔ جس فوجی ترتیب سے اے پامنونڈاس نے اسپارٹا کو شکست دی تھی اس کو ترقی دیکر مقدونیوں نے ایک نئی شکل پیدا کر دی تھی جسے مقدونی فلانکس کہتے ہیں یہ فوج پیدل سپاہ پر مشتمل تھی جس کی صفیں گھنی ہوئی تھیں اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں لمبے لمبے بھالے ہوا کرتے تھے۔ صفیں اس قدر قریب قریب اور ان کے بھالوں کی نوکیں ایسی پاس پاس ہوتی تھیں کہ جب مقدونی دھاوا کرتے تھے تو کوئی دشمن ان کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ مگر سکندر کی فوج جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا سواروں کا ایک رسالہ تھی جس کی وہ خود کمان کرتا تھا اور اسی سے اکثر جنگوں کا فیصلہ ہوتا تھا۔ مقدونی فن حرب میں قلعہ شکن آلات کا

استعمال خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جس سے یونانی واقف نہ تھے۔ کیونکہ اہل سپارٹا نے ایتھنز کی فصیلوں کو کبھی توڑنے کی کوشش نہ کی۔ مگر کسی شہر کی فصیلیں سکندر کے منصوبوں کے پورے ہونے میں حائل نہ ہو سکیں۔ شہر ٹائر (سور) کے محاصرے میں اس نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیدیا۔ ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ یونانی فوج میں افسر نہیں ہوتے تھے۔ ایتھنز میں جو شخص ایک سال جنرل ہوتا ہو دوسرے سال ممکن ہے کہ وہ بطور معمولی سپاہی کے لڑے۔ مگر مقدونیوں میں دوسرا طریقہ رائج تھا سکندر کا خیال تھا کہ فوجی معاملات کی سربراہی کے لئے خاص تعلیم اور مدت العمر کے تجربے کی ضرورت تھی اور اس لئے مقدونی فوج کے افسروں کو خاص تعلیم دی جاتی تھی۔

ابتدائے جنگ ہی سے مقدونیوں کی برتری اور فوقیت ثابت ہونے لگی تھی۔ دریائے گرانیکس کے قریب ایرانی فوج نے کچھ مزاحمت کے لئے ہاتھ پاؤں ہلائے مگر بے سود۔ اس کے بعد اس نے ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کا قصد کیا اور یونانی شہروں کو اپنی سیادت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ صرف شہر ہالی کارناسس میں اس کی کچھ مخالفت ہوئی مگر اس کے قلعہ شکن آلات نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں ایک جدید قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اس محاصرہ سے فارغ ہو کر وہ وسط ایشیائے کوچک کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں کے باشندوں پر اپنی دھاک جماتا ہوا جنوب مشرق میں سلیسیا کے پہاڑوں کی طرف پہنچا جہاں اسے خیال تھا کہ ایرانی اپنے دروں کی حفاظت کے لئے موجود ہوں گے۔ مگر ایرانیوں نے خوف ہو کر تمام درے چھوڑ دیئے تھے اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے بحیرہ روم کے ساحل پر پہنچ گیا مگر کچھ عرصہ کے بعد دریائے اسسس کے کنارہ پر ایک عظیم الشان فوج مگر غیر منظم فوج اس کے مقابلہ کے لئے آگئی جس میں شاہ دارا خود بہ نفس نفیس موجود تھا۔ سکندر کے مقابلہ میں صرف کثرت فوج بے کار تھی۔ دارا کی فوج کو شکست فاحش ہوئی (۳۳۳ ق م) سکندر نے دارا کا پیچھا نہیں کیا بلکہ اپنی فوج ظفر موج کو لیکر شام و مصر کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا۔ شہر ٹائر (سور) ایک قدیم تجارتی شہر شام کے ساحل پر

ایک جزیرہ پر واقع ہے۔ وہاں کے باشندوں نے سکندر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس شہر کی فصیلیں اس قدر مضبوط تھیں کہ قریب تھا کہ سکندر اس کی تسخیر سے مایوس ہو کر واپس جائے مگر اس کے انجنیروں نے ایک سنگی فصیل ساحل سے شہر کی دیواروں تک بنائی جس کی وجہ سے بہت جلد سکندر کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر اس نے مصر کا رخ کیا جو اس زمانے میں ایران کے قبضے میں تھا۔ ایرانیوں کی حکومت سے اہل مصر سخت بیزار تھے۔ اس لئے سکندر کو انھوں نے اپنا مشکل کشا خیال کر کے اس کی اطاعت بخوشی قبول کر لی۔ مصر کی زرخیزی ضرب المثل ہے اور اس کے جغرافیائی موقع کے سبب سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ مصر میں اس نے شہر اسکندریہ کی بنیاد رکھی جو بعد میں یونان کے علم و فضل کا ایک بڑا مرکز ہوا۔ مصر سے فارغ ہو کر سکندر نے عراق کا رخ کیا جہاں ایک عظیم الشان ایرانی فوج اس کے مقابلے کے لئے موجود تھی۔ مگر مقام اربیلا یا اس کے قریب سنہ ۳۳۱ ق م میں ایران کو پھر شکست ہوئی اور دارا پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایران کے بڑے بڑے شہر جن کا ذکر سن کر یونانیوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا اب یکے بعد دیگرے بلا مزاحمت فتح ہو گئے۔ بابل اور سوسا کو سکندر نے ان کے حال پر چھوڑ دیا مگر پرسی پولیس (اصطخر) کا قصر شاہی اس نے مسمار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ قصد کیا کہ کسی صورت سے دارا اس کے قبضے میں آ جائے کیونکہ اس کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ ایرانی اس کو اپنے ملک کا فاتح خیال کریں بلکہ اپنے بادشاہوں کا جانشین بھی۔ اگر دارا اس کے قبضے میں آ جاتا تو ممکن تھا کہ وہ تخت و تاج سے دست کش ہو کر سکندر کو اپنا جانشین کر دیتا مگر دارا کو اس کے ایک جنرل نے مار ڈالا اور اس طرح سکندر کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

سکندر نے دارا کے قاتل کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد اس نے ایرانیوں کی تالیف قلوب میں سعی بلیغ کی کیونکہ اس کا منشا یہ تھا کہ اس کی سلطنت میں ایرانی اور مقدونی عنصر برابر رہیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو ایرانی عورتوں سے شادی کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی ایرانی لباس و عادات کا پابند ہو گیا۔

دربارِ ایران کے آداب کو بھی اس نے اپنے دربار میں رائج دیا اور مشرقی فرمانرواؤں کی طرح دیوتاؤں سے اپنا سلسلۂ نسب ملانا شروع کیا۔ روایت ہے کہ جب سکندر مصر کے کسی بتخانہ میں گیا تو وہاں کی پجاری عورت نے کہا کہ تم ہمارے دیوتا کے بیٹے ہو۔ سکندر نے اس قصے کو مشہور کرنے کی کوشش کی تاکہ لوگوں کو اس کا یقین آجائے۔ سکندر کی یہ حرکت صرف خودپسندی پر مبنی نہ تھی بلکہ اس میں فراست کا بھی شائبہ تھا کیونکہ جس بادشاہ کی سلطنت مختلف قوموں پر ہو اس کے لئے فوق الانسانی سلسلۂ نسب اس وقت ضروری تھا۔ مگر یہ پالیسی سکندر کے جانباز مقدونی افسروں کو شاق گزری تھی جن کی زندگی اب تک آزادی سے گزرتی تھی اور جو سیدھے سادے سپاہی ہونے کے باعث درباری تکلفات کے پابند نہ ہوسکتے تھے۔ اس کے علاوہ سکندر نے اپنے دربار میں جو نئے آداب رائج کئے تھے ان سے ان کی سبکی ہوتی تھی جو ان کو کسی طرح منظور نہ تھی۔

مگر اس کے فتوحات کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آئندہ فتوحات میں اس نے فن سپہ گری میں بھی اپنا جوہر اور کمال دکھا دیا کیونکہ اب تک تو اس کو ایران کی از کار رفتہ فوجوں کے مقابلے میں بہ آسانی فتح حاصل ہوتی رہی مگر آئندہ کے مہمات میں اسے وحشی اور جنگلی اقوام سے سابقہ پڑا اور وہ بھی ایسے مقامات میں جن کے حالات اسے بہت کم معلوم تھے اور ان ملکوں کے پہاڑی ہونے کے سبب سے وہاں کے باشندے بیرونی حملوں سے محفوظ بھی تھے۔ مگر سکندر نے عزم بالجزم کرلیا تھا کہ تاج ایران کے تمام مقبوضات پر تسلط کرے اس قصد سے اس نے بحیرہ کیسپین کا رخ کیا اور جن ممالک کو بلوچستان و افغانستان کہتے ہیں ان میں سے ہوتا ہوا ہمالیہ کے دروں کو طے کرکے پنجاب میں پہنچا۔ یہاں کے باشندوں کو بھی اس کے مقابلہ میں ناکامی ہوئی اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنے اقتدار میں لانے کا قصد کیا مگر اس کے سپاہیوں نے جن کے پاس ان فتوحات میں مال و متاع کثیر ہوگیا تھا آگے بڑھنے سے انکار کیا اور سکندر کو بادل ناخواستہ حکم دینا پڑا کہ وہ بابل کو واپس جائیں۔ مگر اس نے خود اسی راستہ

سے واپس جانا پسند نہ کیا اور اپنی پیادہ کا ایک حصہ اپنے ساتھ لیکر دوسرے راستہ سے سمندر کے کنارے کنارے واپس ہوا مگر صحرائے گیڈروسی میں پانی کی نایابی سے اسے دشواریاں ہوئیں جو کبھی کسی دشمن کے مقابلہ میں پیش نہ آئی تھیں۔ فوج کے ایک حصہ کو اس نے جہازوں میں بٹھاکر دریائے سندھ سے سمندر کے راستہ سے امیر البحر نیرکس کے زیر کمان بھیجا۔ یہ بیڑہ ایک مدت تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا مگر آخر کار صحیح و سالم دریائے فرات کے دہانہ پر پہنچ گیا۔ اس فوج کو مختلف مصائب کا سامنا ہوا مگر اس کے سبب سے یونانیوں کی جغرافیائی معلومات میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

سکندر کے فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا تھا۔ اب اسے دو کام باقی تھے یا تو ممالک مفتوحہ کی تنظیم میں مشغول ہو اور زمانے پر ثابت کردے کہ انتظام مملکت میں بھی اسے اتنا ہی دخل ہے جتنا سپہ گری میں یا اپنی فوجوں کی باگ مغرب کی طرف پھیر دے کیونکہ مشرق اس کے زیر تسلط ہو چکا تھا۔ اگر اس کی زندگی وفا کرتی اور ان دونوں تدبیروں میں سے کسی ایک پر بھی اُسے عمل کرنے کا موقع ملتا تو زمانہ آئندہ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی مگر ۳۲۳ء ق م میں بابل کے قریب سکندر ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہوا اور وہیں انتقال کر گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۳۲ سال کی تھی مگر اسی قلیل عرصہ میں اس نے نصف دنیا پر اپنی فتوحات کا سکہ جما دیا۔ سکندر کے فتوحات کے نتائج کا لب لباب یہ ہے کہ ان سے یونان کو بے انتہا وسعت نصیب ہوئی۔ سکندر خود یونانیوں کی لیاقت و ذہانت کا قائل تھا اور جو راستے اس کی فوجوں نے یونان کی تجارت، تمدن اور زبان کی توسیع کے لئے کھول دیئے تھے اس سے یونانی خوب بہرہ یاب ہوئے۔ دریائے دجلہ کے مشرقی ممالک میں تو یونان کا کوئی اثر باقی نہ رہا مگر ایشیائے کوچک، شام، عراق اور مصر یونانیوں کے قبضہ میں آگئے اور بہت جلد ان جدید مقبوضات میں یونانیوں کے علوم کو اتنا فروغ ہوا کہ یونان میں بھی نہیں ہوا تھا۔ سکندریہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے کیونکہ زمانہ حال پر اس کا احسان عظیم ہے۔ ایتھنز کے باہر شاید ہی کسی مقام پر علوم ادبیہ

ریاضی، طب اور ہیئت کو اتنا فروغ ہوا ہو جتنا کہ اسکندریہ میں مگر یہ علمی ترقیاں اسکندر کے بعد اس کے جانشینوں کے زمانہ میں ہوئیں اس لئے اب ہم اختصار کے ساتھ بیان کرینگے اس کی موت کے بعد اس کے مقبوضات کا کیا حشر ہوا۔

اگر سکندر کچھ روز اور زندہ رہتا تو ممکن تھا کہ وہ کوئی ایسی صورت نکال لیتا جس سے اُس کے بعد اس کی سلطنت منتشر ہونے سے بچ جاتی اور تمام اقوام ممالک اور سلطنتیں ایک ہی مضبوط زنجیر میں جکڑی رہتیں۔ مگر اس کی قبل از وقت موت کے باعث اس کی سلطنت کے شیرازہ کا بکھر جانا لازمی تھا۔ کیونکہ اس کا کوئی لائق جانشین نہ تھا اس کے بچے شیر خوار تھے اور نہ اس کی قوم میں کوئی قانون وراثت تھا جس سے اس کے جانشین کا تعین بہ آسانی ہو سکتا۔ اس کے سپہ سالاروں نے اپنے اپنے زیر اثر ممالک پر خود مختار حکومتیں قائم کرلیں مگر اس سے آپس میں شدید خانہ جنگی ہو گئی ہمیں اتنا وقت نہیں کہ ان خانہ جنگیوں کو تفصیل کے ساتھ اس موقع پر لکھ سکیں بلکہ ان کے عام نتائج کا تذکرہ کرنا کافی خیال کرتے ہیں اور جب روما کی مشرقی فتوحات کا تذکرہ لکھینگے تو اس کے ضمن میں ان سلطنتوں کا بھی کچھ ذکر آ جائیگا۔

سکندر کی سلطنت کے کھنڈروں پر تین طاقتور اور استوار سلطنتیں قائم ہوئیں یعنی مصر، شام اور مقدونیہ۔ بطلیموس نے مصر پر قبضہ کرلیا اور اس کی اولاد وہاں آغاز سنہ مسیحی تک حکمراں رہی مصر کی زرخیزی اور اس کی تجارتی ترقی کے سبب سے بطلیموس کی سلطنت نہایت طاقتور اور پر عظمت تھی۔ مصر میں یونانیوں کی حکومت سے ایک جدید دور شروع ہوا۔ دیسی باشندوں کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آیا اور مصری مذہب و رسوم قائم رکھے گئے مگر حکمراں خاندان خالص یونانی تھا اور یونانی علوم و فنون لطیفہ کی اہمیت کا انھیں خاص احساس تھا۔ اسکندریہ نہ صرف ایک عظیم الشان تجارت گاہ ہو گیا بلکہ علوم یونان کا بھی مرکز بن گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اسکندریہ کے علما

کی توجہ تالیفات پر زیادہ تھی مگر شاعری کو بھی یہاں فروغ ہوا۔ شعرائے اسکندریہ میں تھیوکریٹس جو تیسری صدی قبل مسیح میں گزرا ہے مشہور ہے۔ فلسفہ اور سائنس کی طرف اسکندریوں کا زیادہ رجحان تھا۔ اور ان علوم میں انھوں نے ایسی ترقی کی جس کا احسان اب تک دنیا پر ہے۔ اقلیدس انہیں علما میں سے ہے۔ فلسفۂ یونان بھی رائج تھا اور علمائے اسکندریہ کا الٰہیات مسیحی کی ترقی پر خاص اثر پڑا ہے۔ فلو یہودی بھی اسکندریہ کا باشندہ تھا جس کے خیالات عقائد مسیحی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ دو صدیوں کے بعد اوری جین اسکندری (۱۸۴ء۔۲۳۳ء) کا نام قابل ذکر ہے جس نے الٰہیات مسیحی میں افلاطون کے فلسفہ کو جگہ دی۔ اسکندریہ میں کئی نامی اطبا بھی گزرے ہیں جنھوں نے یونانی فن تشریح اور علم الحیات کو خاص ترقی دی۔ جالینوس (۱۳۱ء۔۲۰۰ء) کا علم طب پر احسان عظیم ہے اور اسی کی تصنیفات کے مطالعہ سے یورپ کے فن طب کی بنیاد پڑی ہے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے تھے اس کے ایک عرصہ بعد یہ ترقیاں ہوئیں مگر ان کا اس موقع پر ذکر کرنے سے منشا صرف یہ ہے کہ یونانی دنیا کی علمی تاریخ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی اور اس زمانہ میں بھی تمام علمی ترقیات کا ماخذ یونان ہی تھا۔

جس زمانہ میں بطلیموس نے اپنی سلطنت کی بنیاد مصر میں ڈالی اسی زمانہ میں سیلوکس نے اپنی سلطنت فرات کے سواحل پر قائم کی مگر مشرقی مقبوضات اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور ان کی سلطنت صرف شام تک محدود رہی۔ علوم و فنون کی ترقی میں اس حکومت کو زیادہ ذوق و شوق نہ تھا جیسا بطلیموس کو تھا مگر یونانیوں کے شہر شام میں بھی قائم ہوئے اور یونان کے فنون لطیفہ کو کچھ فروغ ہوا اور شام ہی سے یونانی علوم و فنون کا اثر یہودیوں کی سرزمین میں حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک پہنچتا رہا۔ حکمرانان شام اپنے آپ کو شہنشاہ کہتے تھے۔ ان کے غرور کی کوئی انتہا نہ تھی اور دوسری اقوام کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر جب روما سے ان کا مقابلہ ہوا تو

ان کے کرّ و فر کا خاتمہ ہو گیا۔

سکندر کے جانشینوں کی حکومت مقدونیہ میں زیادہ مضبوط تھی۔ ایک عرصہ تک طوائف الملوکی رہی مگر اس کے بعد سلطنت مقدونیہ اینٹی گونس کی اولاد کے قبضہ میں آگئی جو سکندر کے سپہ سالاروں میں سے تھا اور ان کا قبضہ دوسری صدی ق م تک قائم رہا جب کہ تمام ملک پر رومی مسلط ہو گئے۔ مگر ان حکمرانوں کی حکومت کا رقبہ وہ نہ تھا جو شاہ فلپ کے زمانہ میں تھا۔ یونان ان کی حکومت سے بیزار تھا اور یونان کے چند قلعوں میں ان کی فوجیں جنھیں یونان کی بیڑیاں کہتے تھے رہتی تھیں۔ مگر یونان کے شہروں یا اقوام پر ان کا کوئی اقتدار نہ تھا۔ مقدونیہ کے مشرق میں صوبہ تھریس میں سخت بدامنی پہلی صدی مسیحی تک رہی جب کہ یہ صوبہ بھی رومیوں کے قبضہ میں آگیا۔ مغرب میں ایپائرس میں بھی ایک جدا سلطنت قائم ہو گئی اور یہاں کا بادشاہ پرہس ایک عرصہ تک رومیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

ایشیائے کوچک سکندر کے جانشینوں میں سے کسی کے قبضہ میں نہ آسکا گو وہ اس پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے آپس میں لڑتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے باشندے اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکے اور مختلف اقسام کی ریاستیں یہاں قائم تھیں کہیں بادشاہ حکمراں تھے جیسے پانٹس اور پرگام روڈز کی طرح بعض آزاد شہر تھے کہیں جمہوریت تھی کہیں حکومت جابرہ تھی کہیں مختلف شہروں کا اتحاد۔ وسط میں صوبہ گیلیشیا تھا جس میں گال آباد تھے۔ یہ وہی قوم ہے جو فرانس، آئرلینڈ اور ویلز میں آباد تھی اور بلقان اور یونان سے گزرتی ہوئی یہاں آکر مستقل طور سے آباد ہو گئی تھی۔ یہ مختلف اقوام کی نقل و حرکت کے ایک بڑے سلسلے کا آغاز ہے جس کی اہمیت چوتھی اور پانچویں صدیوں میں جاکر معلوم ہوگی جب کہ یہ تحریک سلطنت روما کے زوال کا باعث ہوئی۔

باب ہشتم

روما کا عروج اور اسکی ابتدائی دستوری جدوجہد

اگر سکندر اعظم اپنی افواج کی باگ بحیرۂ روم کے مغربی سواحل کی طرف موڑتا تو کئی طاقتور سلطنتوں سے اس کو سابقہ پڑتا۔ افریقہ کے شمال میں قرطاجنہ واقع تھا جہاں کے جنگجو اور پرجوش باشندوں کو رام کرنے میں اسے اپنی پوری طاقت صرف کردینی پڑتی۔ روما کو اطالیہ میں عروج حاصل ہو رہا تھا اگر اس وقت رومی سامینوں سے دست بگریباں تھے۔ اگر سکندر اپنی طاقت کا پلہ سامینوں کی طرف ڈال دیتا تو روما گیا۔ دنیا کی تاریخ اس کے بعد کچھ اور رہی ہوتی۔ لیکن ممکنات پر بحث کرنا عبث ہے اس لئے ہم روما کی ابتدائی تاریخ کی طرف متوجہ ہونگے۔ رومیوں اور یونانیوں کے طبائع اور کارناموں میں اختلاف ہے۔ یونان مبدء علوم و فنون ہے۔ روما سے یورپ نے قانون اور اصول حکومت ورثہ میں پایا ہے۔ یونانی تغیر پسند تھے برخلاف ان کے رومی قدامت پرست تھے یونانیوں کا رجحان فنون لطیفہ اور فلسفی تخیلات کی طرف تھا، رومیوں کا دماغ عملی تھا اور ان کو فنون حرب اور انتظام مملکت میں ید طولے حاصل تھا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ رومیوں اور یونانیوں میں یگانگی بھی تھی، ان کی زبانیں مشابہ تھیں اور باوجود تمام اختلافات کے ان کے مذہب اور رسوم میں بعید مشابہت تھی اور گو ان دونوں ممالک کے سیاسی کارناموں میں کوئی مناسبت نہیں کیونکہ روما کی عظیم الشان اور دیرپا

سلطنت کے مقابلہ میں یونان کسی شمار قطار میں نہیں مگر روما بھی ابتدائً ایتھنز اور کورنتھ کی طرح ایک شہری ریاست تھا۔

روما کی ابتدائی تاریخ بھی تاریکی میں چھپی ہوئی ہے کیونکہ تاریخ نویسی کی طرف رومیوں نے اسی وقت رخ کیا جب کہ ان میں قومیت کی روح پیدا ہوگئی تھی اور رومی شاعروں اور مورخوں نے زمانہ قدیم کے قصوں اور افسانوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ مگر ان افسانوں میں تصرف بہت کچھ ہوا ہے۔ رومی مورخوں نے اپنی ابتدائے رسم و رواج کے متعلق فرضی قصے گڑھ لئے ہیں۔ ان افسانوں کی دلچسپی میں کوئی شک نہیں مگر تاریخی لحاظ سے ان کی کوئی وقعت نہیں۔ البتہ یہ ان سے ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ رومیوں کے تخیلات کیا تھے۔ ان افسانوں میں کس قدر صحت ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے مگر اس وقت ہم صرف وہ واقعات بیان کرینگے جن کی اصلیت ایک حد تک ثابت ہوچکی ہے۔

یونان کی طرح اطالیہ بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں پہاڑوں اور سمندر کا اثر اس ملک کے باشندوں کی طبیعتوں اور قسمتوں پر پڑا ہے۔ مگر اطالیہ ان پہاڑوں کے سبب سے مختلف اضلاع میں منقسم نہیں ہوگیا ہے جن میں آمد و رفت دشوار ہو اور نہ یونان کی طرح سمندر کے ہر جگہ خشکی میں در آنے کی وجہ سے اس کے ساحل میں خم پیدا ہوگیا ہے کھاڑیوں اور بندرگاہوں کی تعداد یونان میں اسی وجہ سے زیادہ ہے۔ اطالیہ کا سب سے بڑا سلسلہ کوہی جسے اپی نائن کہتے ہیں شمالی میدان میں مغرب سے مشرق کی طرف چلا گیا ہے مگر مشرق میں ساحل کے متوازی ہوگیا ہے اس لئے پو کے سوا تمام دوسری ندیاں جو ساحل مشرقی پر ہیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور بڑی ندیاں سب مغربی ساحل پر ہیں۔ جہازرانی کے ابتدائی زمانہ میں اطالیہ سسلی اور سارڈینیا کے جزائر سے بلکہ سواحل شمال افریقہ سے بھی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا مگر یونان اور ممالک مشرقی تک پہنچ جانا ذرا دشوار تھا۔ اطالیہ کے مغربی ساحل کے وسط میں دریائے ٹائبر سمندر میں آملتی ہے

اور اکثر اوقات اس میں کافی پانی ہوتا ہے جس کے سبب سے اس زمانہ کے چھوٹے چھوٹے جہاز بہ آسانی اس میں گزر سکتے ہونگے۔ دریائے ٹائبر کے دہانہ سے پندرہ میل کے فاصلہ پر اس کے بائیں یعنی مشرقی ساحل پر سات چھوٹے چھوٹے پہاڑ واقع ہیں۔ وہاں کوہ پلاٹین پر ایک قلعہ واقع تھا جو بعد میں شہر روما کے نام سے مشہور ہوا۔ روما ابتدائی زمانے ہی سے ایک اہم تجارتی مرکز تھا دریائے ٹائبر کے مشرقی کنارے پر اقوام لاطینی متوطن تھیں اور مغربی پر اٹرسکن۔ ان دونوں اقوام کی تجارتی اشیاء وندی سے روما میں آتیں اور وہاں سے اطالیہ کے دوسرے بندرگاہوں اور ممکن ہے کہ دیگر اقطاع عالم کو بھیجی جاتیں۔ غالباً زمانہ قدیم میں ان سات پہاڑوں پر دو مختلف اقوام آباد تھیں مگر تاریخی زمانہ سے قبل ہی دونوں خلط ملط ہو چکی تھیں اور ان کی آبادی کے گرد ایک فصیل بھی بن چکی تھی جس کی تعمیر رومی بادشاہ سرویس ٹلیس کی طرف منسوب کیجاتی ہے۔ روما کے تاریخی افسانوں میں سات بادشاہوں کا ذکر ہے جس سے کم از کم روما میں بادشاہوں کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر یہ بادشاہ اسی قسم کے تھے جن کا ذکر ہومر کی نظموں میں آیا ہے۔ شاہان روما جنگ میں اپنی فوج کی کمان کرتے اور زمانہ صلح میں نزاعات کا فیصلہ کرتے مگر ان کے اختیارات محدود تھے ان کے دوش بدوش دو مجلسیں تھیں پہلی مجلس کا نام سینیٹ تھا یعنی مجلس عظام اور دوسری شہریوں کی مجلس جو ایتھنز کی مجلس عوام یا ایکلیسیا کے مماثل تھی۔ ان مجالس کے باہمی تعلقات کے لئے کوئی قانون نہ تھا بلکہ ان کا دارومدار رسم و رواج اور روایات پر تھا۔ مگر آخر میں یونان کی طرح روما میں بھی سلطنت شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ ٹارکوین متکبر آخری بادشاہ کا نام بیان کیا جاتا ہے اور روایت ہے کہ اس کا اخراج ۵۰۹ ق م میں ہوا۔

اس بادشاہ کے اخراج کے بعد روما میں جمہوریت قائم ہو گئی اور دستور اساسی میں دو مجسٹریٹوں نے جنھیں کانسل کہتے تھے شاہی فرائض اپنے ذمے لے لئے ان حکام کا انتخاب صرف ایک سال کیلئے ہوتا تھا اور ان سے فوج کی سپہ سالاری اور شہر کی اعلیٰ مجسٹریٹی کا کام لیا جاتا تھا اس سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کے فرائض ان سے



اطالی نسلیں
زبی کون
کارسیکا
سارڈینیا
روما
سسلی
سائراکوس
لاطینی
امبرو سبیلیز (اسکان)
ایرس کان۔
لیگورین وغیرہ
گال
یونانی
الیرین (پلاسجین۔ ایاپی گی دنیاٹی)
فونی شین

اطالی نسلیں

منسوب ہو گئے تھے لیکن بادشاہ کے اقتدارات ان کو حاصل نہ تھے۔ اول تو دونوں کانسل خود ایک دوسرے کی طاقت کو دیکھ نہ سکتے تھے دوسرے ان کی حکومت کا زمانہ صرف ایک سال تھا اور اس میں بھی ان پر یہ بات فرض کر دی گئی تھی کہ وہ سینیٹ کا بعد اعزاز واحترام کریں۔ درحقیقت سینیٹ ہی روما کی سب سے طاقتور جماعت تھی جس میں شہر کے اکابر شریک رہتے تھے اور ان کی رکنیت دائمی اور تا دم مرگ ہوتی۔ اصلی فرائض کے لحاظ سے تو وہ محض کانسلوں کے مشیر تھے مگر رفتہ رفتہ تمام اقتدارات انھوں نے سلب کر لیے کیونکہ اس مجلس کے ارکین تجربہ کار ہوتے اور اپنے عہدوں کے دوامی ہونے کے سبب سے کانسلوں پر قدرتاً انھیں فوقیت حاصل تھی جن کا تقرر صرف ایک سال کیلئے ہوتا۔ علاوہ کانسلوں اور سینیٹ کے جمہوریت روما میں ایک تیسرا عنصر بھی تھا شہریان روما بھی اپنی مجالس میں جمع ہوتے جو کمیٹیا کے نام سے موسوم تھیں۔ ان مجالس شہریان میں سب سے بڑی کمیٹیا سنچوریاٹا تھی جس میں شہری اپنے فوجی عہدوں کے لحاظ سے جمع ہوتے مگر اس میں شمار آرا اس طریقہ سے رکھا گیا تھا کہ دولت کا اثر تعداد پر غالب تھا۔ کمیٹیا کے اقتدارات وسیع مگر مبہم تھے۔ کانسلوں کے انتخاب کا حق ان مجالس کو حاصل تھا۔ کانسلوں کے فیصلوں کا مرافعہ انھیں مجالس میں ہوتا تھا اور وضع قوانین کا اختیار بھی انھیں کو تھا۔ مگر ان ہر سہ عناصر کی باہمی رقابت کے قصوں سے تاریخ روما لبریز ہے۔ جمہوریت کے بیشتر زمانہ میں سینیٹ کو غلبہ حاصل رہا مگر مرور زمانہ کے بعد یہ اقتدارات مجالس عوام کو حاصل ہو گئے مگر عوام کا اقتدار دیرپا ثابت نہ ہوا اور عہدہ داران جمہوریت نے عوام کے اقتدارات کو سلب کر لیا۔ مگر یہ واقعات پانچ سو سال میں جا کر ہوئے۔

دور شاہی کے اختتام کے بعد کسی کو یہ خیال نہ ہوگا کہ اطالیہ کا مستقبل روما کی قسمت کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ روما کو اس جزیرہ نما کی دوسری سلطنتوں پر تمدن یا قوت میں فوقیت حاصل نہ تھی۔ اگر کسی قوم کو دعوے ہو سکتا تو وہ اٹرسکن تھے جن کی آبادی روما کے شمال و جنوب میں پھیلی

ہوئی تھی۔ یہ عجیب وغریب قوم جس کی تاریخ پر اب تک روشنی نہیں پڑ سکی اور نہ اس کی زبان معلوم ہوسکی، تعداد اور ثروت میں رومیوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ تمدن میں بھی انھوں نے رومیوں سے زیادہ ترقی کی تھی بعد میں جاکر رومیوں نے اسی قوم کے عقائد مذہبی اور فن تعمیر کو اختیار کیا۔ جزیرہ نمائے اطالیہ کے جنوب میں متعدد یونانی ریاستیں تھیں جن کا ذکر آچکا ہے۔ کیومے اور ٹارنیٹم میں یونانی شہروں کے معمولی خط وخال موجود تھے اور سسلی میں سیراکیوز کی عظیم الشان شہری سلطنت تھی جو ایک زمانہ میں سسلی اور جنوبی اطالیہ پر قریب قریب حاوی ہوگئی تھی۔ ان متمدن اقوام کے باقیات الصالحات کے علاوہ لامبارڈی کے شمالی میدانوں میں جنگجو اور پرجوش قوم گال آباد تھی جو نسلاً باشندگان گال (فرانس) سے رشتہ اخوت رکھتی تھی۔ اطالیہ کے جنوب و وسط میں مختلف اقوام آباد تھیں جو نسلاً روما سے ہمجنس تھیں مگر اس کے برابر متمدن نہ تھیں۔ ان میں سے سامینیوں کا نام اب تک اس لیے قایم ہے کہ یہ روما سے عرصہ تک برسر پرخاش تھے۔

روما کے کارنامے صرف بیرونی فتوحات پر مشتمل نہیں ہیں۔ اندرونی مشکلات کو اس نے جس خوبی سے حل کیا ہے وہ خود ایک معرکہ ہے اور اس کی بیرونی فتوحات کی بنیاد ہے۔ خانہ جنگیوں نے اس قدر طول کھینچا تھا کہ قریب تھا کہ سلطنت کے دو ٹکڑے ہوجائیں اور اگر ایسا ہوتا تو پھر روما کا شمار اطالیہ کی زبردست سلطنتوں میں نہ ہوتا۔ اس خانہ جنگی کا سبب یہ تھا کہ روما میں دو گروہ تھے ایک کو شہریت کے حقوق حاصل تھے اور دوسرا گروہ اس سے محروم تھا۔ پہلے گروہ میں شرفا پیٹریشین یعنی روما کے قدیم باشندے اور دوسرے میں رذیل (پلی بین) تھے جو مختلف مقامات سے آکر آباد ہوگئے تھے۔ شرفا اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر کسی صورت سے آمادہ نہ تھے اور رذیل اپنی بے بسی سے نالاں تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دونوں میں سخت مخالفت پیدا ہوگئی۔ گو رذیل بھی کمیٹیا کے جلسوں میں شرکت کے مجاز تھے مگر جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں شمار آرا میں عزو مال کا خیال

کیا جاتا تھا نہ کہ تعداد کا۔ اس کے علاوہ رذیل کا نسلی یا سلطنت کے کسی دوسرے عہدہ پر پہنچ نہ سکتے تھے ۔ گران کے ساتھ سختی یا جبر کا برتاؤ نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ اسپارٹا کے غلاموں کی طرح نہ تھے اور ایتھنز کے غیر ملکی باشندوں سے بھی انکی حالت بہتر تھی ۔ مگر تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلابات ہمیشہ ایسی جماعتوں کی وجہ سے ہوئے جنھیں کچھ حقوق حاصل تھے اور مزید حقوق کے طلبگار تھے نہ کہ ایسی جماعتوں سے جو بالکل بے بس اور درماندہ ہوں ۔ رذیل روما سیاسی حقوق سے محروم تو تھے ہی مگر اس کے علاوہ تمدنی مشکلات سے وہ اور بھی پریشان تھے خصوصاً قانون ادائے قرضہ ان کے لئے سخت وبال جان تھا ۔ اگر ان میں سے کوئی بدنصیب قرض نہ ادا کر سکتا تو اپنے ساہوکار کا غلام ہو جاتا تھا ۔ آگے چل کر یہی تمدنی مشکلیں ان کی کھلم کھلا مخالفت کا سبب بن گئیں ۔ ۴۹۴ ق م میں رذیلوں نے اپنی شکایات کے رفع کئے جانے کا مطالبہ کیا اور جب اس سے انکار کیا گیا تو انھوں نے روما سے ہجرت کرنے کا قصد کر لیا اور روما سے قریب ایک پہاڑ پر جو کوہ مقدس کے نام سے مشہور تھا جا کر قیام کیا ۔ اسی پہاڑ پر سے انھوں نے اعلان کیا کہ اگر ان کے مطالبات قبول نہ کئے گئے تو وہ اپنی علیحدہ سلطنت قائم کر لینگے ۔ مگر سلطنت روما کا بقا بغیر رذیلوں کے دشوار تھا اس لئے شرفا کو انکے مطالبات قبول کرنے پڑے لیکن جس طریقہ پر یہ مصالحت عمل میں آئی وہ عجیب وغریب ہے ۔ رذیلوں کو تو شرفا کے حقوق نہیں دے گئے گران کو اختیار دیا گیا کہ اپنے مجسٹریٹ اور دیگر انتظامات الگ کریں ۔ یہ مجسٹریٹ ٹربیون کہے جاتے تھے جن کی تعداد بالآخر دس تک پہنچ گئی ۔ ان کے حالات اور اختیارات روما کی تاریخ میں ایک عجیب وغریب چیز ہیں ۔ ان کو اختیار تھا کہ سلطنت کے معمولی مجسٹریٹوں کے احکام منسوخ کر دیں یا ان میں ترمیم کریں اور ریت العوام میں ان کے فیصلوں کے خلاف میں مرافعہ پیش کرائیں یا کمیٹیا میں کسی معاملہ کو پیش ہونے سے روک دیں ۔ اس کے علاوہ انھیں خود بھی کچھ اختیارات حاصل تھے ۔ بعض مقدمات کی وہ خود سماعت کر سکتے تھے اور ان کا اہم ترین

اقتدار یہ تھا کہ وہ کمیٹیا کے جلسے منعقد کرانے کے مجاز تھے اور ان جلسوں میں شمار آرا، دولت و مال کی بنا پر نہیں ہوتا تھا بلکہ تعداد پر۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ان جلسوں کے فیصلوں کے پابند صرف رذیل ہوتے تھے۔ رذیلوں نے جو نظام سلطنت قائم کر دیا تھا اس کے لحاظ سے گویا روما کے قلب میں ایک دوسری سلطنت پیدا ہو گئی تھی یعنی طبقہ ادنیٰ کی مجالس کو سلطنت روما سے وہی تعلق ہو گیا تھا جو زمانۂ حال میں مجالس اہل حرفہ کو مالکان کارخانجات سے ہوتا ہے۔ اگر یہ حقوق ایک دوسرے کی تخریب کے لئے استعمال کئے جاتے تو لازمی تھا کہ سلطنت کے تمام کاروبار بند ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوا اور باوجود اس دوعملی کے نظام سلطنت کا جمہوریت کے خاتمہ تک قائم رہنا، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ دونوں گروہوں میں رقابت بھی تھی رومیوں کے زبردست حب قوم کی دلیل ہے۔

لیکن سنہ ۴۹۴ ق م میں جن شرائط پر مصالحت ہوئی تھی وہ دیرپا ثابت نہ ہوئیں کہ دونوں گروہوں کا ایک دوسرے میں جذب ہو جانا ناگزیر ہو گیا۔ روما کے ارتقاء سیاسی کے صرف چند واقعات کا ہم ذکر مختصر طور پر کرینگے لیکن اس کے ساتھ یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ انقلابات جس زمانہ میں عمل میں آئے سلطنت روما اطالیہ میں اپنے مقبوضات کو وسعت دے رہی تھی اور اگر بیرونی جنگوں کا دباؤ نہ ہوتا تو اغلب ہے کہ شرفاء رذلا کے مطالبات آسانی سے قبول نہ کرتے۔ رقیبوں نے سنہ ۴۴۹ ق م میں پھر ایک قدم آزادی کی طرف بڑھایا اور مطالبہ کیا کہ قوانین روما بعد تدوین شائع کئے جائیں کیونکہ تصفیہ مقدمات کا دارومدار رسم و رواج پر تھا جس کے جاننے اور سمجھنے والے صرف عہدہ داران عدالت تھے جو سب شرفاء میں سے ہوتے تھے اس لئے روما کے رذیلوں کو یہ خیال ہوا کہ ان عہدہ داروں کے ظلم و جبر سے بچنے کی یہی تدبیر ہے کہ تمام قوانین ضبط تحریر میں آجائیں۔ اس مطالبہ پر ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے قوانین موجودہ کے متعلق تحقیقات عمل میں لا کے انکو دس الواح دوازدہ پر لکھوایا اور عوام میں شائع کیا۔ یہ قوانین روما

کی تدوین کی پہلی کوشش تھی جن کو تمام یورپ میں مقبولیت حاصل ہوئی مگر قوانین
مذکورہ کے شائع ہوتے ہی رذیلوں نے مزید مطالبات پیش کیے اور پھر ہجرت
کی دھمکی دی۔ ۴۴۹ ق م میں ان کو اپنے منصوبوں میں پوری کامیابی ہوئی اور
قوانین "ویلیرین" کی رو سے یہ طے ہوا کہ مجالس عوام کے فیصلے کی پابندی
تمام قوم رومی پر لازمی ہوگی۔ ان قوانین کے نفاذ سے نظام سلطنت میں دو
متضاد مجالس کے قیام سے جو رد عمل پیدا ہوگئی تھی اس کا خاتمہ ہوگیا اور
سلطنت کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ گویا اب دو مجالس ہوگئیں ایک کیمٹیا اور
دوسری مجلس قبائل۔ اول الذکر میں اہل مال و زر کو غلبہ حاصل تھا اور دوسری
میں جمہور کو۔ ان دونوں کے فرائض مختلف تھے مگر ان کے فیصلوں اور
احکام کی پابندی سب پر لازمی تھی۔ سیاسی حقوق کے مل جانے کے بعد
رذیلوں کو صرف ایک شکایت اور باقی رہ گئی یعنی یہ کہ سلطنت کے عہدوں
تک وہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس شکایت کے بالکلیہ رفع ہو جانے کے لیے
سو سال انھیں انتظار کرنا پڑا اگرچہ ۴۴۵ ق م میں ان کا مقصد ایک حد تک
حاصل ہوگیا۔ رومیوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے دستور میں کوئی لفظی تغیر
کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور حقوق دیتے جاتے تھے۔ اس طرح سے یہ
طے پایا کہ آئندہ سے ہر سال یا تو کانسل منتخب کیے جائینگے جو شرفا میں سے
ہونگے یا "فوجی ٹریبیون باختیارات کانسلان" جو شرفا یا رذیل ہر دو گروہ
میں سے منتخب ہو سکتے ہیں۔ اس اصلاح کے بعد غریب تر رذیلوں کو صرف یہ شکایت
رہ گئی کہ اطالیہ کے اضلاع مفتوحہ میں زمینوں کا بڑا حصہ یا تو شرفا نے غصب کر لیا
تھا یا خوشحال رذیلوں نے اور ان کے حقوق کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا۔ زمینات
مفتوحہ کے متعلق غالباً آپس میں سخت بدمزگی پیدا ہوگئی تھی مگر ۳۶۷ ق م
میں قوانین لی کی نی پاس ہوئے جو دس سال بعد جاری ہوئے۔ قوانین مذکور
کے دو جزو تھے ایک تمدنی اور دوسرا سیاسی جن کی رو سے ہر شہری کی
زمینات مقبوضہ کا رقبہ محدود کر دیا گیا اور ہر زمیندار پر لازمی کر دیا گیا کہ مزارعین
میں ایک مقررہ تعداد آزاد مزدوروں کی رکھے قوانین مذکور سے اس زمانہ کی

تمدنی مشکلات کا پتہ چلتا ہے جن کا ذکر متعاقب آئیگا۔ قوانین مذکور کا اساسی جزو یہ تھا کہ کانسلی دوبارہ قایم کی گئی مگر اس شرط پر کہ دونوں کانسلوں میں ایک لازماً رذیلوں میں سے ہو اور دونوں بھی ہو سکتے تھے

ان قوانین کے نفاذ سے شرفا اور رذیلوں کے آئے دن کے قضیے گویا تمام ہو گئے گو شرفا کی کچھ خفیف سی فوقیت باقی رہی جس کے برقرار رکھنے پر وہ سختی کے ساتھ مصر تھے شہریان روما میں مساوات کلی قائم ہو گئی مگر جس جد و جہد کے بعد یہ مساوات حاصل ہوئی تاریخ دنیا میں یگانہ ہے۔ رومیوں کو یہ دعوے ہی تھا کہ یہ مقصد انھیں بغیر کشت و خون کے حاصل ہوا گو یہ دعوے مبالغہ آمیز ہے مگر اس میں شک نہیں کہ تاریخ دنیا میں ایسی نظیر نہ ملیگی جہاں مساوات امن و امان کا قیام آئینی طریقہ سے عمل میں آیا ہو اور بلا شبہہ اس قضیہ کے بخیر و خوبی طے ہو جانے سے اجزاء سلطنت میں ایک زبردست اخوت پیدا ہو گئی ورنہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوتے۔ اور اس سیاسی جد و جہد کا امن و امان کے ساتھ ختم ہو جانا زمانہ ما بعد میں روما کی فتوحات کا باعث ہوا۔

اب صرف ایک اور بات کا ذکر کرنا ضروری ہے قبل اس کے کہ ہم فتح اٹالیہ کا تذکرہ کریں۔ سلطنت شاہی کے اختتام کے بعد بجائے بادشاہوں کے دو کانسل مقرر کئے گئے اور ایک عرصہ تک ان کے علاوہ ریاست میں کوئی عہدہ دار نہ تھا لیکن ضرورت زمانہ کے بعد دوسرے عہدے بھی قائم کئے گئے جن میں کانسلوں کے فرائض تقسیم ہو گئے۔ عدالتی کام کے لئے پریٹرس کا تقرر ہوا اور شہریوں کی فہرستیں بنانے اور سینیٹ میں تقررات کرنے کا کام سنسروں کے تفویض ہوا۔ شہر روما کی صفائی اور پولیس کے فرائض ایڈیلس کے سپرد ہوئے اور [illegible] کے نفاذ کے بعد ٹریبیون بھی جن کا تقرر رذیلوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہوا تھا سلطنت کے معمولی انتظامی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ان کے علاوہ ایک عہدہ دار ڈکٹیٹر تھا جو تمام رومی خدمات سے بالاتر تھا سلطنت روما میں کوئی عہدہ دار یا مجلس ایسی نہ تھی جو اس کی دوامی

فوجی ضروریات کی سربراہی کر سکتی گو مجلس سینیٹ اس کمی کو اپنی دوامیت اور قومی جب سے ایک حد تک پوری کرتی تھی۔ مگر سخت آزمائش یا مشکل کے وقت رومی کسی سربرآوردہ آدمی کو ڈکٹیٹر مقرر کر دیا کرتے تھے جو ضروریات کے لحاظ سے بلا مشاورت غیرے اپنی رائے سے احکام دیتا۔ اس عہدہ دار کی میعاد صرف چھ ماہ کی ہوتی اور بالکل خود مختار رہتا۔ ڈکٹیٹر کا تقرر گویا ایک محدود میعاد کے لئے حکومت شاہی کا دوبارہ قایم کرنا تھا۔

بابِ نہم

فتح الطالیہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ روما ایک شہری سلطنت تھی جس کی حدود رفتہ رفتہ وسیع ہوتی گئیں یہاں تک کہ قریباً تمام جزیرہ نمائے الطالیہ اس کے قبضہ میں آگیا۔ مگر یہ فتوحات عرصۂ دراز کی بنرد آزمائی کے بعد حاصل ہوئیں جس کی تفصیل بالکل تاریکی میں چھپی ہوئی ہے اور رومیوں کی تاریخوں میں ان فتوحات کے جو تذکرے ہیں وہ ناقابل اعتبار ہونے کے علاوہ خود ستائی سے بے حد مملو ہیں۔ روما کے مختلف حریف اس سے تعداد و خصوصیات میں افضل تھے اس لئے اس کے فتوحات کے اسباب میں زیادہ کاوش کرنا بھی دشوار ہے اور چند اہم واقعات کا ذکر کرنا کافی ہوگا۔ روما کے قریب ترین ہمسائے شمال میں اٹرسکی تھے اور جنوب میں لاطینی۔ لاطینیوں کے ساتھ رومائیوں کے تعلقات ابتدا ہی سے خوشگوار اور دوستانہ تھے اس لئے اٹرسکیوں کے ساتھ جو سلسلۂ رزم پیکار جاری رہا اس میں رومی اتحاد لاطینی کے صدر رہتے تھے۔ اگر اٹرسکیوں کی بستیوں میں اتحاد ہوتا تو یقیناً وہ روما پر غالب رہتے چونکہ تعداد اور دولت میں وہ رومیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ اسی پھوٹ کی وجہ سے روما کو شہر وی ای پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ لاطینیوں کے اضلاع سے آگے دوسری قومیں تھیں جن میں سے تین ایکوی، واسکی، ہرنی کی قابل ذکر ہیں۔ ان لڑائیوں کی ابتدا سے انکی بقا کے اختتام تک روما نے یہ اصول ہمیشہ مد نظر رکھا کہ "تفرقہ ڈالو اور فتح کرو"۔ اسی اصول پر کاربند ہو کر رومیوں نے ہرنیکیوں سے جن کا علاقہ ایکوی اور واسکی

کے وسط میں تجارتی اتحاد جوڑا اور ساٹھ سال کی جنگ و جدال کے بعد روما کو ان دونوں آخر الذکر اقوام پر غلبہ حاصل ہوا۔ اس کے بعد انھیں کبھی کبھی سر اٹھانے کی جرات ہوتی رہی مگر آزادی پھر حاصل نہ ہو سکی۔ اسی زمانہ میں ۳۹۶ ق م میں رومیوں نے قوم ویئی کو بھی مغلوب کر لیا۔ مگر اپنے عروج کے ابتدائی زمانہ میں رومیوں کو ایک نہایت سخت خطرہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ غالیوں کی ایک جماعت کثیر اٹرسکیوں پر شمال سے حملہ آور ہوئی اور اٹرسکیوں کی فوجوں کو شکست دیتی ہوئی رومیوں پر بلائے بے درماں کی طرح آپڑی۔ دونوں فوجوں کا روما کے قریب اے لیا ندی پر مقابلہ ہوا جس میں روما کی فوج کے غالیوں کے زبردست حملہ کی تاب نہ لاسکی۔ شہر روما پر غالیوں کا قبضہ ہو گیا اور قریب تھا کہ اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے مگر حقیقت میں غالیوں کے حملہ سے روما کو تقویت پہنچی کیونکہ اٹرسکی ہمیشہ کے لئے ضعیف ہو گئے لیکن رومی اپنے قومی اتحاد اور زبردست حب وطن کی وجہ سے پھر پنپ گئے اور جب غالی حملہ آور واپس چلے گئے تو رومیوں نے پھر زور پکڑا اور اپنے مقامی دشمنوں سے لڑنے لگے۔ قوانین لی کی نی کے نفاذ کے بعد سلطنت روما اندرونی خرخشوں کے مٹ جانے سے اور بھی طاقت ور ہو گئی اور اس کے اہم فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اٹرسکیوں کے شہروں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا گیا اور اس کے بعد غالیوں نے جب پھر اطالیہ میں دخل در معقولات کرنے کی جرات کی تو انکو دندان شکن جواب دیا گیا۔ ان فتوحات سے روما کا نام اطالیہ کے حدود سے باہر بھی مشہور ہوا اور قرطاجنہ کی زبردست تجارتی سلطنت سے بھی رومیوں نے اتحاد پیدا کیا جو بعد ان کی حریف ثابت ہوئی۔ ۳۴۳ ق م میں سامنیوں اور رومیوں میں اطالیہ میں حصول تفوق کے لئے لڑائی شروع ہوئی۔

سامنیوں کے ساتھ جنگ سال مذکور میں شروع ہوئی مگر معلوم نہیں کہ کب اس جنگ کا سلسلہ ختم ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کا اختتام ۲۹۰ ق م میں ہوا مگر یہ جنگ دوسرے ناموں سے اس کے بعد بھی جاری رہی اور سامنیوں کی مخالفت کا ۸۲ ق م تک خاتمہ نہیں ہوا لیکن ان جنگوں کو جنگ ہائے سامنی

کہنا ہی غلطی ہے کیونکہ اس سلسلۂ جنگ میں ان تمام لڑائیوں کا شمار ہے جو رومیوں اور اطالیہ کے دوسری اقوام کے درمیان ہوتی رہیں کیونکہ ان کو روما کی ماتحتی ناگوار تھی اور وہ اس کوشش میں تھیں کہ روما کے جوئے کو اپنے کندھے سے اتار دیں۔ اس میں نہ صرف سامنی یا اٹرسکی شریک تھے بلکہ یونانی اور سابن بھی تھے اور ایک دفعہ ایک مقدونی فوج بحیرۂ ایڈریاٹک عبور کر کے رومیوں سے لڑنے آئی تھی۔ رومیوں کے دشمنوں میں سامنی نہایت جری اور مستقل مزاج تھے اس لئے جب روما کے خلاف کوئی تحریک پیدا ہوتی تھی تو ان کا زبردست حصہ ہوتا تھا۔ سامنی پہاڑوں پر رہنے کے سبب سے نہایت جری تھے۔ قومیت کے لحاظ سے رومیوں کے ہمجنس تھے مگر تمدن اور تجارت میں رومیوں سے کمتر تھے۔ ان کے کوہی مسکنوں تک رومی مشکل سے پہنچ سکتے تھے اور اپنے انجام کو پہنچنے کے قبل رومیوں کو کئی دفعہ ان سے شکست ہوئی۔

جنگ ہائے سامنی کا آغاز ۳۴۳ سنہ ق م سے ہے جب کہ اس قوم نے کامپانیا کے زرخیز خطے پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے باشندوں نے عاجز آ کر روما سے امداد کی درخواست کی۔ چند ہی روز کی جنگ کے بعد سامنی کامپانیا سے نکال دیئے گئے اور رومیوں کی سیادت اس دلفریب خطے پر قائم ہوگئی۔ دوسری جنگ سامنی کے قبل رومیوں کو ایک دوسری مصیبت کا سامنا ہوا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ رومیوں کو اتحاد لاطینی کی صدارت حاصل تھی اور لاطینیوں نے روما کو اس کے محاربات اور یورشوں میں وفاداری کے ساتھ ساتھ دیا تھا مگر مسلسل فتوحات کے سبب سے رومیوں کا اقتدار اتحاد لاطینی میں بڑھتا گیا جو لاطینیوں کو ناگوار تھا۔ انھوں نے مساوات کی خواہش کی اور مطالبہ کیا کہ ہر سال ایک کانسل لاطینی ہو۔ رومیوں نے انکار کیا اور فوراً جنگ شروع ہوگئی جو دو سال تک جاری رہنے کے بعد رومیوں کی فتح پر ختم ہوئی۔ اتحاد لاطینی ٹوٹ گیا اور روما نے اپنی تفرقہ اور فتح کی پالیسی کے لحاظ سے ہر لاطینی ریاست کے ساتھ علٰحدہ علٰحدہ صلح کی۔

دس سال کے بعد (۲۲۷) دوسری جنگ سامنی شروع ہوئی جس میں سلطنت روما
کی ہستی معرض خطر میں آگئی۔ رومیوں نے دو کانسلوں کے زیر علم ایک فوج
بھیجی مگر وہ کمین گاہ میں پھنس گئی اور ہتھیار ڈال دینے پر رومیوں کی نوآبادیاں
چھن گئیں اور دوسری قوموں نے جب دیکھا کہ سامنیوں کے اقبال کا ستارہ
چمک رہا ہے تو وہ بھی انھیں کی شریک ہو گئیں گویا تمام اطالیہ روما کا دشمن ہو گیا
مگر رومی نہایت استقلال کے ساتھ لڑتے رہے اور آخر کو فتح انھیں کی رہی اور
سنہ ۳۰۴ ق م میں سامنیوں کو رومیوں کے شرائط صلح قبول کرنا پڑے۔ اٹرسکی
اور دوسرے شرکاء جنگ اس سے قبل ہی جنگ سے الگ ہو چکے تھے۔ مگر
یہ صلح دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ سنہ ۲۹۸ میں سامنیوں نے پھر ہتھیار اٹھائے
اور اٹرسکی ان کے شریک ہو گئے اس جنگ کی لڑائیاں علاقہ اٹرودریا میں
ہوئیں اور سامنیوں کی ایک فوج وہاں اٹرسکیوں کی امداد کے لیے پہنچی مگر
سنہ ۲۹۵ میں رومیوں نے اپنے دشمنوں کو بمقام سین ٹی نم شکست فاش دی
اور سامنیوں کو پھر روما کے شرائط صلح قبول کرنے پڑے۔ مگر اس جنگ کے
بعد بھی رومیوں کو چین نہیں ملا اور تمام اطالیہ میں کسی نہ کسی قوم سے جنگ کا سلسلہ
جاری رہا۔ اٹرسکیوں نے پھر بغاوت کی اور چند اقوام غال کو اپنی امداد کے
لیے بلایا مگر ایک لڑائی میں جو جھیل وادی مو کے قریب ہوئی روما نے اپنے
ان دشمنوں کو ہمیشہ کے لیے پامال کر کے دست و پا کر دیا۔ سنہ ۲۸۰ میں رومیوں
کو ایک نئے دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اطالیہ کے جنوبی سواحل کے یونانی شہروں
نے اطالی جنگوں میں بہت کم دلچسپی لی تھی اور غالباً وحشی سامنیوں کی طاقت
کے ضعیف ہونے سے اور ایک متمدن سلطنت کے قوی ہو جانے سے
ان کو ایک گونہ اطمینان بھی تھا۔ مگر رومیوں کے فتوحات نے ان کے مقبوضات
کو بہت وسیع کر دیا تھا اور یونانی نوآبادیوں کی حدود تک پہنچ گئے تھے
جس کے سبب سے یہ لازم آگیا تھا کہ روما اور یونانی نوآبادیوں کے آئندہ
تعلقات کا تصفیہ ہو جائے۔ جنوبی اطالیہ کے یونانی شہروں میں اہم ترین شہر
ٹارین ٹم تھا۔ اس شہر کی بندرگاہ بہت بڑی سی تھی اور قدرتی موقع سے

سبب سے اس کی حفاظت چنداں دشوار نہ تھی اس لیے بحیرۂ آئیونیہ میں تجارت اور جنگ کے لئے اس شہر کو اچھا موقع حاصل تھا۔ رومیوں سے اس شہر سے مخالفت نہ تھی مگر اس کے بندرگاہ میں رومی جہازوں پر حملہ کر دینے سے جنگ چھڑ گئی۔ یہ لوگ روما کی طاقت سے ناواقف تھے اور بے سوچے سمجھے جنگ پر کمربستہ ہو گئے مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ان کی افواج روما کی افواج کے مقابل میں بالکل ہیچ ہیں اور وہ بغیر امداد نہیں لڑ سکتے اس لئے انھوں نے پرہس شاہ ایپائرس کو اپنی امداد کے لئے بلوایا۔

ملک ایپائرس سکندر کی سلطنت کا ایک ٹکڑا تھا جہاں اس کے فتوحات کی یادگار ابھی تک قائم تھی پرہس خود ایک جانباز جنرل تھا جس نے فنون حرب کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا تھا۔ اس جنگ میں رومیوں کو مقدونیہ کے "فلانکس" کے دیکھنے کا پہلا موقع ملا جس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔ رومیوں کی تلواریں چھوٹی ہوتی تھیں اور ان کی صفیں چھدری چھدری برخلاف اس کے مقدونیوں کی تلواریں لمبی لمبی ہوتی تھیں اور ان کی صفیں نہایت گھنی تھیں۔ اس کے علاوہ پرہس کی فوج میں بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ اس قسم کی جنگ کا رومیوں کو تجربہ نہ تھا۔ اگر اس جنگ کی تاریخ کسی قابل مورخ نے لکھی ہوتی تو تاریخ روما میں یہ ایک نہایت دلچسپ باب ہوتا۔ مگر تاریخ جنگ واضح ہیں۔ رومیوں کے ہتھیار اور ان کی جنگی مہارت اس درجہ کی نہ تھی کہ ان کو فتح نصیب ہو اور متعدد شکستیں ہوئیں مگر آخر کار فتح انھیں کے ہاتھ رہی۔ اگر یہ بھی سمجھ میں آجائے تو سلطنت روما کی عظمت کا راز سمجھ میں آگیا۔ رومیوں کے فتوحات جسمانی قوت یا فوجی جوش پر مبنی نہ تھے گو ان کی بھی کمی نہ تھی بلکہ تدبر، استقلال اور اس کے شہریوں اور حلفاء کی وفاشعاری پر۔ جنوبی اطالیہ کی تمام قومیں یونانی، لوکانی، بروٹی اور بہت سے سامنی پرہس کے ساتھ ہو گئے تھے مگر وسط اطالیہ کی سلطنتیں ان کی ہم نوا رہیں۔ اس کے علاوہ رومی ان سپاہیوں کی جگہ جو لڑائیوں میں ضائع ہوتے جدید سپاہی آسانی سے بھرتی کر سکتے تھے اور ان میں یہ بھی صلاحیت تھی کہ فن حرب کے جدید طریقوں

کو اختیار کریں اور اس کے علاوہ شکست کی انھوں نے مطلق پروانہ کی۔ پرہس کو
بھی اپنے یونانی حلفاء کے ساتھ دقتیں پیش آرہی تھیں کیونکہ انھیں بالطبع فوجی
قواعد اور سخت زندگی سے سخت نفرت تھی۔ اس لیئے مجبور ہو کر اس نے سسلی
کا رخ کیا جہاں کے یونانیوں نے اس کو قرطاجنیوں کے مظالم سے نجات
دینے کے لیئے بلایا تھا۔ وہاں بھی اس کو فتوحات ہوئے مگر قلعہ لی بے ایم سے
انھیں وہ نہ نکال سکا اور مجبور ہو کر ۲۷۵ء میں اطالیہ واپس آیا مگر اس مدت میں
اس کے حلفاء اس سے الگ ہو چکے تھے اور رومی بھی پھر سنبھل گئے تھے۔
بی نی وین ٹم واقع سامنیا میں اس سے اور رومیوں سے آخری جنگ ہوئی
جس میں باوجود فلانکس اور ہاتھیوں کے پرہس کو شکست فاحش ہوئی اور
اپنے ملک میں جا کر ایک غیر معروف جنگ میں مارا گیا۔ پرہس پر جو رومیوں کو
فتح ہوئی وہ گویا تنخواہ دار سپاہیوں کے سرگروہ پر ایک ایسی قوم کی فتح تھی
جس کی رگوں میں جذبۂ قومی موجزن تھا۔ رومیوں کی فتح اپنی اخلاقی قوت
اور پیش بینی کے سبب سے ہوئی اور انھیں اوصاف کے سبب سے انھوں
نے قرطاجنیوں کو ایک صدی کے بعد مغلوب کیا۔ روایت ہے کہ پرہس کا
قول تھا کہ اگر میں رومیوں کا بادشاہ ہوتا تو ساری دنیا فتح کر لیتا۔ ٹارنیٹم
اور دوسرے یونانی شہروں نے سر اطاعت خم کیا جس کے سبب سے تمام
اطالیہ پر روما کا قبضہ ہو گیا سوا ان ممالک کے جو دریائے پو کے شمال میں تھے
اور جنھیں رومی اطالیہ کے حدود سے خارج سمجھتے تھے۔ دنیا کی دوسری سلطنتیں
بھی روما کو اپنا مد مقابل خیال کرنے لگی تھیں۔ مصر اور قرطاجنہ نے روما کے
ساتھ تعلقات قائم کیئے۔ آئندہ جن معاملات میں رومی مصروف رہینگے ان کا
تعلق اطالیہ سے باہر بیرونی ممالک سے ہوگا۔ اب روما کا بحیرۂ روم میں خاص
اثر ہو چلا تھا اور اس کو اس امر کا تصفیہ کرنا تھا کہ بحیرۂ روما کے سواحل کے دوسرے
ممالک سے اس کے تعلقات کیا رہینگے۔

روما نے تمام اطالیہ اپنے قبضۂ اقتدار میں لانے میں جن منازل کو طے
کیا ہے ان کا خاکہ ہم پیش کر چکے ہیں۔ تسخیر اطالیہ بجائے خود ایک زبردست کارنامہ ہے۔

اس کے قبل بھی فتوحات ہوئیں مثلاً سکندر اعظم کے فتوحات مگر روما کے فتوحات کی خاص خوبی ان کی دیرپائی ہے۔ عمارت یونان کا اثر سمندر میں لہروں کے ٹکرانے کے اثر سے زیادہ نہیں۔ سکندر کی سلطنت اس کے مرتے ہی پاش پاش ہوگئی مگر فتوحات روما سے یورپ میں امن و امان کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لئے فتوحات روما اور انکے دائمی اثر کے اسباب پر غور کرنا ضروری ہے۔ اہم ترین امر اس میں یہ ہے کہ رومیوں کی فوجی تدابیر میں دماغی پہلو غالب ہے۔ بمقابلہ دوسری اقوام قدیم کے رومیوں کو فتح و شکست کی پروا بہت کم تھی۔ ان کی تیاریاں ایسے وسیع پیمانہ پر ہوتی تھیں کہ شکست کی نقصانات کی بہت جلد تلافی کرلی جاتی اور ایک فتح دوسری فتح کا زینہ ہوتی۔ رومی افواج کا ضبط اسپارٹا کے ضبط فوجی سے کم سخت نہ تھا مگر باوجود اس سختی کے اس میں صرف فرض کی پابندی لازمی نہ تھی بلکہ ہر فرد کے اختیار تیزی پر بھی بہت کچھ چھوڑ دیا جاتا۔ رومی "لیجن" میں ہر شخص کی جگہ مقرر تھی مگر ہر شخص ایک حد تک اپنے افعال کا مختار تھا اور رومی افواج مقدونیہ کی "فلانکس" کی طرح بالکل مشین نہ تھیں۔ یورپ میں سڑکوں کی تعمیر رومیوں سے شروع ہوئی جس کی وجہ سے رومی اپنے دشمنوں پر نہایت سرعت کے ساتھ حملہ کرتے تھے۔ سڑکوں کی ایجاد کا سہرا رومیوں کے سر ہی ہے۔ اس کے قبل صرف راستے ہوا کرتے تھے۔ اس ایجاد کی اہمیت کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ یہ سڑکیں ابتداءً فوجی اغراض سے بنائی گئی تھیں مگر بعد میں تجارت کو بھی ان کے وجود سے بہت فروغ ہوا۔ سڑکوں کے سبب سے رومی فوراً دشمن کے ملک میں پہنچ جاتے تھے۔ بغاوت کے زور پکڑنے کے قبل ہی اسے فرو کرسکتے تھے گویا ان سڑکوں سے تمام وہ کام لئے جاتے تھے جو اب شمالی ہندوستان کی سرحدی ریلوں سے لئے جاتے ہیں۔ دوسری جنگ سامنی سے سڑکوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ پہلی سڑک روما سے علاقہ کامپانیا کو تعمیر کی گئی اور بعد میں برنڈیسی تک بڑھا دی گئی اور دوسری سڑکیں بھی شمال اور جنوب مشرق کی طرف بنائی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سڑکوں کی حفاظت کا سامان کیا گیا ورنہ دشمن بھی ان سڑکوں سے نفع اٹھا سکتے۔ اس مقصد کے لئے رومیوں نے ان سڑکوں پر مناسب موقع پر نوآبادیاں بسائیں۔ مگر یہ رومی نوآبادیوں اور دوسری

نوآبادیوں میں بہت فرق تھا۔ رومی نوآبادی سے مفہوم سپاہیوں کی ایک مستقل جماعت سے تھا جو کسی دشمن کے ملک میں رکھی جاتی اور ان کی قوت بسری کے لئے مفتوح قوم کی زمینات ان کے سپرد کردی جاتیں۔ اگر نوآبادوں کو روما میں شہریت کے حقوق حاصل ہوتے تو وہ نوآبادی میں بھی قائم رہتے مگر نوآبادیاں ایسی بھی تھیں جن کو شہریت کے پورے حقوق حاصل نہ تھے۔ ان کا فرض تھا کہ اپنی فوجی قوت قائم رکھیں روما کے فوائد کی نگہبانی کریں اور سڑکوں کی حفاظت کریں انھیں نوآبادیوں سے اطالیہ کے اکثر مشہور شہروں کی ابتدا ہوتی ہے۔

روما کو فتوحات ضبط فوجی، نوآبادیوں اور سڑکوں کی بدولت حاصل ہوئے۔ مگر یہ ذرائع بھی بے سود ثابت ہوتے اگر علاقہ جات مفتوحہ کے باشندوں کے ساتھ جو روما کا تعلق پیدا ہوا اس میں حد درجہ کا تدبر نہ برتا جاتا۔ روما نے ان مفتوحہ علاقوں کو اپنی سلطنت کا جزو نہیں بنایا بلکہ ان کو اپنا حلیف بنایا۔ ان تمام حلفا کے ساتھ ایک اہم شرط یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ رومی فوجوں کے لئے سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد دیا کریں اور اس زمانہ کے بعد رومی افواج میں حلفا کی تعداد زیادہ ہوتی جو خراج بھی دیا کرتے تھے۔ فوجی خدمت کے علاوہ دوسری شرائط میں اختلاف عظیم تھا۔ رومیوں کا اصول یہ تھا کہ اپنے حلفار کے حقوق میں فرق رکھتے تاکہ ان پر حکومت کرنے میں دشواری نہ ہو۔ پرہس کے مقابلہ میں جو محاربات ہوئے ان کے اختتام کے بعد حسب ذیل گروہ اطالیہ میں تھے۔ سب سے افضل تو شہریان روما تھے، جو روما اور اس کے مضافات کے علاوہ رومی نوآبادیوں اور بعض دوسرے شہروں میں بھی تھے جنھیں "شہریت روما" کے حقوق ان کی خاص خدمات کے اعتراف میں دیے گئے تھے۔ ان سے کمتر چند گروہ تھے جنکو بجائے "شہریت روما" کے "لاطینی حقوق" حاصل تھے۔ ان اقوام کو اپنے اندرونی معاملات کے طے کرنے کی پوری آزادی تھی، ان کی تجارت میں روک ٹوک نہ تھی، رومیوں کے ساتھ شادی بیاہ کر سکتے تھے اور ان میں سے بعض افراد "شہریت روما" کے حقوق بھی حاصل کر سکتے تھے مگر ان کا درجہ رومیوں سے

کمتر تھا اور جنگ میں بھی یہ روما کی پیچن (جیوشن) میں شریک نہ کئے جاتے تھے بلکہ خاص افواج تھیں۔ ان کے بعد حلفا کا درجہ تھا جن کے حقوق مختلف تھے مگر ان کو بھی ایک بڑی حد تک حکومت خود اختیاری حاصل تھی اور سب کو روما کی فوجوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ان حلفاء کے باہمی تعلقات اور دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات کے متعلق سخت شرائط تھے۔

نظام سلطنت روما یہی تھا۔ اب اقوام مفتوحہ کے ساتھ جو سلوک انھوں نے کیا اگر آپ اس کا مقابلہ اس سلوک سے کریں جو ایتھنز اور اسپارٹا کے لوگ اپنے مفتوحین کے ساتھ کرتے تھے تو ظاہر ہوگا کہ رومیوں کا سلوک حد درجہ کی فراخدلی پر مبنی تھا اور انھوں نے اپنی اس فراخدلی اور تدبر کا پھل پایا۔ ان کے حلفاء ہمیشہ وفا شعار رہے گو بعض وقت بغاوت پر بھی آمادہ ہو جایا کرتے تھے۔ سلطنت روما کے تدبر اور قیام امن وامان کے سبب سے تمام اطالیہ ان کے قبضہ میں آگیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ روم کے تمام ممالک پر اس کا اثر پھیل گیا۔

رومی فتوحات کی ایک دوسری وجہ کی طرف گذشتہ باب کے آخر میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جنگ کے نازک زمانے میں ڈکٹیٹر کا تقرر۔ روایت ہے کہ جنگ ہائے گالیہ کے زمانے میں کیامی لس پانچ بار ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا اور اس جانباز جنرل کی لاجواب بہادری فراخدلی اور خوش قسمتی رومیوں میں ضرب المثل ہو گئی۔ جنگ ہائے سامنی کے زمانے میں کئی شخص ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے۔ یہ رومیوں کی خاص خوبی تھی کہ وہ ایک دوسرے پر کامل اعتماد رکھتے تھے اور ذاتی رقابت کا کبھی خیال بھی نہ کرتے تھے۔ آزادی کی وہ پرستش کرتے تھے مگر اعتدال کے ساتھ اور ان میں یہ احساس تھا کہ بعض مواقع ایسے بھی ہیں کہ تقویت حاصل کرنے کے لئے آزادی سے باز آنا ہی بہتر ہے۔ جنگ میں ضروری ہے کہ ہر معاملے کا تصفیہ عجلت اور اخفاء کے ساتھ کیا جائے اور یہ بات سینیٹ اور کمیٹیا کے مباحث سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

شخص جمہور کا دلدادہ تھا اس سے کبھی اس بات کا اندیشہ پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہر ڈکٹیٹر چھ مہینے کے بعد اپنے اقتدارات سے سبکدوش ہونا پسند نہ کرے گا۔ روما کی تاریخ میں رومیوں کی اخلاقی قوت قابل توصیف نظر آتی ہے اور اپنے قابل ترین افراد سے بحیثیت مجموعی رومی زیادہ قابل ستائش ہیں۔

باب سوم

محاربات روما و قرطاجنہ

رومی اب تمام ملک اطالیہ پر مسلط ہو چکے تھے مگر ان کے فتوحات کا سلسلہ ملک اطالیہ تک محدود نہیں رہا بلکہ اطالیہ ان کی شہنشاہی کا پہلا زینہ تھا۔ اس ملک کا جغرافی موقع ایسا نہیں ہے کہ بیرونی ممالک سے کچھ سروکار نہ رہے۔ سسلی قریب قریب اطالیہ کا ایک حصہ ہے اور جب سسلی پر قبضہ ہو جائے تو افریقہ کے شمالی سواحل کچھ دور نہیں۔ اطالیہ کے مغربی ساحل پر جزائر سارڈینیا و کرسکا ہیں۔ اگر ان پر کسی مخالف ریاست کا قبضہ ہو تو سلطنت اطالیہ کو ادھر سے ہر وقت حملہ کا خطرہ رہتا ہے۔ ان وجوہ کے سبب سے رومیوں کو بحیرۂ روم کے متصل ممالک کے قبضہ کے لئے قرطاجنیوں کے ساتھ مجادلۂ عظیم کرنا پڑا۔ مورخین یورپ نے قرطاجنیوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ قرطاجنیوں کے ادبیات اور فنون لطیفہ کے صرف منتشر اجزا ہم تک پہنچتے ہیں اور ان کے عروج و زوال اور دیگر تاریخی اور تمدنی حالات کے ذرائع صرف انکے دشمنوں کی تحریریں ہیں جنھوں نے ان کے تمدن کو نیست و نابود کر دیا۔ جو مواد ہمارے سامنے موجود ہے اس سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ تمدن یورپ کی ترقی میں ان کا کوئی حصہ ہے لیکن اگر ان کے مزید حالات ہمیں معلوم ہوتے تو ممکن تھا کہ ہماری رائے کچھ اور ہوتی۔ قرطاجنی بخلاف رومیوں اور یونانیوں کے نسل سامی میں سے تھے! در ابتدا، قرطاجنہ میں شام کے شہر ٹائر (سور)

سے آکر آباد ہوئے۔ ان کی آبادیاں بحیرۂ روم کے مغربی ساحل کے متعدد مقامات میں تھیں۔ اس قوم کے مشاغل بالکل تجارتی تھے۔ یونانیوں کو تجارت میں خاص درک تھا اور رومیوں کی پالیسی بھی یہی تھی کہ اپنی تجارت کو فروغ دیں مگر قرطاجنیوں کو تجارت کے علاوہ کوئی اور دلچسپ مشغلہ نہ تھا۔ شمالی افریقہ میں یہ قوم بطور زائم آباد ہوئی تھی مگر دیسی باشندوں کی تالیف قلوب میں انھیں کبھی کامیابی نہ ہوئی۔ رومیوں کے مقابلہ میں ان کے نظام سیاسی میں اتحاد کی کمی تھی۔ رومیوں کی شہریوں کی فوجوں کے مقابلہ میں کارتھیج کی افواج میں اجیر سپاہی تھے جنھیں صرف اپنی تنخواہ سے سروکار تھا۔ گو یہ سپاہی نہایت جری تھے اور قابل جنرلوں کے زیر علم خوب لڑتے تھے مگر جیوش روما کی طرح سخت وسرد برداشت نہ کر سکتے تھے۔ رومیوں نے تمام اطالیہ کو اپنے حزم واستقلال اور تدبر سے اپنا حلیف بنا لیا تھا مگر قرطاجنیوں نے اپنی مفتوحہ اقوام کی تالیف قلوب میں بہت کم کوشش کی۔ اس میں شک نہیں کہ دیسیوں کو انھوں نے مغلوب کر لیا تھا مگر وجوہ مذکورۂ بالا کے سبب سے دیسی آبادی کبھی ان سے خوش نہیں رہی اور ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں سے ملجانے پر تیار رہی۔ قرطاجنہ میں ابتدا میں سلطنت شاہی قائم تھی مگر تیسری صدی قبل مسیح کے وسط میں سلطنت خواص قائم ہو گئی جس میں تجارتی عنصر غالب تھا اور ان کا دستور سیاسی وہی تھا جو جمہوریت وینس کا چودھویں اور پندرھویں صدی میں تھا۔ تمام اقتدارات ایک مجلس کو حاصل تھے جس کے اراکین کی تعداد ۱۰۴ تھی جو جائے ہائے خالی شدہ کو خود ہی پر کرتے تھے۔ میدان جنگ میں سپہ سالاروں کے اختیارات بالکل غیر محدود ہوتے تھے۔ قرطاجنیوں کے علمی کارناموں کا ہمیں علم نہیں۔ ان کے مذہب کا کچھ خفیف سا حال معلوم ہے جس سے وحشیانہ پن اور جہالت کی بو آتی ہے۔ ان کے معبودوں میں دو مشہور ہیں ایک بعل جس کے مندروں میں انسانی قربانیاں ہوتی تھیں اور دوسرا استار کی جس کی پرستش میں بیان کیا جاتا ہے کہ طرح طرح کی بداعمالیاں ہوتی تھیں۔

رومی قرطاجنیوں سے عرصہ سے واقف تھے اور ایک آدھ دفعہ ان سے

بھی ہوا تھا کہ دونوں مل کر کسی تیسری سلطنت سے لڑے بھی تھے۔ سسلی میں ان دونوں اقوام میں پہلے پہل مقابلہ ہوا۔ اس جزیرہ کو تصرف میں لانے کا قرطاجنیوں کو عرصہ سے خیال تھا گو اس کے سواحل پر آزاد یونانی ریاستیں بھی تھیں۔ لڑائیوں کا آغاز یوں ہوا کہ رومیوں نے بلا کسی معقول وجہ کے میسنا پر قبضہ کر لیا مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ہر دو اقوام کا منشا تھا کہ جزیرہ سسلی کو اپنے تسلط میں لائیں۔ قرطاجنیوں کے ساتھ پہلی جنگ جو "جنگ فنیقی" کے نام سے مشہور ہے ۲۶۴ سنہ سے ۲۴۱ ق م تک جاری رہی تھی مگر بخوف طوالت اس کا سرسری تذکرہ کرنے سے بھی ہم معذور ہیں گو اس کی دلچسپی میں شک نہیں۔ جزیرہ سسلی کے قبضہ کے علاوہ اس جنگ سے ایک غرض یہ بھی تھی کہ بحری فوقیت کا بھی تصفیہ ہو جائے قرطاجنہ ایک عظیم الشان بحری ریاست تھی۔ رومیوں کے پاس نہ جنگی جہاز تھے نہ انھیں بحری جنگ کا تجربہ تھا گو جنگ ہائے سابقہ میں انھوں نے بھی ایک بیڑہ بنا لیا تھا۔ مگر اس جنگ میں رومیوں کو مجبوراً ایک زبردست بیڑہ بنانا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرطاجنیوں کو شکست دیکر انھوں نے سسلی پر قبضہ کر لیا۔ رومیوں کی کامیابیوں کے متعلق ان کے مورخوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے مگر جو خاکہ ہم نے کھینچا ہے اس کی صحت میں شک نہیں کیونکہ جنگی ضروریات کو فوراً رفع کر دینا رومیوں کی ایک ممتاز خصوصیت تھی۔ رومیوں نے قرطاجنی جہازوں کے نمونے پر جہاز بنائے اور اس کے علاوہ ایک اوزار ایجاد کیا جس کے ذریعے سے دشمن کے جہاز کو اپنے جہاز میں جکڑ دیتے اور پھر دست بدست مقابلہ شروع ہو جاتا تھا جیسا کہ خشکی میں ہوتا ہے۔ اس طرح سے جنگ کے ابتدائی زمانہ میں روما کو دوبارہ فتح حاصل ہوئی اور ۲۵۶ ق م میں انھوں نے افریقہ پر فوج کشی کی تاکہ خود قرطاجنہ پر قبضہ کر کے جنگ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر اس فوج کو افریقہ کے سواحل پر اترتے ہی شکست ہوئی۔ کئی رومی بیڑے طوفانوں کی نذر ہوئے اور سسلی میں جہاں رومیوں کو فوقیت حاصل تھی دو شہر پانورمس اور للی بیم نہایت جرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس آخر الذکر قلعہ کے محاصرہ کے ساتھ گویا اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔

قرطاجنیوں کا سپہ سالار ہملکار بارکا نہایت قابل تھا۔ اور رومی بیڑوں اور افواج کو کئی مرتبہ اس سے ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہملکار کی قابلیت کے علاوہ رومیوں کے پاس روپیہ کی بھی کمی تھی جس کی وجہ سے اس جنگ نے بہت طول پکڑا اگر آخر کار سلطنت روما اور اس کے محب وطن باشندوں کی سعی بلیغ سے ۲۴۱ ق م میں قرطاجنیوں کو شکست فاش ہوئی اور سر تسلیم خم کر کے جزیرۂ سسلی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا۔ جزیرہ کا مشرقی حصہ اب بھی شہر سیراکیوز کے قبضے میں تھا مگر باقی تمام حصہ روما کے قبضے میں آگیا۔ اطالیہ سے باہر سلطنت روما کا پہلا مقبوضہ ثابت ہوا۔ رومیوں نے اپنی دو ممتاز خصوصیتوں یعنی جدت اور استقلال کی وجہ سے اطالیہ کو مسخر کیا تھا اور انھیں خصوصیات کے بدولت شہنشاہیت کا پہلے زینہ طے کرنے میں بھی انھیں کامیابی ہوئی۔

مگر اس ہزیمت سے ریاست قرطاجنہ بالکل ضعیف نہیں ہوئی اور اس سے احتمال تھا کہ دونوں قومیں پھر کبھی نہ کبھی برسرِ پرخاش ہو جائینگی۔ ۲۴۱ سے ۲۱۸ ق م تک صلح قائم رہی اور پھر دوسری "جنگ فیتقی" شروع ہوئی جس نے روما اور قرطاجنہ کے قضیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ مگر اس جنگ کے آغاز کے قبل دوسرے اہم واقعات ہوئے ہیں جن کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ دونوں حریف سلطنتوں کے باہمی تعلقات اور طرز جنگ پر اس کا بیّن اثر پڑا ہے۔ رومیوں نے اس زمانے میں اپنی سلطنت کو شمال کی طرف وسعت دیکر کوہ آلپس تک پہنچا دیا۔ سلسلہ ہائے کوہی آلپس و آلی نائنس کے درمیان جو ملک ہے اس میں قوم غال آباد تھی۔ یہ قوم اور ملک وہی ہے جس کو اب فرانس کہتے ہیں اور جس نے ۳۹۰ سنہ میں رومیوں کو شکست فاش دی تھی۔ آلپس تک اپنے مقبوضات کے بڑھانے میں کچھ تو رومیوں کے فوجی اغراض وابستہ تھے اور دوسرے یہ کہ دریائے پو کی وادی زراعتی اغراض کے لئے نہایت مفید ہے۔ جنگ و جدال کا سلسلہ عرصہ تک قائم رہا غالیوں کو خود اپنے پہاڑوں اور جنگلوں میں شکست ہوئی۔ رومیوں کے دو سپہ سالاروں سیپو اور فلامینیس نے اس جنگ میں خاص نام آوری حاصل کی اور آخر الذکر نے ایک سڑک روما سے راوی نا تک بنوائی۔ لیکن گو غالیوں کا ملک

برائے نام فتح ہو گیا مگر ان کے دم خم باقی تھے اور موقع ملتے ہی انھوں نے رومی جوے کو اپنے سے اتارنے کی کوشش کی۔ اسی زمانہ میں رومیوں نے علاوہ سسلی کے جزائر کرسیکا اور سارڈینیا پر بھی قبضہ کرلیا جو اس کے قبل قرطاجنیوں کے قبضہ میں تھے مگر انھوں نے دوبارہ ہتیار اٹھانے سے یہ بہتر خیال کیا کہ رومیوں کے اس تشدد پر سر تسلیم خم کریں۔

قرطاجنہ نے بھی اس زمانہ میں اپنی سلطنت میں معتدبہ اضافہ کیا بلکہ اس کے ہمعصر خیال کرتے تھے کہ روما سے زیادہ اس سلطنت میں وسعت پیدا ہوئی۔ جزائر مذکورۂ بالا کا نعم البدل ان کو ہسپانیہ میں مل گیا۔ تسخیر ہسپانیہ ہملکار بارکا کے خاندان کے ارکین کی اولوالعزمی کا نتیجہ تھی جس نے پہلی جنگ میں رومیوں کو متعدد شکستیں دی تھیں ہملکار اپنی تنخواہ دار فوجوں کی ایک سخت بغاوت فرو کرکے ہسپانیہ کی فتح کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اس کا جانشین اس کا بھائی ہیدروبال ہوا جس کی موت پر اس مہم کا سردار ہملکار کا بیٹا ہینی بال ہوا جس کی شخصیت تاریخ قرطاجنہ میں سب سے بڑی ہے ہینی بال نے ابتدا ہی سے روما سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی۔ اس کے زیر کمان قرطاجنیوں کی فوجیں کوہ پیرینیز تک پہنچ گئیں۔ گو یہ فتوحات محض سطحی تھیں مگر ہسپانیہ میں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اس فوج کی میدان جنگ میں مزاحمت کر سکتی۔ ۲۱۹ء ق م میں ہینی بال نے ساگنٹم کا محاصرہ شروع کیا جس کے سقوط کے بعد تمام جزیرہ نمائے ہسپانیہ اس کے قبضہ میں آجاتا۔ مگر ساگنٹم نے روما سے حفاظت کی درخواست کی۔ جس پر رومیوں نے ہینی بال کو حکم دیا کہ اس شہر کے محاصرہ سے باز آئے۔ ہینی بال نے حقارت کے ساتھ انکار کیا اور گو آٹھ ماہ کے بعد ہینی بال کو فتح ہوگئی مگر ظاہر تھا کہ روما سے جنگ ضرور ہوگی۔ روما کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ فوجیں فوراً تیار کی گئیں اور ہسپانیہ روانہ کر دی گئیں کیونکہ گمان غالب تھا کہ مقابلہ وہیں ہوگا۔ مگر رومیوں کو ابھی ہینی بال سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

مورخین میں مدت سے یہ بحث درپیش ہے کہ رفتار زمانہ پر غیر معمولی قابلیت کے افراد کا کس قدر اثر پڑا ہے اور کس قدر دوسرے اسباب وعلل کا جو افراد انسانی کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرطاجنہ کی دوسری جنگ جس طرز پر ہوئی اور جتنی مدت تک جاری رہی وہ زیادہ تر ہینی بال کی قابلیت اور

استقلال کا نتیجہ ہے۔ تاریخ یورپ میں فن سپہگری میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ سکندر اعظم، جولیس سیزر اور نپولین بھی اس خطاب کے دعویدار ہو سکتے ہیں مگر ان کی عظمت کو وہ ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی فتوحات ایسے دشمنوں پر تھیں جو ان سے ہر طرح کمزور تھے۔ سکندر نے ایران کی از کار رفتہ سلطنت اور وحشی اقوام کا قلع قمع کیا۔ سیزر کو جو فتوحات نصیب ہوئیں وہ وحشی اور غیر متحد غالیوں یا دوسری غیر قواعد داں افواج پر تھیں۔ نپولین کی کامیابی اس غیر معمولی جوش پر مبنی تھی جو انقلاب فرانس سے پیدا ہوا تھا اور یورپ کی دوسری سلطنتوں کی فوجوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے۔ مگر ہنی بال نے روما پر اس وقت حملہ کیا جب کہ روما کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا اس کی افواج کے ضبط اور استقلال کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اس کی حکمران جماعت نہایت قابل تھی اور اس کے سپہ سالار میدان جنگ میں اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ ایسے زمانہ میں ہنی بال کا فتحمند رہنا اور سلطنت روما کا اپنی ہستی کو قائم رکھنا ظاہر کرتا ہے کہ دونوں حریف کس پائے کے تھے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ رومی ہسپانیہ پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے مگر ہنی بال نے یہ جدت کی کہ اس نے اطالیہ پر خود حملہ کر دیا۔ قرطاجنیوں کو بحیرۂ روم میں بحری فوقیت حاصل نہ تھی اس لئے وہ ہسپانیہ سے خشکی سے روانہ ہوا اور یہ کوہ پیرینیز کے دروں میں سے ہوتا ہوا سرزمین فرانس میں داخل ہوا اور قصد کیا کہ کوہ آلپس کو طے کرے۔ اس زمانے سے نپولین کے وقت تک بہت سے جنرلوں نے اس سلسلۂ کوہی کو طے کیا ہے یا طے کرنے کا دعوے کیا ہے مگر ہنی بال کو اس معرکۂ عظیم میں جو دشواری ہوتی ہے وہ شاید ہی کسی کو ہوئی ہو کیونکہ اس کے پاس نقشے نہیں تھے اس کے جغرافیائی معلومات محدود تھے، مقامی اقوام اس کی مخالف تھیں مگر اس مرد میدان نے ان مشکلات کی کچھ پروا نہ کی اور اپنے سپاہیوں اور ہاتھیوں کو جو افریقہ کی گرمی کے عادی تھے لیکر کوہ آلپس کے یخ بستہ دروں اور سلسلۂ کوہی کے سنگلاخ راستوں کو طے کرتا ہوا اطالیہ کے میدان میں وارد ہوا۔ رومی جیوش ہسپانیہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے مگر جب دشمن روما کے

دروازوں تک پہنچ گیا تو مجبوراً ان کو واپس بلانا پڑا۔ اس کے ساتھ جو محاربات ہوئے تاریخوں میں ان کا مفصل ذکر ہے ہم بالاختصار بیان کرتے ہیں کہ ہینی بال سے جہاں جہاں رومیوں سے جنگ ہوئی فتح اسی کے ہاتھ رہی اور اس کی فتوحات سے جمہوریت روما کی کمر ٹوٹ گئی۔ ۲۱۸ سے ۲۰۵ ق م تک ہینی بال اطالیہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوچ کرتا رہا اور کوئی اس کا مزاحم نہ ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روما نے اطاعت کیوں نہ قبول کی۔ مگر جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں رومیوں کا نظام سلطنت ایسا زبردست تھا اور ان کا حب وطن اتنا قوی تھا کہ مسلسل ہزیمتوں سے بھی ان کی ہمت نہ ٹوٹتی تھی اور پھر سنبھل کر شکست کو فتح سے بدل دیتے تھے۔ لیکن اگر صرف فوجی نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو ہینی بال کی کامیابی ایک حد معین سے بڑھ نہیں سکتی تھی۔ میدان جنگ میں تو کوئی اس کا مد مقابل نہ تھا مگر محاصروں میں اسے اس قدر کامیابی نہ ہوتی تھی اور بعض مبصرین کو اس کی سپہ سالاری میں بھی تامل ہے اس کے علاوہ خود اس کی قوم اس کی پوری مدد نہیں کرتی تھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ سمندر پر اب قرطاجنہ کا کوئی اثر نہ تھا اور دوسرے قرطاجنہ کے اہل الرائے اسے حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قرطاجنہ کی اس بے پروائی کے سبب سے یہ خیال ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہ جنگ صرف ایک فرد واحد (ہینی بال) اور ایک پوری قوم (روما) کے درمیان تھی۔

واقعات جنگ بالاختصار حسب ذیل ہیں۔ اطالیہ کے میدان شمالی میں قدم رکھتے ہی رومیوں کو ہینی بال کا لوہا ماننا پڑا۔ رومیوں کے سواروں کے رسالوں کو ٹی کی نس میں ہزیمت ہوئی اور اس کے بعد ہی رومی فوج کو ہینی بال نے ٹری بیا میں شکست فاحش دی جس میں رومیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس جنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہینی بال نے کمال استادی سے کمین گاہیں بنائی تھیں اور رومی پیادہ سپاہ نے اس میں اپنے ضبط اور استقلال کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے بالآخر اس جنگ کے خاتمہ پر رومیوں کی شکست فتح سے متبدل ہو گئی۔ اس کے بعد ہینی بال نے سلسلہ کوہ اپی نائینز کو طے کیا۔ رومیوں نے ایک فوج زیر کمان فلامینیس اس کے

رو کنے کے لئے بھیجی مگر اس کو بھی اس نے جھیل ٹراسی مین کے قریب شکست دی۔ اگر اس دوسری صریحی فتح کے بعد ہینی بال نے روما پر حملہ کر دیا ہوتا تو ممکن تھا کہ روما اس کے قبضہ میں آجاتا اور ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گیا ہوتا۔ اس سے رومی خود متحیر تھے اور مورخین بھی ششدر و متحیر ہیں مگر ہینی بال نے فیصلہ کیا کہ روما پر حملہ کرنا ابھی مناسب نہیں۔ جنگ ٹریبیا کے بعد علاقۂ شمالی کے غالی بھی تعداد کثیر میں اس کے شریک ہو گئے اور اسے امید تھی کہ روما کی ناگوار حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے وسطی اطالیہ کے باشندے بھی اس کے جھنڈے کے نیچے جوق جوق چلے آئینگے۔ یہ امید گو خوش آئند تھی مگر پوری نہیں ہوئی کیونکہ اطالیوں کو روما سے اس درجہ کی منافرت نہ تھی جو افریقیوں کو قرطاجنہ سے تھی۔ کچھ لوگ ہینی بال کے شریک ہو گئے مگر وسط اطالیہ کے باشندے زیادہ تر وفادار رہے اور انھیں کی وفاشعاری روما کی بقا کا باعث ہوئی۔

رومیوں کی ہزیمتوں کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ٹراسی مین کی جنگ کے بعد فے بیس کو انھوں نے ڈکٹیٹر مقرر کیا اور اسی کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ ہینی بال سے کھلے میدان میں نہ لڑا جائے بلکہ اس کی افواج کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور جہاں موقع ملے اس کو پریشان کیا جائے۔ مگر ۲۱۶ء میں رومیوں کی پھر کچھ ہمت بندھی۔ جدید کانسل منتخب ہوئے اور انھوں نے افواج کثیر اپنے ساتھ لے کر بمقام کنائے (جنوبی مشرقی اطالیہ) ہینی بال کے مقابلے کے لئے آئے مگر ان کو ایسی شکست فاحش نصیب ہوئی کہ جس کا صفحات تاریخ میں کہیں ذکر نہیں اور اس فوج کثیر میں سے صرف چند ہزار بچ سکے۔ اس فتح عظیم کے بعد خود ہینی بال کے افسروں نے اس سے اصرار کیا کہ فوراً روما پر حملہ کر دے اور غالباً ان کا اصرار درست بھی تھا۔ مگر ہینی بال پھر وہی لیت و لعل کی چال چلا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ اطالیہ کے تمام باشندوں کو جنھیں روما سے ذرا بھی ملال تھا اپنا شریک کرے اور اسے یہ بھی امید تھی کہ بہت سے افراد خوفزدہ اور مرعوب ہو کر اس کے جھنڈے کے نیچے چلے آئینگے اور ایک حد تک اس کا یہ قیاس صحیح بھی تھا۔ بہت سے سامنی اور جنوب اطالیہ کے یونانی اسکے

ہنوا ہو گئے جس سے روما کا مستقبل نہایت تاریک ہو گیا مگر اس کے جری باشندے ہمت نہ ہارے کیونکہ ان میں خوب زبردست اتحاد تھا اور وسط اطالیہ کے حلفاء اپنی وفاشعاری پر قائم تھے۔ رومیوں نے اپنی فوجی پالیسی کو بدل دیا اور قصد کر لیا کہ آئندہ سے میدان جنگ میں ہنی بال کا مقابلہ نہ کریں گے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے سر تسلیم خم نہ کیا۔ اس جدید پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ معرکۂ کنائے سے روما کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ ہنی بال کی فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ فتح اس کے ہم رکاب ضرور تھی مگر اس واقعہ کے بعد روما کی قوت برابر بڑھتی گئی۔ برخلاف اس کے ہنی بال کو قرطاجنہ سے تازہ دم سپاہیوں کی کمک نہیں بھیجی جاتی تھی اور جب اس کا ستارہ غروب ہونے لگا تو اس کے اطالوی حلفاء بھی اس سے کنارہ کش ہونے لگے۔ رومیوں نے جلد اپنے نقصانات کی تلافی کر لی ہنی بال کی طرح ان کو محاصروں میں ناکامی نہ ہوئی تھی اور انھوں نے ہنی بال کے حلفاء میں سے تین زبردست شہروں کپوا، سیراکیوز اور ٹارنٹم پر پھر دوبارہ قبضہ کر لیا مگر رومیوں کو زیادہ کامیابیاں ہسپانیہ میں حاصل ہوئیں۔ رومی اس ملک کی طرف اس لئے متوجہ ہوئے کہ یہیں سے ہنی بال کو امداد پہنچ سکتی تھی کیونکہ سمندر سے اب اس کی حکومت اٹھ گئی تھی۔ ہسپانیہ میں بھی رومیوں کو ابتدا میں شکستیں ہوئیں اور ان کی ہمت اس قدر ٹوٹ گئی کہ قریب تھا کہ فتح کا خیال ہی بالکل چھوڑ دیں۔ مگر اس نازک موقع پر ایک رومی نوجوان سی پیو نے روما کی عزت رکھ لی۔ ہنی بال کے مقابلے میں جو معرکے ہوئے ان میں سی پیو کے برابر کسی نے نام آوری حاصل نہیں کی۔ دوسرے سپہ سالار مثلاً فے بیس اور مارسلیس سے بھی بڑی بہادری سے لڑے اور رومی مورخ اور شعراء ان کی اولوالعزمی کے مداح ہیں مگر رومیوں میں سی پیو ہی اس جنگ کا مرد میدان ہے۔ معرکۂ باغئے قرطاجنہ میں سی پیو ابتدا ہی سے شریک تھا۔ ہنی بال سے جو پہلا مقابلہ ٹی گی نس میں ہوا تھا اس میں اس نے اپنے باپ کی جان بچائی تھی اور جنگ کنائے میں بھی موجود تھا اور جان سلامت لیکر بھاگ نکلا۔ رومیوں کی ممتاز خصوصیات وفاشعاری، حب قومی، ضبط اور کارگزاری سب اس کے ضمیر میں تھیں مگر ان

خصوصیات کے علاوہ تخیل اور سرگرمی بھی تھی جو یونانی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ تھا جن کا رواج روما میں ہو چلا تھا۔ اپنے ہموطنوں کے دلوں میں اس کا خاص اثر تھا اور ان کے دلوں میں یہ خیال جم گیا تھا کہ یہی نوجوان ان کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ اس کی معرکہ آرائیوں کی ابتدا ہسپانیہ سے ہوئی جہاں اس نے ہنی بال کے بھائی ہسڈروبال کو کئی دفعہ شکست دیکر جزیرہ نمائے مذکورہ کے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

ہسپانیہ میں ہسڈروبال کی شکست کا نتیجہ عجیب و غریب ہوا ہسپانیہ کو خیرباد کہکر اس نے اپنے بھائی کی کمک کے لئے اطالیہ کا رخ کیا۔ اگر دونوں فوجیں مل جاتیں تو یقیناً ہنی بال پھر حملہ کرتا اور اس دفعہ روما کو نہ چھوڑتا مگر ہسڈروبال کی فوج ہنی بال تک نہیں پہنچنے پائی اور رومیوں نے میٹارس میں مزاحم ہو کر (۲۰۷ ق م) میں اسے شکست دی۔ ہنی بال کو اس کے بھائی کی اطالیہ میں آنے اور شکست و موت کی خبریں ایک ہی وقت میں ملیں اور اس کے بعد اس کو رومیوں سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا حالانکہ اس کی فوجیں روز بروز گھٹتی جاتی تھیں مگر آخر وقت تک رومی اس سے گریز کرتے رہے اور سرزمین اطالیہ میں اس سے معرکہ آرا نہ ہوئے۔

مگر اب جنگ کا اختتام قریب تھا۔ فتحمند سپیو ہسپانیہ سے واپس ہو کر فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا ہوا روما میں داخل ہوا اور ایک زبردست فوج اپنے ہمراہ لیکر افریقہ کا رخ کر کے قرطاجنہ پر یورش کرنے کا قصد کیا جس سے قرطاجنی ہراساں ہو گئے اور انھوں نے ہنی بال کو واپس بلا لیا ہنی بال واپس آیا اور ۲۰۲ ق م میں سپیو سے بمقام زاما مقابلہ ہوا۔ اس کی فوج میں اب آزمودہ کار سپاہی باقی نہ رہے تھے اور جدید سپاہیوں کی تعداد غالب تھی اس کے علاوہ رومی اسکے داؤں پیچ اور کمین گاہوں سے خوب واقف ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت سخت لڑائی کے بعد رومیوں ہی کی فتح رہی اور ہنی بال کے مشورے سے قرطاجنیوں نے شکست مان لی جس کے بموجب انھیں چند علاقے اور جنگی جہاز رومیوں کے سپرد کرنے پڑے۔ رومیوں نے افریقہ میں قدم جمائے مگر

قرطاجنہ کی آزادی برقرار رہی۔

خدا خدا کر کے یہ محاربہ عظیم روما کی فتح پر ختم ہوا اور اب مغربی سواحل بحیرۂ روم میں اس کا کوئی رقیب باقی نہ تھا۔ تمام بڑے بڑے جزیرے اس کے قبضہ میں آگئے ہسپانیہ پر اس کا تسلط ہو گیا اور قرطاجنہ کی تجارت رومی تاجروں کے ہاتھ میں آگئی۔ مگر افسوس کہ قرطاجنہ کی تجارت کے ساتھ قرطاجنیوں کی خو بو بھی رومیوں میں آگئی اس لئے فتح سے روما کو خالص نفع نہیں ہوا۔ اطالیہ میں غلاموں کی تعداد کثیر آگئی اور ان کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ ہونے لگا۔ بیرونی ممالک پر قبضہ ہو جانے سے ایسے رسوم و رواج رائج ہو گئے جو آخر میں جا کر جمہوریت کی فنا کا باعث ہوئے۔

باب یازدہم

بحیرۂ روم میں رومیوں کی فوقیت

جنگ ہائے قرطاجنہ میں روما کو جو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اس کی وجہ سے نظام سلطنت میں بہت کچھ فرق پڑ گیا۔ دستور سیاسی میں بظاہر تو کوئی تغیر نہیں ہوا کیونکہ رومی اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے نظام سلطنت میں تغیرات تو کر دیتے تھے مگر ان کو ضبط تحریر میں نہیں لاتے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ جمہوریت کا وہ رنگ باقی نہ رہا جو پہلے تھا۔ مجالس سیاسی سب حسب سابق باقی تھیں مگر انکے فرائض اور ان کی اہمیت میں ضرور تغیر ہو گیا۔

دستور رومی میں اصولاً تمام اقتدارات کا ماخذ جمہور روما تھا۔ مجسٹریٹوں کا تقرر جمہور کے ہاتھوں میں تھا اور یہ حکام سلطنت روما کے خادم تھے نہ کہ آقا۔ سینیٹ بھی ابتداءً صرف مجلس شوریٰ تھی۔ مگر درحقیقت سینیٹ کا اقتدار دستور کے تمام اجزا پر غالب تھا اور جنگ قرطاجنہ کے انصرام میں جو کامیابی اس مجلس کو ہوئی اس سے اس کی طاقت اور بھی بڑھ گئی روما کی بزرگی اور عظمت ایشیا کے ضعف کا باعث ہوئی اور عنان سلطنت ان مجالس کے ہاتھ سے نکل گئی شہریان روما کی تعداد لاکھوں سے بڑھ گئی تھی جو تمام اطالیہ بلکہ ممالک مفتوحہ یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جلد جلد جمع ہونا اور معاملات سیاسی پر مباحثہ کرنا روز بروز دشوار ہوتا جاتا تھا۔ ایتھنز ایک ذراسی ریاست تھی اس میں تمام شہریوں کا اجتماع ممکن تھا مگر روما کی وسعت اس اجتماع کے منافی تھی کلیشیا

میں جس کو جمہور رومی کہتے تھے زیادہ تر ایسے لوگ جمع ہوتے تھے جنھیں سیاسی جلسوں کی شرکت کے علاوہ کوئی کام نہ تھا اور کام کاج والے لوگ اس میں بہت کم شریک تھے۔ مجسٹریٹوں کو بھی امور سیاسی کے تصفیے یا پالیسی قائم کرنے میں بہت کم دخل تھا کیونکہ دستور روما ان احکام کے اختیارات کے بڑھنے کا مخالف تھا۔ مجسٹریٹ تنہا کام نہ کرتے تھے بلکہ ان کی کمیٹیاں ہوتی تھیں جن میں دو یا دو سے زیادہ مجسٹریٹ شریک رہتے۔ اگر ایک مجسٹریٹ کی رائے دوسرے کے خلاف ہوتی تو اس کا حکم کالعدم ہو جاتا اور اس کے علاوہ ٹریبیون کو یہ اختیار تھا کہ جس حکم کے نفاذ کو چاہے روک دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دستور روما کا منشا یہ تھا کہ حکمراں جماعتوں کو جہاں تک ممکن ہو ضعیف رکھا جائے اور ان کے اختیارات کے حدود اور موانع مقرر کر دینے سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ رومیوں کو حکام کی طرف سے خطرہ رہا کرتا تھا اور وہ آزادی کو حسن انتظام پر ترجیح دیتے تھے۔

کمیشیا کی کچھ وقعت نہ رہ گئی تھی اور مجسٹریٹوں کا تقرر صرف چند روزہ ہوا کرتا تھا۔ مگر بخلاف ان کے سینیٹ چند افراد کی مستقل جماعت تھی جن کی رکنیت تا حین حیات ہوتی تھی۔ اس مجلس کے متعدد ارکین ایسے تھے جو مناصب جلیلہ پر سرفراز ہو چکے تھے اور ان کو اپنے تجربۂ واقف کاری اور استقلال کی وجہ سے امور مملکت میں اس قدر دخل ہوا کہ گویا عنان حکومت ان کے ہاتھ میں آگئی۔ قرطاجنہ کے محاربۂ عظیم میں جو کامیابی ہوئی وہ اسی مجلس کے سیاست اور تدبر کا نتیجہ تھا اور فتح ہو جانے سے اس کی قوت اور بھی بڑھ گئی یہاں تک کہ جمہور روما کی اصلی مجالس یعنی کمیشیا کا وجود صرف برائے نام رہ گیا اور مجسٹریٹ اس کے ارشاد کی تعمیل اپنا فرض سمجھنے لگے۔ سینیٹ کو یہ عظمت اپنے ارکین کی قوم پرستی، جرأت، استقلال، سیاسی دوربینی اور کامیابی سے حاصل ہوئی تھی اور گو یہ اقتدارات ایک حد تک غاصبانہ تھے مگر مورخین کی رائے ہے کہ انصرام امور مملکت میں ان کو جو کامیابی ہوئی وہ اس غصب کی ضرورت کو ثابت کرتی ہے۔ جنگ قرطاجنہ کے قبل روما کی جو حالت تھی اس کو بعد کے حالات سے بہت بہتر خیال کیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں رومیوں کی

تمام جماعتوں میں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کا خاص خیال تھا اور پورے اتحاد کے ساتھ ایک دوسرے پر اعتماد تھا۔ اگر رومیوں میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں تو سینیٹ کو نہ تو کامیابی ہوتی اور نہ وہ اپنی قوت قائم رکھ سکتے۔

ہینی بال کو شکست دینا تو آسان تھا مگر رومیوں کو اب اس سے بڑی مہم درپیش آئی۔ ضروریات سیاسی اور خود ان کی اولوالعزمی انھیں مجبور کر رہی تھی کہ بحیرۂ روم کے تمام ملک پر تسلط حاصل کریں جس سے ان کے دائرۂ حکومت میں مختلف ممالک آجائینگے جن کے باشندے قوم مذہب اور زبان میں اس سے مختلف ہوں گے۔ ان فتوحات سے نئی مشکلات کا سامنا ہوگا اور اس کے علاوہ یہ بھی سوال پیش آئے گا کہ رومیوں میں غیر اقوام پر حکومت کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں اس حکومت کا خود اس کے خصائص اور دستور پر کیا اثر ہوگا۔ مگر مستقبل نے ثابت کر دیا کہ جمہور روما میں یہ صلاحیت نہ تھی۔ شہنشاہیت تو حاصل ہوئی مگر اس کی وجہ سے جمہوریت دب گئی اور اس کی جگہ پر ایک دوسرا نظام سلطنت قائم ہوا جس کو اُس زمانہ کے رومی ہرگز پسند نہ کرتے۔

اس زمانے تک مدبران روما کی نگاہیں مغرب کی طرف لگی ہوئی تھیں اور ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ اطالیہ ہسپانیہ مغربی افریقہ اور جزائر پر قابض ہو جائیں۔ مگر ہینی بال کی ہزیمت کے بعد انھوں نے اپنی توجہ کو مشرق کے متمدن ملک سے جس ممالک کی طرف منعطف کیا۔ بحرۂ روم کے مشرقی سواحل پر بہت سی سلطنتیں قائم تھیں جو ایک زمانہ میں سکندر اعظم کی سلطنت کا جزو تھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سکندر کی موت ہی کے بعد اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے مقبوضات منقسم ہو گئے۔ سلسلہ تقسیم اب تک جاری تھا لیکن تین ریاستیں اب بھی خاص اہمیت رکھتی تھیں۔ ان میں سے پہلی ریاست مقدونیہ تھی اور گو اس کی وسعت بہت بڑی نہ تھی مگر اس کے باشندے جری تھے اور ان کے مقبوضات میں معدنیات کی کانیں تھیں۔ دوسری سلطنت شام تھی جس پر سکندر کے ایک سپہ سالار سلیوکس کی اولاد قابض تھی۔ اس سلطنت کے وسیع رقبے میں کئی بہت سے غدار شہر تھے۔ تیسری سلطنت مصر تھی جس پر ایک دوسرے سپہ سالار بطلیموس کی اولاد

حکمراں تھی۔ اس ریاست کا جغرافیائی موقع اچھا تھا اور چاروں طرف صحرا ولق ودق
اور سمندریوں سے گھرے ہونے سے بیرونی حملوں سے محفوظ تھی مگر حکمراں جماعت یونانی الاصل
تھی اور اصلی باشندے مصری تھے اس لئے اس سلطنت میں قومی روح نہ تھی۔ ان
تین سلطنتوں کے علاوہ بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ تھریس میں بالکل بدامنی
تھی اس لئے اس کا تفصیل سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایشیائے کوچک میں
سکندر کی وفات کے بعد سنہ ۲ ق م کے قریب بالکل طوائف الملوکی پھیل گئی۔
برگامم، کاپاڈوشیا اور بتھی نیا میں بادشاہ حکمراں تھے۔ بہت سے آزاد یونانی شہر
تھے اور وسط میں ریاست گیلاتی شیا تھی جس میں تیسری صدی کے بعد غالی آکر
آباد ہو گئے تھے۔ خود یونان میں کایا پلٹ ہو گیا تھا اور ڈیماس تھینیز کے زمانہ کی
حالت بھی باقی نہ رہی تھی۔ اس زمانہ کی عظیم ریاستیں یعنی تھیبس، ایتھنز، کورنتھ
اور اسپارٹا باقی تھیں مگر ان کا اثر زائل ہو چکا تھا اور شہری سلطنتوں کے بجائے
مختلف اتحادات قائم ہو گئے تھے۔ کورنتھ کے شمال میں یونان کے پہاڑی
اور غیر متمدن مغربی حصہ میں اتحاد ایٹولی تھا جو بجائے شہروں کے اضلاع کا اتحاد
تھا۔ اس اتحاد کا مقصد یہ تھا کہ مشرق کے متمدن اضلاع کو موقع پا کر لوٹ لیا کریں۔
پیلو پونیس میں اتحاد آکائی تھا۔ سیاسیات یونان میں یہ ایک جدید تجربہ تھا جس
سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں کے دماغ میں جدت اب تک باقی تھی کیونکہ یہ
(اتحادی ریاست) کی پہلی مثال ہے جس کا زمانہ حال میں بہت رواج ہو گیا ہے
اور آئندہ جا کر اس کو اور بھی تقویت ہو گی۔ آکائیا کے شہروں کی ذاتی آزادی
قائم تھی اور اتحاد کی غرض صرف یہ تھی کہ بیرونی دشمنوں سے محفوظ رہیں۔ روما نے
ان اتحادات کو مٹا دیا مگر پیرکلس کے زمانہ کی ایتھنز کی جمہوریہ کی طرح اس اتحاد
کی خصوصیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

مگر کیا سبب تھا کہ یہ سب مشرقی ریاستیں روما کی حلقہ بگوش ہو گئیں
کیونکہ علمی کارناموں کے لحاظ سے تو رومیوں کو یونانیوں سے کوئی نسبت نہ تھی
اور بہت جلد وہ زمانہ آیا کہ رومی ایتھنز، سکندریہ اور مشرق کے دوسرے
شہروں میں علم حاصل کرنے لگے۔ فنون حرب کا بغور مطالعہ کیا جاتا تھا اور اس

فن پر بہترین کتابیں مقدونیہ کے یونانیوں نے لکھی تھیں۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے فتح کا سہرا رومیوں ہی کے سر رہا اور فتح کر لینے کے بعد ان ملکوں پر آسانی سے وہ قابض رہے۔ رومیوں کی کامیابی کا زیادہ تر راز یہ تھا کہ ان میں رشتۂ قومی نہایت مضبوط تھا گو اس درجہ کا نہیں جیسا کہ جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانہ میں تھا۔ لیکن زمانۂ قدیم میں کسی قوم میں اس قدر اتحاد نہ تھا۔ جماعت حکمراں نہ صرف قوم کی ہمجنس تھی بلکہ خود قوم حکمراں تھی۔ برخلاف اس کے مصر اور شام بلکہ ایک حد تک مقدونیہ کے بادشاہوں اور ان کی رعایا میں کوئی یگانگت نہ تھی اس لئے ان کو اپنے بادشاہوں سے اس درجہ کی عقیدتمندی اور وفاشعاری نہ تھی جیسا کہ رومیوں کو اپنی جمہوریت سے تھی۔ یونانیوں کو خود تسلیم تھا کہ رومی ان سے زیادہ راست باز اور راست گو ہیں۔ ان کی تجارت میں کسی قسم کا دھوکا نہ تھا۔ رومیوں کو اپنے قول و فعل کا پاس تھا اس لئے ہر شخص ان پر اعتماد کرتا تھا۔ یونانیوں کا دروغ گوئی کے سبب سے کوئی اعتبار نہ کرتا۔ پالی بیس کا خیال ہے کہ یونانیوں کے مغلوب ہونے کا یہی سبب ہے۔

مشرق میں روما اولاً مقدونیہ سے برسر پرخاش ہوا۔ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے جنگ کنائے کے بعد ہنی بال سے سازباز کر لیا تھا اور مقدونی سپاہی جنگ زاما میں قرطاجنیوں کی طرف سے لڑے تھے۔ فلپ کی اس حرکت سے رومیوں کو سخت اشتعال ہوا اور گو اس طویل جنگ کے بعد پھر کسی دوسری سلطنت سے برسر پرخاش ہونا مناسب نہیں خیال کیا جاتا تھا مگر آخر کار یہی طے پایا کہ سلطنت روما کی عظمت و توقیر قائم رکھنے کے لئے ایک یورش کرنا ضروری ہے گو مقدونیہ پر مستقل قبضہ کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ ۱۹۸ ق م میں ایک فوج زیر کمان فلامینیس فلپ کی سرکوبی کے لئے بھیجی گئی مگر ہم اس خاص جنگ یا دوسرے جنگی معرکوں کو جو رومیوں کو مشرق میں پیش آئے تفصیل سے بیان نہیں کر سکتے۔ یونان کے متمدن باشندے روما کے طرفدار تھے اور ۱۹۷ ق م رومیوں نے بمقام سائی نوسی فانے مقدونیوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں بھی روما کی لیجن (فوج) اور مقدونیہ کے فلانکس کا مقابلہ ہوا۔ مقدونی فلانکس

کے دھاوے تو برداشت نہیں کر سکتے تھے مگر ان کو بھی فن حرب میں کچھ کم کمال نہیں تھا اور فتح آخر انھیں کی ہوئی۔ رومی سپاہیوں کی صفیں جگہ چھوڑ چھوڑ کر ترتیب دی گئی تھیں تاکہ نقصان زیادہ نہ ہو اور ہتیاروں میں رومی چھوٹی تلوار سے زیادہ کام لیا کرتے تھے۔ ہموار زمین پر رومی فلانکس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے وہ اس امر کی کوشش کرتے تھے کہ مقدونیوں کو دھوکا دے کر ناہموار زمین پر لے آئیں تاکہ ان کی صف ٹوٹ جائے اس کے بعد ان کو غلیلوں اور تیروں سے پریشان کرتے اور جب ان کی صفیں بالکل درہم برہم ہو جاتیں تو پھر دست بدست لڑائی ہونے لگتی جس میں رومی سپاہی مقدونیوں سے آسانی سے بازی لے جاتے جو اپنی صف آرائی کے بغیر لڑ نہیں سکتے تھے۔

رومیوں نے یونانیوں کے ساتھ جو سلوک ان کا ملک فتح کرنے کے بعد کیا وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ یونانیوں سے اس کے قبل بھی وہ واقف تھے کیونکہ خود اطالیہ اور سسلی میں یونانی شہر تھے مگر یونان میں آنے کے بعد انھیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ یونان کے تمدن اور علوم کا پایہ کس قدر بلند رہے۔ ابتدائً تو انھوں نے یونان میں ہر ایک شے کو ستائش کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کا سپہ سالار یونان میں سیاح ہی بطور پر پھرتا رہا اور فنون لطیفہ کے نادر نمونوں، مندروں اور مشہور تاریخی مقامات کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ یونانیوں سے محبت رکھنا اور ان کی قدر کرنا تعلیم یافتہ اشخاص میں فیشن ہو گیا۔ مگر یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی۔ رومیوں کو جلد معلوم ہو گیا کہ یونانی ان کی قدردانی اور ستائش کے مستحق نہ تھے کیونکہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ یونانیوں کے اخلاق خراب ہیں ان میں مکر و فریب خود غرضی کا مادہ زیادہ ہے اور آخر کار ان کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کرنا پڑا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یونانیوں سے ملنے جلنے سے ان کی تاریخ میں ایک انقلاب ہو گیا۔ فلسفہ اور فنون لطیفہ میں یونانی معراج کمال پر پہنچ گئے اس لئے باوجود منافرت کے رومیوں نے ان کے علوم و فنون حاصل کرنے میں ایسی سعی بلیغ کی کہ تاریخ میں ایک قوم کا دوسری قوم پر شاید ہی اس قدر اثر ہوا ہو۔ رومیوں نے اس تاریخ سے اپنے قومی مذہب

ادبیات اور فلسفہ کو خیرباد کہا اور یونانی خیالات مذہبی اعتقادات اور فلسفہ کے دلدادہ ہو گئے۔

رومیوں کا یہ بالکل قصد نہ تھا کہ مشرق میں مستقل طور پر اپنا اثر بڑھائیں۔ فلپ کی اطاعت قبول کرنے پر رومیوں نے اس کی آزادی تسلیم کر لی یونانیوں کو خوف تھا کہ اب بجائے مقدونیوں کے ان پر رومی مسلط ہو جائینگے مگر ان کا خوف بے اصل ثابت ہوا کیونکہ ۱۹۶ سنہ ق م میں فلامینس نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ کورنتھ میں اعلان کر دیا کہ یونان آج کی تاریخ سے آزاد ہے جس سے یونانی پھر یہ خواب دیکھنے لگے کہ پیریکلس اور ڈیماس تھینز کا زمانہ دوبارہ عود کر آئیگا۔ مگر انسان کی طرح اقوام کا شباب کبھی عود نہیں کرتا۔ چار سال کے بعد رومیوں نے مجبوراً پھر دوسری فوج یونان کی تسخیر کے لئے بھیجی کیونکہ چار سال قبل جو انتظام کیا گیا تھا وہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ یونانیوں نے اپنی آزادی کا اس بری طرح استعمال کیا کہ ان کی حرکتوں سے رومی برافروختہ ہو گئے اور یونانیوں کو مجبوراً انٹیوکس شاہ شام سے امداد کی درخواست کرنا پڑی۔ ہینی بال جس کو رومیوں نے قرطاجنہ سے نکلوا دیا تھا جلا وطن ہو کر اس بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا تھا اور اپنے خدمات پیش کیے تھے۔ رومیوں کو یہ اور بھی ناگوار ہوا۔ مگر انٹیوکس نے اپنی حماقت سے اس بہادر آزما سپاہی کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور جب رومیوں کی فوج یونان میں پہنچ گئی تو اس کی افواج کو سخت ہزیمت ہوئی۔ اور یونان سے بھاگ کھڑا ہونا پڑا۔ مگر رومیوں نے اس کا ایشیائے کوچک تک تعاقب کیا اور مگنیشیا میں ۱۹۰ سنہ ق م میں پھر اسے سخت شکست دی۔ بادشاہ شام کی فوج رومیوں سے کثیر تھی مگر بدنظمی اور سپہ سالاروں کی نالائقی باعث ہزیمت ہوئی۔ اس جنگ میں کئی مشہور لوگ مشیر تھے۔ ہینی بال قرطاجنی انٹیوکس کا مشیر خاص تھا مگر اس جنگ کے بعد اس نے خودکشی کر لی کہ کہیں رومی اس کی حوالگی کا مطالبہ نہ کریں۔ رومیوں کے سپہ سالار دو تھے ایک توسی پیو جس کو فتح زاما کے سبب سے "فاتح افریقہ" کا خطاب ملا تھا اور دوسرا اس کا بھائی۔ اس زمانہ میں خاندان سی پیو اور ان کے

مقدونیہ کی امداد کے بغیر کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود ان فتوحات کے رومیوں نے کسی ملک کا الحاق نہ کیا اور اپنے حلفاء کی قدر افزائی اور دشمنوں کی تعزیر پر اکتفا کیا۔ اتحاد ایٹولی نے یونان میں اس کی مخالفت کی تھی اس لئے ان پر زبردست تاوان لگایا گیا اور ان کی زمینیں چھین لی گئیں۔ رومیوں کے حلفاء میں سے سربرآوردہ شاہ پرگامم تھا اور جمہوریت روڈز جن کے اثر اور مقبوضات میں اضافہ ہوا۔

ان فتوحات سے رومیوں نے گویا مشرق میں اپنی سیادت قائم کر دی مگر جو انتظامات انھوں نے کر دیئے تھے وہ دیرپا ثابت نہ ہوئے۔ مقدونیہ کا دوسرا بادشاہ پرسیس بلند حوصلہ شخص تھا۔ اس کو رومیوں کی ماتحتی ناگوار تھی اور خود یونان میں متعدد لوگ ایسے تھے جن کو رومیوں کی حلقہ بگوشی منظور نہ تھی یہ سب اس کی امداد پر تیار ہو گئے۔ رومیوں کو اس کے منصوبوں کی خبر ہو گئی اور ۱۷۱ ؁ میں انھوں نے پھر مقدونیہ پر فوج کشی کی۔ اس معرکہ آرائی میں ابتداءً رومیوں کو سخت ناکامی ہوئی۔ رومی فوجیں کئی مقامات میں روک دی گئیں اور کئی جگہ ان کو شکست ہوئی آخر کار رومیوں نے پھر خاندان سی پیو کے افراد سے درخواست کی کہ اس مشکل سے ان کو نجات دلائیں۔ ایمیلیس پالس سی پیو کا برادر نسبتی سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ اس پر بھی مقدونیوں نے خوب داد شجاعت دی مگر آخر کار ۱۶۸ ؁ میں رومی فوج مقدونیہ میں داخل ہو گئی اور بمقام پڈنا مقدونی "فلانکس" کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس پر بھی رومیوں نے کھلم کھلا قبضہ کرنے سے احتراز کیا بلکہ ہوشیاری سے شاہ مقدونیہ کو معزول کر کے اس ملک میں چار جمہوری سلطنتیں قائم کیں جو برائے نام آزاد مگر دراصل روما کی باجگذار تھیں۔ لیکن یہ انتظام بھی زیادہ روز نہ چلا اور ۱۴۶ ؁ ق م میں مقدونیہ سلطنت روما کا ایک معمولی صوبہ ہو گیا۔

اس بغاوت کے فرو کرنے کے بعد رومیوں نے اپنا طرز عمل بدل دیا اور یونانیوں کی قدر و منزلت کرنے کے بجائے ان کے ساتھ نہایت سختی سے پیش آنے لگے جو ان کے سابقہ طرز عمل یعنی اقوام مفتوحہ کی تالیف قلوب کے

اصول کے بالکل برخلاف تھا۔ مقدونیہ میں رومیوں نے نہایت بےرحمی کے ساتھ لوٹ مار کی اور جب ان کو اس سے بھی تشفی نہ ہوئی تو انھوں نے اپنے سپاہیوں کو اپیائرس پر یلغار کے لئے بھیجا گو اس بدنصیب ملک سے انھیں کوئی وجہ پرخاش نہ تھی۔ اور علاوہ دیگر مظالم کے اس ملک کے ڈیڑھ لاکھ باشندے غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے تاکہ رومی سپاہیوں کو انعام دیا جائے۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ غیر ممالک کی فتح سے رومیوں کے اخلاق پر نہایت ہی خراب اثر پڑ رہا تھا اور اسی اخلاقی انحطاط سے جمہوریت روما کا خاتمہ ہو گیا۔ روما نے تمام دنیا تو فتح کر لی مگر افسوس کہ اس مہم عظیم میں اپنی روح کھو دی۔

رومیوں کے جدید انتظامات سے یونان پر مصیبت آ گئی۔ پرگامس اور روڈس نے رومیوں کی بہت امداد کی تھی مگر ان کے ساتھ بھی رومیوں نے اچھا سلوک نہ کیا اور ان کے مقبوضات چھین لیے۔ اتحاد آکائیا کا انجام بھی اچھا نہ ہوا۔ رومی اس کے خلاف اسپارٹا کے جابر بادشاہ کے پشت پناہ ہو گئے اور آخر کار جنگ میں اس اتحاد کو شکست ہوئی کورنتھ بھی رومیوں نے فتح کر لیا اور اس شہر کو مسمار کر کے جلا دیا۔ یونان صوبہ تو نہیں بنایا گیا مگر رومیوں کا تسلط اس پر ہو گیا۔

۱۴۶ ق م رومی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سال میں مقدونیہ سلطنت روما کا ایک صوبہ بنایا گیا۔ کورنتھ مسمار کیا گیا اور قرطاجنہ کا قلع قمع کر دیا گیا۔ قرطاجنہ کی بربادی رومیوں کے دامن پر ایک سخت دھبہ ہے۔ قرطاجنہ پر دوبارہ فتح حاصل کرنے پر بھی رومیوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں یہ قوم پھر دوبارہ سر نہ اٹھائے۔ اس کے علاوہ قرطاجنہ کی تجارت اب بھی فروغ پر تھی گو در اصل نہ تو قرطاجنہ کی پہلی سی حالت تھی اور نہ تجارت میں وہ رومیوں کے حریف تھے مگر رومیوں نے ٹھان لیا کہ کسی نہ کسی صورت سے قرطاجنہ کی تخریب کی جائے اور اس غرض سے انھوں نے ایسی سخت شرائط پیش کیں جسے قرطاجنی کبھی قبول نہ کر سکتے تھے۔ جنگ شروع ہو گئی۔ قرطاجنی خوب دل کھول کر لڑے اور رومیوں کا مقابلہ

کرتے رہے مگر ان کا انجام قریب تھا اور ان کا خاتمہ فاتح زاما کے تبنّی بیٹے کے ہاتھ سے ہوا۔ کورنتھ کی طرح رومیوں نے قرطاجنہ کو بھی مسمار کر کے جلا دیا۔ فتح مند سپی پیو کو اس وقت ہومر کا ایک فی البدیہہ شعر یاد آیا اور اسے خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ ایک روز بد ایسا بھی آئے کہ کوئی فاتح روما کے ساتھ بھی یہی کرے۔ قرطاجنہ بھی اس تاریخ سے سلطنت روما کے صوبجات میں شامل ہو گیا۔

بحیرۂ روما کے ساحل مشرقی کے تمام ممالک ابھی رومیوں کے قبضہ میں نہیں آئے تھے مگر اس کے دائرۂ اثر میں ضرور تھے۔ رومی ہر جھگڑے میں کود پڑتے اور تعلق ہو یا نہ ہو ہر فریق سے من مانی شرائط منظور کرا لیتے مثلاً ۱۶۸ ق م میں انیٹوکس بادشاہ شام نے مصر پر فوج کشی کا قصد کیا مگر اس کے ملک کی حد پر پہنچتے ہی ایک رومی افسر نے اس کو واپس ہونے کا حکم دیا۔ شاہ شام نے بہت کچھ زور مارا مگر اس نے اپنی چھڑی سے ایک خط کھینچ دیا اور کہا کہ سلطنت روما کا حکم ہے کہ تم اس خط کے اس پار نہ آؤ۔ روما کی اس قدر دھاک بندھ گئی تھی کہ شہنشاہ شام کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ یہودی بھی رومیوں سے مرعوب اور خائف تھے ایک یہودی مصنف لکھتا ہے "رومیوں نے ان تمام سلطنتوں اور جزائر کو مسخر کر لیا ہے جن کے حکام نے ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت کی۔ اپنے حلفاء اور دوستوں کے ساتھ وہ محبت سے پیش آتے ہیں جسے چاہیں بادشاہ بنا دیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ ان کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان میں سے کوئی فرد لباس شاہی زیب تن نہیں کرتا کہ دوسروں پر حکومت کرے اور نہ ان میں آپس میں بغض وحسد ہے" اس مصنف نے رومیوں کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ ایک زمانہ میں صحیح تھی مگر جس عہد میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں رومیوں کے اخلاق وعادات میں یہ خصائص باقی نہ رہے تھے اور بہت جلد وہ زمانہ آنے والا تھا کہ بغض وحسد کی آگ بھڑک اٹھے۔

اس عہد کے رومیوں کے خصائل بیان کرینگے بجائے یہ مناسب

ہوگا کہ اس زمانے کے دو سربرآوردہ اشخاص کی سیرت پر نظر کی جائے جن کے خصائص متضاد تھے۔ ان میں سے پہلا مارکس کیٹو ہے۔ پلوٹارک نے اس کے سوانح بھی لکھے ہیں جس میں اس کا خاکہ نہایت کمال کے ساتھ کھینچا ہے۔ یہ مایۂ ناز رومی سپاہی منش آدمی تھا جو فوجی فرائض نہایت محنت و مشقت کے ساتھ ادا کیا کرتا تھا۔ عہدہ دار ہونے پر بھی ایمانداری اس نے ہاتھ سے نہ دی؛ ضبط اوقات کا حد درجہ پابند تھا اور دوسروں سے بھی سختی کے ساتھ پابندی کراتا تھا، جزرسی بھی اس کی مشہور تھی اور مرفہ الحال ہونے پر بھی سادہ زندگی بسر کرتا رہا۔ گویا اس میں رومیوں کی ممتاز خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ اپنی بیوی اور بچوں کی نسبت اس کا قول تھا کہ دنیا میں ان سے پاک کوئی شے نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلاموں کے ساتھ اس کا سلوک نہایت ہی درشت بلکہ ظالمانہ تھا اور ان کے ساتھ رعایت کرنا یا انسانیت کے ساتھ سلوک کرنا اس کی نظر میں نہایت برا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ زمانے کا رنگ بدل رہا تھا اور برے دن آرہے ہیں۔ عمائد سلطنت جو شہرہ و برو کرتے یا شان و شوکت کے ساتھ رہتے ان کا سخت دشمن تھا۔ اس کے نزدیک ان تمام خرابیوں کی جڑ یونانیوں کے مطالعۂ علوم و فنون میں مضمر تھی اس لئے اس کی خواہش تھی کہ تمام فلسفیان یونان خارج البلد کر دیے جائیں خود سقراط کو وہ "لفاظ اور خطرناک آدمی" کہا کرتا تھا۔ تعلیم کے نئے طریقوں کو سخت ناپسند کرتا اور خصوصاً یونانی استادوں سے جن کا روما میں اثر بڑھ رہا تھا اسے سخت بغض تھا کیٹو کہا کرتا تھا کہ یہ لوگ حرف زبان سے اور رومی دل سے تعلیم دیتے ہیں۔ مگر زمانہ اس کا مخالف تھا۔ خود اسی کا قول تھا کہ میں پیدا ہوا ایک عہد میں اور میری زندگی گزری دوسرے عہد میں آخرکار اسے بھی فلسفۂ یونان کا مطالعہ کرنا پڑا جس سے وہ سخت متنفر تھا۔

اس عہد کا دوسرا سربرآوردہ آدمی جو اس سے بالکل مختلف تھا سپیو ثانی فاتح قرطاجنہ تھا۔ علوم یونانی جن سے کیٹو کو خاص نفرت تھی ان سے اس کو دلچسپی بلکہ شغف تھا۔ یونانیوں کی صحبت میں اسے خاص لطف آتا تھا

اور ان کے ساتھ سیاسیات اخلاق اور مذہب پر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ جمہور روما کے ساتھ اسے خاص عقیدت تھی اور اس کی خدمات قابل قدر تھے مگر اس کا مطمح نظر اتنا بلند تھا کہ کیٹو کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا۔ عہد مذکور پر اس کا اور اس کے احباب کا بیحد اثر پڑا ہے۔ سسیرو نہ بہت بڑا سپاہی تھا نہ مدبر مگر اس کے خصائل ایسے تھے جس کی وجہ سے ہم نہ صرف رومیوں کی قدر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں بلکہ ان کی محبت بھی ہمارے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔

باب دوازدہم

سینیٹ کی قوت کا زوال

سینیٹ نے جس کامیابی کے ساتھ روما پر حکمرانی کی تھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ مگر وہ زمانہ آرہا ہے جب کہ اس کے اقتدار کے دوسرے دعویدار پیدا ہونگے اور جمہور روما بھی اپنے حصے کے طلبگار ہونگے جو اصولاً ان کا تھا۔ اس انقلاب کے متعدد اسباب ہیں مگر سب کا کم و بیش وسعت حکومت روما سے تعلق ہے۔ فطرتاً رومیوں کو فتح مندی کی ہوس نہ تھی مگر چند در چند وجوہ سے رومیوں کا تمام اطالیہ پر تسلط ہوگیا اور پھر تمام ممالک بحیرۂ روم ان کے زیر اقتدار ہوگئے۔ مگر یہی فتوحات تنظیم جمہوریت کی بربادی کا باعث ہوئیں۔ دوسری اقوام سے ملنے جلنے اور مبادلۂ خیالات سے رومیوں کے اخلاقی نظام کی بنیاد ہل گئی۔ فرائض منصبی ادا کرنا ان کے یہاں بہت بڑی خوبی تھی مگر آزادیٔ خیال کے اثر سے جو فلسفۂ یونان کے مطالعہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ خوبی ایک حد تک جاتی رہی۔ یونان کے فلسفہ، فنون لطیفہ، ادبیات اور تخیلات مذہبی کا رنگ رومیوں پر غالب ہوگیا۔ یونان کے علوم رومیوں کے علوم سے اعلیٰ و ارفع تھے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں میں سے وہ سادگی اور فرائض پرستی جاتی رہی جو ان کی خاص صفت تھی اور بجائے خدمت قومی کے ان میں دوسرے مشاغل بھی پیدا ہوگئے۔ ممالک مفتوحہ کا اثر بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ سسلی، سارڈینیا، کرسکا، افریقہ (سابق مقبوضات قرطاجنہ) مقدونیہ اور ایشیائے کوچک سب رومیوں کے

زیر تسلط تھے اور ان کے انتظام کے لئے مختلف مدارج کے حکام ہر سال روما سے بھیجے جاتے تھے جن کے ذمے فوجی انتظامات، وصول مالگزاری اور قیام امن وامان وسود لت کے فرائض تھے۔ سلطنت روما کی یہ پالیسی نہ تھی کہ مفتوحین پر ظلم ہو اور اس کے صوبہ دار بھی اکثر ایماندار اور بیدار مغز تھے۔ مگر خدمات کی نوعیت ایسی تھی کہ جبر و تعدی کی تحریص ہوتی۔ صوبجات مفتوحہ میں عہدہ داروں تجار اور ساہوکاروں کو روپیہ پیدا کرنے کا بے مثل موقع تھا۔ اس کی وجہ سے روما میں ساہوکاروں کی ایک زبردست جماعت پیدا ہو گئی جن کی عیش پرستی سے رومیوں میں سادگی کا نام باقی نہ رہا اور جو لوگ کہ خودمختار حکومت سے صوبجات مفتوحہ میں سرشار ہو چکے تھے روما واپس آکر گمنامی میں نہ رہ سکتے تھے۔ روما کی سیاسی اور تمدنی زندگی پر فتوحات کا نہایت ہی مضر اثر پڑا۔ کیونکہ ایک زمانہ میں باشندگان روما کی باوقعت جماعت تھی مگر جب شہریان روما اطالیہ اور صوبجات کے تمام شہروں میں پھیل گئے تو اس مجلس میں صرف ایسے لوگ جمع ہوتے جنھیں کوئی خاص مشغلہ نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی نہ کچھ وقعت ہو سکتی تھی اور نہ وہ اس بات کا دعویٰ کر سکتے تھے کہ ان کی آواز جمہور روما کی آواز ہے۔ مجسٹریٹوں کے فرائض بھی بیشمار ہو گئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ فوجی اور مالی عہدہ داروں کے فرائض کی اب تک تخصیص نہ کی گئی تھی اور مجسٹریٹوں کو فوجوں کی سرکردگی میں دور دراز ممالک میں جانا پڑتا تھا جس سے شہر روما کے انتظامات میں ابتری پھیل رہی تھی۔ ان وجوہ سے دستور روما کا صرف ایک جزو یعنی سینیٹ باکار رہ گیا تھا مگر سینیٹ پر فتوحات کے مخرب اخلاق نتائج کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ دستور روما کے فرسودہ ہو جانے کے علاوہ اہم تمدنی خرابیاں بھی پیدا ہو رہی تھیں جن میں اہم ترین یہ تھی کہ اطالیہ کے کسان جو جیوشِ رومی کی روح رواں تھے اپنی زراعت چھوڑ کر شہر روما میں جوق جوق چلے آتے تھے اور یہ بھی فتوحات روما کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ اطالیہ میں سسلی، کرسکا افریقہ اور مصر کے زرخیز ممالک سے سستا غلہ روما میں کھنچا آرہا تھا جس کی وجہ سے اطالیہ میں غلہ پیدا کرنا بے مصرف ہو گیا۔ اس کے علاوہ اطالیہ میں ایک جدید قسم کی غلامی کا

رواج ہو گیا تھا۔ فتوحات روما کی وجہ سے ہزارہا اسیران جنگ اطالیہ میں لاکر غلام بناکر بیچ ڈالے گئے جو رومی ساہوکاروں کے معاون اور کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ غلاموں سے کام لینے کا نتیجہ اکثر یہ ہوا کرتا ہے کہ آزاد مزدوروں کی قدر جاتی رہتی ہے اور اس کے علاوہ آزاد مزدور غلاموں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات کے باشندوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا اور بجائے زراعت کے مویشی اور بھیڑ پالنے کا رواج ہو گیا۔ مزارعین نے روما میں جاکر پناہ لی جہاں بیکاری اور فاقہ مستی سے ان کی دیہاتی خوبیاں جاتی رہیں۔

روما کی تاریخ میں نہایت ہی نازک موقع تھا۔ سلطنت کی بہتری تو اسی میں تھی کہ خود اراکین سینیٹ میں سے کوئی روشن خیال اور محب وطن شخص اصلاح سلطنت کا بیڑا اٹھاتا۔ مگر سینیٹ کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی اور اس کے اراکین کو سوائے اپنے اور اپنی جماعت کے مفاد کے دوسروں کے نفع و نقصان کی بالکل پروا نہ تھی۔ آخر کار مصرعہ از غیب پدید آید و کارے بکند کا مضمون ہوا اور جمہور روما کے ٹربیونوں میں سے ایک شخص نے ایسی تجویزیں پیش کیں جن سے ایک سو سال تک انقلاب اور تغیرات کا سلسلہ جاری تھا۔ روما کے دوسرے عہدہ داروں کی طرح ٹربیون بھی ایک عضو معطل ہو گئے تھے مگر اصولاً ان کے اقتدارات قائم تھے۔ اس شخص کا نام ٹائی بے ریس گریکس تھا جو سنہ ۱۳۴ کے وسطی ٹربیونوں میں سے ایک تھا۔ گریکس کا تعلق روما کے ایک قدیم اور نہایت ہی معزز خاندان سے تھا اور خاندان کی وجہ سے بھی اسے تعلق تھا۔ گریکس طبعاً انقلاب پسند واقع نہ ہوا تھا بلکہ اسے صرف تمدنی اصلاحات کا خیال تھا یعنی شہریان روما جو اپنے مزارع چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں آکر آباد ہو گئے تھے انہیں پھر دیہات میں آباد کرے اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایک قانون نافذ کرانا چاہتا تھا ہم دیکھ چکے ہیں کہ روما کا اصول یہ تھا کہ اطالیہ کے ہر علاقہ فتح کرنے کے بعد اس نے مفتوحین کی مزارع کا ایک مقررہ حصہ ضبط کر لیا۔ ان زمینوں سے بعض تو اسی وقت فروخت کر دی جاتیں۔ مفتوحہ اضلاع کی زمینیں زیادہ تر سرکاری ملک تصور کی جاتیں اور کاشت پر دیدی جاتیں۔ رفتہ رفتہ زمینداروں نے لگان

دینا موقوف کر دیا کیونکہ زمینات سرکاری کا انتظام سینیٹ سے متعلق تھا اور زمیندار بھی زیادہ تر اسی مجلس کی ارکان کی جماعت میں سے تھے۔ اصولاً زمینات مذکور ہمیشہ سرکاری تصور کی جاتیں مگر عملاً زمینداران کا ان پر پورا قبضہ تھا۔ ٹائی بے ریس گراکس نے یہ تجویز پیش کی کہ سلطنت تمام زمینات پر دوبارہ قبضہ کرے اور ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے روما کے مفلس اور قلاش باشندوں میں تقسیم کر دے۔ اس تقسیم کو عمل میں لانے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا مگر ارکان جائداد نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کیونکہ اس تجویز سے ان کے حقوق محصلہ پر اثر پڑتا تھا۔ گراکس نے دوبارہ ٹریبیون منتخب ہونے کی کوشش کی گو یہ دستور رومی کے خلاف تھا مگر عین انتخاب کے وقت ایک بلوہ ہوا جس میں روما کا یہ غمگسار مارا گیا۔ روما کے شریفوں اور رذیلوں کے تنازعات اس تاریخ تک خونریزی سے پاک تھے مگر تنازع موجودہ کی ابتدا خونریزی سے ہوئی جو نہایت بد شگون تھا۔

ٹائی بے ریس گراکس کا قتل نہ صرف اخلاقی جرم تھا بلکہ ایک سیاسی غلطی بھی تھی۔ جمہور روما میں اس سے سخت ناراضی پھیل گئی اور انہوں نے مقتول ٹائی بے ریس کے بھائی گائیس کو اپنا لیڈر بنا لیا۔ گائیس جو اس وقت سرکاری کام سے روما کے باہر تھا نہایت قابل اور کارآزمودہ تھا ۱۲۳ق م میں روما واپس آیا اور ٹریبیون منتخب کیا گیا۔ اس کا بھائی سچا محب وطن تھا جسے ملک کی بہتری کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا۔ گائیس میں بھی جذبۂ حب وطن جوش زن تھا مگر اس کے ساتھ اسے خیال تھا کہ اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لے اور سینیٹ کی قوت کو توڑ دے جس کے اشارہ سے اس کا بھائی قتل ہوا تھا۔ گائیس نے متعدد اصلاحی تجاویز پیش کیں جس سے دستور روما میں زبردست انقلاب ہو گیا۔ اپنے بھائی کا زرعی قانون اس نے دوبارہ نافذ کرایا اور جنوبی اطالیہ، کورنتھ اور قرطاجنہ میں نو آبادیاں قائم کرائیں جن کو رومیوں نے بے چراغ کر دیا تھا۔ اس نے ایک اور قانون نافذ کیا جس کی رو سے غلہ اہل روما کو نصف قیمت پر دیا جانے لگا کیونکہ روما کے قلاش باشندوں کی دستگیری کرنا ضروری تھا۔ مگر اس کے نتائج سخت مضر ہوئے کیونکہ سستے غلے کے لالچ سے غریب

دیہاتی روما میں جوق جوق آنے لگے اور اس سے ایک خراب رسم کی بنیاد پڑ گئی۔ یعنی جب کوئی جدید سیاسی تحریک جمہور روما کے سامنے پیش کی جاتی تو بطور رشوت غلہ اور سستا کیا جاتا یہاں تک کہ اہل روما کو آخر کار غلہ بالکل مفت ملنے لگا گراکس نے کامیابی کے ساتھ روما کے امراء میں تفرقہ ڈال دیا تھا اور ایک گروہ کو اپنا ہمدرد بنا لیا تھا۔ امراء کے دو گروہ تھے ایک اصل شرفا جن کو سینیٹ کی رکنیت کا حق تھا اور اہم عدالتی مقدمات کا تصفیہ وہی کر سکتے تھے اور دوسرے ساہوکار جن کو روما میں نائٹ کہتے تھے ان کو یہ حقوق حاصل نہ تھے۔ گراکس نے انھیں بھی عدالتی حقوق دلا کر اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ تجاویز کو روبہ عمل میں لانے میں جو طریقہ گراکس نے اختیار کیا وہ بھی قابل غور ہے۔ سینیٹ کو تاریخی روایات کے لحاظ سے جو اقتدارات اور حقوق حاصل تھے اس کی اس نے بالکل پروا نہیں کی بلکہ اس کے برخلاف وہ صرف جمہور روما کو کومرم میں مخاطب کرتا تھا۔

سینیٹ کے اقتدارات پر اس سے قبل کبھی کھلم کھلا حملہ نہیں ہوا تھا پہلی تو گائیس اپنے جملہ مقاصد میں کامیاب ہوا جس کا سبب علاوہ اس کی پر اثر تقاریر کے یہ بھی تھا کہ اس کی تجاویز سے عوام کی مشکلات حل ہو رہی تھیں اور ان کے جذبات برانگیختہ ہوتے تھے۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گائیس دوبارہ ٹریبیون منتخب ہوا مگر اب اسے معلوم ہوا کہ کمیٹیا جس پر اس نے اپنی امیدوں کی بنیاد رکھی تھی کس قدر کمزور تھی یعنی کمیٹیا (جلسۂ عوام) کو قابو میں رکھنا دشوار تھا۔ اس کا ایک رقیب پیدا ہو گیا جس نے عوام کو اس کی طرف سے پھیر دیا اور پھر تیسری مرتبہ گائیس ٹریبیون منتخب نہ ہو سکا۔ اس خدمت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی اس کے مخالفین نے اسے چین نہ لینے دیا اور تجویز پیش کی قرطاجنہ میں جو نو آبادی گائیس نے بسائی تھی اس کو توڑ دیا جائے۔ گائیس کے مویدین کو یہ سخت ناگوار ہوا اور انھوں نے اس کے بھائی کے خون کا انتقام لینے کا قصد کیا۔ اس حد تک پہنچ کر یہ تحریک گائیس کے ہاتھ سے نکل گئی اور شورش پسند لوگوں کا اثر بڑھ گیا۔ لیکن اس جد و جہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ سینیٹ کو پھر غلبہ ہوا اور

گائیس باوجود اپنے دوستوں کی وفاشعاری کے فرار ہونے پر مجبور ہوا اور آخرکار اپنے دشمنوں کے تعاقب سے بچنے کے لیئے خودکشی کرلی۔

اہل استبداد کی کامیابی قطعی تھی اور اراکین سینیٹ پھر اپنی پرانی روش پر چلنے لگے مگر گائیس اور ٹائی بیریس کے ایثار نے زمانے کا رنگ پلٹ دیا تھا۔ غربائے روما کو آخرکار ایسے لیڈر مل گئے تھے جنھوں نے انھیں بتادیا تھا کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیئے کیا کرنا چاہئے اور ان کے دلوں میں اپنے محسنوں کی یاد تازہ تھی جنھوں نے ان کے لیئے اپنی جانیں قربان کردی تھیں اس کے علاوہ اس گروہ کو اپنی طاقت کا احساس تھا اور بہت جلد ان کو اپنی طاقت کے استعمال کا موقع مل گیا۔ مگر جب یہ موقع آیا اس جماعت نے معاملات خارجیہ میں دخل دیکر سینیٹ کی قیمت بالکل توڑدی۔

رومی مقبوضات واقع شمالی افریقہ کے مغرب میں ایک خطہ ملک موسومہ نومیڈیا ہے۔ یہاں سخت مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ رومیوں نے اس ملک کے تخت و تاج کا مالک ایک شخص کو قرار دیا تھا مگر ایک دوسرے شخص جگرتھا نے اس سلطنت پر قبضہ کرلیا اور مجبوراً اس غاصب کو زیر کرنے کے لیئے فوج روانہ کرنی پڑی۔ اس جنگ کی ابتدائی لڑائیوں میں رومیوں کو نہایت ذلت کے ساتھ شکست ہوئی جس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ رومی سپہ سالار نہایت ناقابل تھے اور دوسرے یہ کہ ملک بالکل غیرآباد اور ویران تھا جس کی وجہ سے فوجوں کی نقل و حرکت دشوار تھی۔ میٹلس کے تقرر سے جو امراء روما میں سے تھا صورت حال میں کچھ اصلاح ہوئی، جگرتھا کو شکست ہوئی اور اس کا تعاقب کیا گیا مگر وہ بھاگ نکلا۔ میٹلس کا نائب ایک نوجوان رومی مسمی میریس تھا۔ یہ شخص دیہات کا رہنے والا اور کم حیثیت تھا مگر اس کے حوصلے بلند تھے اس لیئے وہ روما چلا گیا اور انتخاب کانسلی کا دعویدار ہوا تاکہ کانسل ہوکر نومیڈیا جائے اور جنگ کا خاتمہ کرے۔ میریس کا یہ دعوے روایات روما کے خلاف تھا اور اس کے علاوہ اراکین سینیٹ بھی فوجی معاملات میں غیروں کی دخل دہی ناپسند کرتے تھے مگر جمہور روما نے میریس کا ساتھ

دیا اور وہ انتخاب میں کامیاب ہوا۔ میریس نے اب نومیڈیا کا رخ کیا مگر باوجود خفیف کامیابیوں کے جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ آخرکار رومیوں کی خوش قسمتی اور میریس کے نائب سولا کی لاثانی بہادری سے جگرتھا گرفتار ہوا اور اس طرح اس جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

میریس شاداں و فرحاں روما واپس آیا مگر اس جنگ کے ختم ہوتے ہی سلطنت روما پر ایک قہر عظیم نازل ہوا۔ رومیوں نے حال ہی میں غالیہ کا جنوبی حصہ اپنی سلطنت میں ملحق کر لیا تھا۔ اس علاقے میں چند اقوام آباد تھیں جن کو رومی کمبری اور ٹیوٹن کہتے تھے۔ اس قوم کے آدمی بلند قامت تھے ان کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال ہلکے رنگ کے اس قوم کی کوئی حملہ آور فوج نہ تھی بلکہ تمام قوم جدید مساکن کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی بیویاں اور بچے بھی گاڑیوں میں ساتھ رہتے تھے۔ یہ وہی جرمن اقوام ہیں جنھوں نے پانچ سو سال بعد مغرب میں سلطنت روما کو زیر و زبر کر دیا۔ ان اقوام اور روما میں جو ابتدائی مقابلے ہوئے اس میں جمہور روما کی فوجوں کو سخت شکستیں ہوئیں۔ آخری شکست رومیوں کو ۱۰۵ سنہ ق م میں دریائے رون کے قریب ہوئی جس میں رومیوں کے ۱۲۰۰۰۰ آدمی ضائع ہوئے۔ رومیوں کو اندیشہ تھا کہ یہ وحشی اقوام اب اطالیہ کا رخ کریں گی اور ان پر وہی مصیبت نازل ہو گی جو ہنی بال کے حملوں سے ہوئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے وحشیوں کے ٹڈی دل جنوب میں ہسپانیہ کی طرف اور شمال میں دریائے رائن کے دہانے کی طرف چلے گئے اور اٹلی کی طرف انھوں نے ۱۰۳ سنہ ق م میں رخ کیا لیکن اس مدت میں میریس کی فوج مظفر موج نیومی ڈیا فتح کر کے واپس آ گئی تھی اور ان کے مقابلہ کے لئے تیار تھی۔ میریس نے جو اس اثنا میں چار دفعہ کونسل ہو چکا تھا فوج کو اس مہم عظیم کے لئے خوب تیار کر دیا تھا ۱۰۲ سنہ میں وحشی جب پھر واپس آئے انھوں نے اپنی جماعت کے دو ٹکڑے کر دئے ایک جماعت اطالیہ میں کوہ آلپس کے مشرقی دروں میں سے داخل ہوئی اور دوسری رون ندی کی طرف روانہ ہوئی۔ مگر ان کی بہادری اور شجاعت روما کی قواعد داں

افواج کے مقابلہ میں بیکار تھیں اور سنہ ۱۰۲ میں میریس نے ٹیوٹن اقوام کو مقابلہ اکوئے سکیس ٹے سخت نقصان کے ساتھ شکست دی اور دوسرے سال الحالیہ واپس آکر کمبری اقوام کو بھی شکست فاش دی۔ وحشیوں نے اپنی گاڑیوں کے پیچھے کھڑے ہو کر لڑنا شروع کیا ان کی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑتی تھیں اور آخر کار موت کو قید ہونے سے بہتر سمجھ کر ان جانباز عورتوں نے خودکشی کر لی۔ رومیوں کو کامیابی زیادہ تر میریس کے سبب سے ہوئی تھی مگر سولا کے ہمدردوں نے بعد میں دعوےٰ کیا کہ یہ کامیابی سولا کے سبب سے ہوئی تھی جو میریس کا نائب تھا اور سایہ کی طرح ہر جنگ میں اس کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ کامیابی کا سہرا خواہ کسی کے سر ہو اس کی وجہ سے ۴۰۰ سال تک سلطنت روما کو کبھی ایسا زبردست خطرہ درپیش نہیں آیا۔

واقعات مذکورہ بالا کی اہمیت نہ صرف فوجی ہے بلکہ سیاسی بھی ہے میریس کا مسلسل سپہ سالار رہنا دستور روما میں ایک نئی بات ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت سخت خطرہ میں تھی اور مجبوراً ایک ایسا شخص پانچ سال تک سپہ سالار رہا جو سپیو کی طرح طبقۂ امراء میں سے نہ تھا بلکہ عوام میں سے اور انھیں کے ایما سے سینیٹ کی سخت مخالفت کے باوجود برسرکار تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ میریس کی سپہ سالاری سے شہنشاہیت روما کی ابتدا ہوئی ہے یعنی اس زمانہ سے سلطنت روما میں اصل اقتدار کسی نہ کسی فوجی سپہ سالار کے ہاتھ میں رہا ہے اور حکومت دستوری کو کچھ زور اسی زمانہ میں ہوتا جب کہ کوئی ایسا شخص برسر اقتدار نہ ہو۔ میریس کے بعد سولا کا دور دورہ ہوا۔ سولا کے بعد پامپی کا۔ پامپی کے بعد جولیس سیزر رہا جس کے انتقال کے بعد آگسٹس نے شہنشاہیت روما کی بنیاد ڈالی۔

وحشیوں کی ہزیمت کے بعد میریس کا سلطنت روما میں کوئی مد مقابل نہ تھا جس کی وجہ سے وہ کسی سے کمتر رہنا پسند نہ کر سکتا تھا۔ امن وامان قائم ہو جانے کے بعد اس نے میدان سیاست میں قدم رکھا اور جمہور روما کا شریک ہو گیا جن کے دو لیڈروں نے برادران گریکس کی یاد اب تک تازہ رکھی تھی ان دونوں کی شراکت میں اس نے اصلاحی تجاویز پیش کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ عوام کے لئے

سستا غلہ مہیا کیا جائے اور نو آبادیاں ان علاقوں میں بسائی جائیں جنھیں وحشیوں نے ویران کر دیا تھا۔ میریس نے جدید تجاویز کے عمل میں لانے اور نو آبادیوں کی نگرانی اپنے ذمہ لی مگر باوجود اس کی کوشش کے اس کی تجاویز نے عملی صورت اختیار نہ کی جس کی وجہ یہ تھی کہ مثل دوسرے جری سپاہیوں کے اس میں تدبیر مملکت کا مادہ نہ تھا۔ اپنے شرکاء سے وہ لڑ بیٹھا اور سینیٹ کے دام تزویر میں آگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی شروع ہو گئی اور روما میں اس نے سینیٹ کی قوت بحال کر دی۔ میریس کی عظمت کا اب خاتمہ ہو رہا تھا اور آئندہ سے بجائے کامیاب سپہ سالار یا مدبر کے اس کی حیثیت ایک ناکام سازش کرنے والے کی ہو گئی۔ مگر اس کے کارناموں سے تاریخ روما میں ایک زبردست تغیر کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اب روما میں جمہور کی آواز ضعیف ہوتی جاتی ہے اور سپہ سالاروں کی قوت بڑھتی جاتی ہے اور انھیں کی مرضی سے جملہ امور کا تصفیہ ہوتا ہے۔ نظام فوجی میں بھی ایک اہم تغیر ہوا جو قابل ذکر ہے۔ رومی فوجوں میں غربا کو شریک نہیں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے فوجی خدمت باوجود سختی کے تمغۂ شرافت خیال کی جاتی تھی۔ مگر جب میریس نے جنگ نیومیڈیا اور جرمنوں کے حملوں کو مسترد کرنے کے لیے سپاہی بھرتی کرنا شروع کیے تو اسے مجبوراً ہر طبقہ کے لوگوں کو فوج میں لینا پڑا جس کی وجہ سے روما کے غربا کی ایک تعداد کثیر فوج میں بھرتی ہو گئی۔ گویا اس تاریخ سے رومی فوجیں آزاد شہریوں پر مشتمل نہ تھیں بلکہ تنخواہ دار سپاہیوں پر اور ان کو سلطنت روما سے جو تعلق تھا وہ تنخواہ کا تھا نہ کہ حب وطن کا۔ اگر انھیں عقیدتمندی تھی تو اپنے سپہ سالار سے تھی نہ کہ سلطنت روما سے۔ اس تغیر سے فوجی حکومت کے قیام میں آسانی ہوئی اور سپہ سالاروں کا یہ اقتدار بالآخر روما کے زوال کا باعث ہوا۔

باب ستر دہم

سولائے خانہ جنگی اور سینیٹ کا احیاء

سنہ ۱۰۰ ق م کے بعد سلطنت روما بیرونی دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھی مگر سخت اندرونی مشکلات پیدا ہو گئے تھے۔ حلفائے روما کے حقوق کا مسئلہ نہایت وقت طلب تھا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ رومیوں نے جب اطالیہ کے مختلف اضلاع اپنی سلطنت میں ملحق کر لیے تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نہایت شرافت اور فراخدلی کا برتاؤ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانے میں روما کا ساتھ دیا مگر اب ان دونوں اقوام کے تعلقات کشیدہ ہو رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رومی مغرور تھے مگر اپنے حلفاء کے ساتھ ظلم یا سختی نہ کرتے تھے۔ اس کشیدگی کا سبب یہ تھا کہ حلفاء اب اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے کہ انھوں نے سلطنت روما کی اکثر آڑے وقتوں میں مدد کی ہے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ انصاف و مساوات کا برتاؤ ہونا چاہیے حلفاء کے مختلف مدارج تھے مگر لاطینیوں کی حالت سب میں بہتر تھی کیونکہ وہ روما کے ساتھ آزادی کے ساتھ تجارت کر سکتے تھے اور بعض حالتوں میں شہریت روما کے پورے حقوق بھی حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے حلفاء کی حالت ایسی نہ تھی اور ان کے لئے کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے وہ شہریان روما کے ساتھ مساوات کا درجہ حاصل کر سکتے۔ لاطینی اور دوسرے حلفاء زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے اور اپنے اندرونی معاملات خود طے کرتے تھے اور رومی ان میں بہت کم دخل

دیتے تھے۔ غالباً دنیا میں اس زمانے میں مفتوح اقوام سے اس سے بہتر سلوک نہ ہوتا تھا۔ بظاہر ان کے یہ شکایات تھے کہ اثنائے جنگ میں ان پر دہرا بوجھ پڑتا ہے فوجی قانون میں ان کو مرافعہ کا حق نہیں دیا گیا ہے اور رومی حکام اکثر ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آتے ہیں مگر اصل وجہ یہ تھی کہ وہ شہریان روما کے ساتھ مساوات کے خواہشمند تھے جس کے عطا کرنے سے رومیوں کا کوئی نقصان نہ تھا جیسا کہ بعد میں جاکر ثابت ہوا۔ مگر رومیوں کو اپنے حقوق خاص پر ناز تھا اس لئے جب تک کہ حلفاء نے اپنے حقوق کے لئے ہتیار نہ اٹھائے رومیوں کو عقل نہ آئی اور آخرکار کشت وخون کے بعد مجبوراً وہی حقوق حلفاء کو دینا پڑے جو انھیں خود حاصل تھے۔

برادران گراکس اور سیرلیس نے (۱۰۰ ق م میں) اس مسئلہ کو چھیڑا تھا اور پھر سنہ ۹۱ ق م میں مارکس لیوس ڈروزس نے جو ایک پرجوش اور بڑا نوشت امیر تھا اطالیوں کی حق تلفیوں کی طرف رومیوں کو متوجہ کیا۔ ڈروزس سنہ ۹۱ ق م میں ٹریبیون منتخب ہوا اور اس نے اصلاح کی سفارش نہ صرف اطالیوں کی دادرسی بلکہ خود سینیٹ کے نفع کے لئے کی۔ کئی خفیف اصلاحات کے نفاذ میں اسے کامیابی ہوئی مگر تمام اقوام اطالیہ کو حقوق مساوات دینے کی تحریک پیش کرتے ہی رومیوں کی آتش غضب مشتعل ہوگئی اور اسی سال ڈروزس قتل کیا گیا۔

ڈروزس کے قتل ہوتے ہی خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کے سبب سے روما کی حالت حد درجہ نازک ہوگئی کیونکہ اس وقت اس کے مدمقابل وحشی یا قرطاجنی نہ تھے بلکہ خود اسی کے قواعد داں سپاہی اور تجربہ کار افسر۔ اس جنگ کے حالات وضاحت کے ساتھ معلوم نہیں۔ جانبین کی طرف سے سخت مظالم ہوئے اور کئی علاقے ویران ہوگئے۔ نہ کوئی بڑی یا فیصلہ کن جنگ ہوئی مگر ایک سال کے بعد رومیوں نے محسوس کر لیا کہ اس جنگ کا خاتمہ تلوار کے زور سے نہ ہوگا اس لئے مجبوراً صلح وآشتی سے کام لیا گیا اور آخرکار اسی طرز عمل پر کاربند ہوئے جس پر ایک سال قبل عمل پیرا ہونے سے جنگ کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ سنہ ۸۹ ق م

میں رومیوں نے اعلان کیا کہ باغی حلفاء میں سے جو ساٹھ دن کے اندر اطاعت قبول کر لیں انھیں شہریان روما کے حقوق دیے جائینگے جس کا نتیجہ خاطر خواہ ہوا کیونکہ اسی حق کے حصول کے لیئے حلفاء لڑ رہے تھے اور سب نے ہتھیار ڈالدیئے۔ صرف پہاڑی علاقوں میں چند جتھے باقی رہ گئے۔

حلفاء کی بغاوت کے بعد رومی ایک دوسری مشکل میں پھنس گئے۔ اس زمانہ کی تاریخ سخت تاریکی میں چھپی ہوئی ہے اور جن تحریکات کا اس زمانہ میں آغاز ہوا ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا دشوار ہے مگر قیاس یہ ہے کہ ان میں پارٹی اسپرٹ (گروہ بندی) کا سخت زور ہو گیا تھا جس کی وجہ سے سلطنت کی ہستی معرض خطر میں آگئی۔ اس کے علاوہ علاقہ پونٹس واقع ایشیائے کوچک کے بادشاہ نے رومیوں کے خلاف سر اٹھایا تھا۔ یہ شخص باوجود وحشی ہونے کے قابل تھا اور یونانیوں کے طور طریقے اختیار کر لئے تھے۔ رومیوں کو اطالیہ میں مصروف دیکھکر اور یہ معلوم کر کے کہ ایشیائے کوچک کی رعایا رومی عہدہ داران مالگزاری کی دار و گیر سے سخت نالاں ہیں فوراً اس صوبہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا جس سے رومی مقبوضات مشرق کی بنیاد گویا ہل گئی۔ متھری ڈیٹس کی فوجیں یونان اور ایتھنز میں پہنچ گئیں جہاں ان کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔ رومیوں نے محسوس کیا کہ ان کی سلطنت کو مشرق میں دوبارہ قائم کرنے کے لیئے ایک زیرک اور مستقل مزاج آدمی کی ضرورت تھی۔ مگر ایسے شخص کا تقرر دشوار تھا کیونکہ مختلف گروہوں میں سخت باہمی مخالفت تھی۔ باوجود ہمت کے رومیوں کا خیال تھا کہ دوبارہ اقتدار جمانے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔ اور بصورت فتح سپہ سالار کی عظمت بہت بڑھ جائیگی اور اس کو اور اسکے سپاہیوں کو مال غنیمت بے شمار ملیگا۔ اس عہدہ کے دو دعویدار تھے اصولاً تو یہ خدمت سولا کو ملنی چاہیے تھی جو سال ماقبل ہی کانسل تھا مگر جمہور روما کی خواہش تھی کہ میریس کا تقرر ہو اور ان کو یہ بھی امید تھی کہ اگر حلفاء کے ساتھ مزید مراعات کی جائیں تو وہ بھی ان کے ہم نوا ہو جائینگے۔ لیکن یہ مسئلہ ایسا نہ تھا جو بحث و مباحثہ سے طے ہوتا اور آخر کار جنگ و جدال کی نوبت آگئی۔ میریس کی قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

سولا روما کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ روما کی تاریخ میں پہلی مثال ہے کہ روما کے کسی شہری نے روما پر قبضہ کر لیا ہو۔ میریس اپنی جان لیکر بھاگ کھڑا ہوا اور سولا نہ صرف روما یا اطالیہ بلکہ تمام شہنشاہی روما کا مالک بن بیٹھا۔ لیکن یہ امر بدیہی تھا کہ اگر اس کی فوجیں اطالیہ سے ہٹ جائیں تو وہاں پھر سخت بدامنی پھیل جاتی۔ مگر یا تو مشرق میں جنگ کا رخ رومیوں کے خلاف تھا یا وہاں زیادہ نفع کی امید تھی اس لئے سولا روما میں قیام امن کے لئے سرسری انتظام کرکے اپنی فوج لے کر یونان پہنچا اور ثابت کر دیا کہ متھریڈیٹس کی فتوحات محض اتفاقی تھیں اور اس کی فوج روما کے قواعد داں اور سکھائے ہوئے سپاہیوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ ان کی کمان ایک لائق سپہ سالار کے ہاتھ میں ہو۔ بادشاہ مذکور کی افواج کو دو دفعہ ایشیا میں سخت شکست ہوئی اور اہل ایتھنز نے بھی ایک طویل محاصرہ کے بعد اطاعت قبول کی۔ اس کے بعد سولا نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور متھریڈیٹس نے بذریعہ مجبوری صلح کی درخواست کی اور تمام رومی مقبوضات کا تخلیہ کر دیا۔ سولا ان محاربات میں ۸۷ سے ۸۳ ق م تک مصروف تھا۔ اس اثناء میں روما اور اطالیہ میں پھر اس کے دشمنوں کا غلبہ ہو گیا۔ میریس جلاوطنی سے واپس آگیا تھا اس کے دل میں جوش انتقام موجزن تھا اس لئے اس نے کنا کو اپنا شریک کر لیا جو جمہوریہ روما کا سرکردہ تھا ان لوگوں نے روما پر قبضہ کر لیا۔ اپنے دشمنوں کو قتل کر ڈالا اور چند روز کے لئے سینٹ کو بے دست و پا کر دیا۔ ۸۶ ق م میں میریس نے انتقال کیا اور روما میں کنا کا طوطی بولنے لگا مگر ظاہر تھا کہ ایک نہ ایک دن ظفریاب سولا مشرق سے واپس آئیگا اور جو بدلہ وہ اپنے دشمنوں سے لیگا وہ میریس کے انتقام سے سخت تر ہوگا۔ اس زمانہ میں کنا کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ کس طرح سولا کا مقابلہ کیا جائے اس لئے اس نے ایک فوج تیار کی اور یونان کے قصد سے روانہ ہوا کہ افواج کی کمان بزور شمشیر سولا سے چھین لے مگر اس کے سپاہی اس سے بددل ہو گئے تھے انھوں نے اس کو برنڈسی میں قتل کر دیا تھا۔ سولا ۸۳ ق م میں اطالیہ واپس آیا مگر جمہوریہ روما اس سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جا بجا مابین میں جنگ ہوئی مگر سولا نے بآسانی اپنے دشمنوں کو زیر کر لیا

اور روما پر قبضہ کر کے سامانیوں کی آخری بغاوت فرو کر دی اپنے حریفوں کے ساتھ وہ نہایت بیرحمی کے ساتھ پیش آیا جس سے میریس اور لنا کے مظالم لوگ بھول گئے اور سلطنت روما پر جو جابرانہ حکومت اس نے کی وہ عرصہ تک رومی فراموش نہ کر سکے۔

مگر باوجود اس بیرحمی کے سولا بڑے پایہ کا مدبر تھا اور سلطنت روما کے آئندہ انتظام کے لئے قطعی رائے اس نے قائم کر لی تھی۔ اس کا منشا تھا کہ سینیٹ کے اقتدارات پھر بحال کئے جائیں تاکہ جمہور روما پھر سر نہ اٹھا سکیں اور نہ میریس کی طرح کوئی فوجی سردار دستور روما کو زیر و زبر کر سکے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس نے تین اہم فرائض سینیٹ کے سپرد کر دیئے یعنی وضع قوانین، معدلت اور سلطنت کی عام پالیسی۔ اور سینیٹ کو مزید تقویت دینے کے لئے اس نے ٹربیونس کے اقتدارات کو ضعیف کرنا شروع کیا کیونکہ انھیں عہدہ داروں کے ذریعہ سے جمہور روما نے اپنے مقاصد حاصل کئے تھے اس لئے اس نے قاعدہ مقرر کرا دیا کہ جو شخص اس خدمت کو قبول کرے وہ کسی اعلیٰ خدمت کا مستحق نہیں ہو سکتا اور اس کے علاوہ ہر ٹربیون پر لازمی کر دیا گیا کہ ہر سال کے ختم پر اپنی کارگزاری ثابت کرے۔ یہی ایک خدمت تھی جس کے ذریعہ سے بلند حوصلہ افراد کے لئے ممکن تھا کہ سیاسی اقتدار حاصل کریں سولا نے جو قواعد وضع کئے ان کے نفاذ کے بعد اولوالعزم اشخاص کو خدمت ٹربیونی سے کوئی رغبت باقی نہ رہی کیونکہ ایک تو اس سے کوئی بڑا اقتدار نہ ہوتا اور دوسرے آئندہ کسی بڑی خدمت کے ملنے کی امید نہ رہتی۔ گویا جمہور روما سے وہ ہتیار چھین لیا گیا جس کے ذریعہ سے انھوں نے اس قدر سیاسی اور تمدنی ترقی کی تھی۔ سولا نے کامیاب سپہ سالاروں کے غصب سلطنت کو بھی دشوار کر دیا اور قاعدہ مقرر کرا دیا کہ جس شخص کو فوجی خدمات کی خواہش ہو وہ پہلے چھوٹی خدمتوں سے شروع کرے اور درجہ بدرجہ سپہ سالاری تک ترقی کرے اور اسی خدمت پر دوبارہ مقرر ہونے کے لئے بھی ایک وقفہ مقرر کیا گیا جس کا اصل منشا یہ تھا کہ میریس کی طرح کوئی شخص طویل عرصہ تک سپہ سالار رہکر سلطنت پر قبضہ نہ کرے کسی گمنام شخص کا خدمت کاسلی پر تقرر نہ ہو سکے اور وہ سالہا سال تک سپہ سالار افواج نہ رہے۔ خدمت ٹربیون کی

تذلیل سے سولا نے مجالس عوام کو ضعیف کر دیا۔ اور اولوالعزم اشخاص کے زور پکڑنے کو بھی اس نے قواعد مذکورہ کے نفاذ سے ناممکن کر دیا جس سے سینیٹ کا اب کوئی مد مقابل نہ رہا۔ انصرام امور سلطنت اور وضع قوانین پر اس کی پوری نگرانی تھی اور عدالتیں بھی اس کی نگرانی میں کر دی گئیں جس سے گائیس گراکس کی اصلاحات گویا کالعدم ہو گئیں۔ ان تدابیر کے عمل میں لانے سے سولا کا منشا تھا کہ جمہور کی ترقی روک دے اور روما میں اسی قسم کی حکومت قائم کرا دے جو جنگ ہائے قرطاجنہ کے زمانہ میں تھی۔ اس کی تدابیر بے سود ثابت ہوئیں مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔ اگر سینیٹ میں اصلاح پذیری کا مادہ باقی ہوتا تو سولا کی اصلاحات اس کے مرض کی دوا بن سکتیں مگر جن وجوہ سے سینیٹ کے اقتدارات ضعیف ہو رہے تھے ان کی طرف سولا کو توجہ نہ تھی اور وہ صرف بیرونی اثرات رفع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی نوک قلم سے سینیٹ کا عظمت و اقتدار دوبارہ قائم کرے کیونکہ اس کے ارکین کے خصائل ناپسندیدہ ہو گئے تھے۔ سپہ سالاروں کے اقتدارات کم کرنے کی جو کوشش سولا نے کی وہ بھی بے سود ثابت ہوئی۔ روما ایسی عظیم الشان اور غدار سلطنت میں ایسے سپہ سالاروں کا ہونا ضروری تھا اور ظاہر ہے کہ جب کسی فرد واحد کے ہاتھ میں ایسے غیر معمولی اقتدارات آ جائیں تو جلد ان سے سبکدوش ہونا پسند نہ کرے گا۔

سولا کی اصلاحات دیرپا ثابت نہ ہوئیں کیونکہ یہ تدریجی نہ تھیں بلکہ بزور شمشیر عمل میں لائی گئی تھیں اور بزور شمشیر کالعدم کر دی گئیں۔ ۷۹ ق م میں اس نے انتقال کیا۔ اس کے مرتے ہی اس کا قائم کردہ دستور زیر و زبر ہو گیا اور سلطنت میں بدامنی پھیلنے لگی ہسپانیہ میں میریس کی پارٹی کو ایک نیا اور قابل لیڈر مل گیا جس کا نام سرٹوریس تھا اور سینیٹ کی افواج کو اس کے زیر کرنے میں پہلے پہل سخت ناکامی ہوئی مشرق میں بھی سولا کی آنکھیں بند ہوتے ہی متھریڈیٹس کی افواج نے پھر سر اٹھایا اور ایشیائے کوچک کے زرخیز علاقوں اور غدار شہروں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی خطرات تھے

جن کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ سلطنت روما تہ و بالا ہو جائیگی۔ بحیرۂ روم اور خصوصاً اس کے مشرقی حصہ میں بحری ڈاکوؤں نے لوٹ مار مچانی شروع کر دی اور ان کا مقابلہ کرنے کی کسی کو جرات نہ تھی۔ سمندر ہی میں وہ جہازوں کو لوٹ لیا کرتے۔ اطالیہ کے سواحل پر اتر کر لوٹ مار کرتے تھے بلکہ جو لوگ جمہوریت روما کی حفاظت میں ہوتے تھے ان کو اور بھی لوٹتے تھے۔ خود اطالیہ میں غلاموں کی ایک خوفناک شورش پیدا ہوگئی تھی۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ ہائے قرطاجنہ کے بعد غلاموں کی تعداد میں اضافہ کثیر ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس ملک میں غلامی کا رواج ہو وہاں کے تمدن کی بنیاد نہایت متزلزل ہوتی ہے۔ ۷۳ ق م میں چند غلام جو شیروں سے کشتی لڑنے کے لیے سکھائے جا رہے تھے اپنے قید خانے سے نکل بھاگے اور بہت جلد ان کے گرد دوسرے غلام بھی تعداد کثیر میں جمع ہو گئے۔ ان کا سرگروہ ایک تھریسی سردار اسپارٹکس تھا جس میں علاوہ قابلیت کے ان وحشی غلاموں کو منضبط رکھنے کی صلاحیت بھی تھی۔ اطالیہ میں ہر جگہ بڑے بڑے قید خانے تھے جہاں غلام رکھے جاتے تھے اور ان سے زراعت کا کام لیا جاتا تھا۔ اسپارٹکس کی جماعتوں نے ہر جگہ ان قید خانوں کے دروازے کھول دیے اور آزاد شدہ غلام جوق جوق ان کے شریک ہو گئے۔ ان کو انتقام اور تاخت و تاراج کا خوب موقع ملا بلکہ یہ بھی قیاس ہوتا تھا کہ ان کا سر کرنا دشوار ہوگا۔ رومی سپاہ جو ان کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی اس کو ابتداءً شکست ہوئی۔ جنوبی اطالیہ ان غلاموں کی فوج کے قبضہ میں تھا اور صرف محصور شہر ان کی دست درازی سے محفوظ تھے۔ زراعت پیشہ لوگوں کو ان کے ہاتھوں سخت اور ناگفتہ بہ تکالیف پہنچیں۔

اس پرآشوب زمانہ میں سولا نے غضب اقتدارات کے متعلق جو قیود نافذ کی تھیں ان کا قائم رہنا دشوار تھا۔ ایک نوجوان فوجی سردار مسمی پامپی ہسپانیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا اور ۷۱ ق م میں ایک طویل اور پریشان کن جنگ کے بعد واپس آیا۔ غلاموں کی بغاوت بھی اس اثناء میں کراسس نے فرو کر دی تھی جو ایک سربرآوردہ رومی تھا اور اپنے زمانہ کا سب سے دولتمند آدمی تھا۔ کراسس اور پامپی نے مطالبہ کیا کہ ۷۰ ق م میں ان کو کانسل منتخب

کیا جائے اور ان کی فتوحات کے صلے میں ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ ان کے مطالبات سولا کی تجاویز کے منافی تھے مگر انکار دشوار تھا کانسل مقرر ہوتے ہی ان کامیاب سرداروں نے سولا کے قائم کردہ دستور کو تہ و بالا کر دیا۔ کیونکہ اراکین سینیٹ میں بھی اس دستور کے حامی بہت کم تھے اور ٹریبیون کے اقتدارات کی بحالی سے اس کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ جمہور روما کو پھر وضع قوانین اور جملہ امور سلطنت پر اقتدار حاصل ہو گیا اور سولا نے جو قیود ان کی ترقی میں حائل کر دی تھیں دفع ہو گئیں۔

سیاسیات روما کا رخ اس وقت یہ تھا کہ تمام اقتدارات سلطنت کسی فرد واحد کو حاصل ہو جائیں یعنی سلطنت شاہی کسی نہ کسی صورت میں قائم ہو جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری تدبیر ممکن نہ تھی۔ چونکہ نیابت کے طریقہ کا ابھی رواج نہیں ہوا تھا اس لئے سلطنت روما کسی غدار سلطنت میں جمہوریت کا فروغ ہونا ناممکن تھا۔ سینیٹ پر جمہور کو بالکل اعتماد نہ تھا کیونکہ اس کے اراکین صرف اپنے خاص طبقہ کی نیابت کرتے تھے اور جمہور روما کسی فرد واحد کو اپنا اصلی نائب تصور کرتے تھے جسے وہ برسر اقتدار کرتے۔

ہسپانیہ کی بغاوت فرو ہو گئی اور باغی غلاموں کے گروہ نیست و نابود کر دیئے گئے۔ مگر اب بھی مزید خطرات درپیش تھے۔ بحری قزاق اطالیہ کے سواحل پر غارتگری کر رہے تھے۔ جس کے سبب سے غلہ بیحد مہنگا ہو گیا تھا۔ مشرق میں ایک رومی فوج سپہ سالار لیوکلس کی ماتحتی میں متھریڈیٹس کو شکست دے کر آرمینیا کے پہاڑوں میں پہنچ گئی تھی مگر یہ کامیابی دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور پھر وہی روز اول کا مضمون تھا۔ رومیوں میں اس وقت پامپی کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہ تھا جو ان کو اس مصیبت سے نجات دلا سکتا کیونکہ اب تک وہ چھ مہمات میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جمہور روما بھی اس کے گرویدہ تھے کیونکہ اس نے ٹریبیون کے اختیارات بحال کر دیئے تھے اور اراکین سینیٹ اور امرا روما بھی اس سے ناراض نہ تھے۔ سنہ ۶۷ ق م میں گیبینیس (ٹریبیون) نے اپنے بحال شدہ اختیارات عمل میں لا کر تحریک کی کہ پامپی کو بحری قزاقوں کا قلع قمع

کرنے کے لئے روانہ کیا جائے، تمام افواج بری و بحری اس کے تحت میں کر دی جائیں اور سلطنت روما کے تمام ذرائع اس کے سپرد کیے جائیں۔ اس تحریک کی کسی قسم کی مخالفت نہیں ہوئی اور پامپی نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ اس پر اعتماد بجا کیا گیا تھا۔ صرف معقول انتظام کی ضرورت تھی اور پامپی میں انتظام کا خاص مادہ تھا۔ پامپی نے قزاقوں کا تعاقب کیا اور جب وہ اپنے مساکن واقع کریٹ اور سلیشیا میں پہنچ گئے وہاں ان کا قلع قمع کر دیا گیا مگر اس فتح کے بعد اس نے مفتوحین کے ساتھ رحمدلی کا برتاؤ کیا۔ قزاقوں کی بیخکنی سے سمندر میں پھر امن قائم ہو گیا اور روما میں غلہ سستا ہو گیا۔ متھریڈیٹس کی بیخ کنی ابھی باقی تھی جو ایشیائے کوچک پر قبضہ کیے ہوئے تھا اور رومیوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ اسلئے ایک دوسرے ٹریبیون (منیلیس) نے تحریک کی تسخیر اضلاع شرق کے لئے پامپی کو غیر محدود اقتدارات بلا تعین وقت عطا کئے جائیں۔ مگر یہ تحریک آسانی کے ساتھ قبول نہیں ہوئی۔ اکثر لوگوں کو اندیشہ ہوا کہ دستور جمہوری کا خاتمہ ہو رہا ہے اور بعض اراکین سینٹ نے علانیہ کہہ دیا کہ سلطنت جدید قائم ہو رہی ہے مگر اس تحریک کو قبول کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ سنہ ۶۶ ق م میں پامپی اس جدید مہم کو سر کرنے کیلئے روانہ ہوا۔ مگر یہ مہم نہایت آسان ثابت ہوئی۔ صرف انتظام کی ضرورت تھی نہ کہ کسی خاص فوجی قابلیت کی۔ متھریڈیٹس شکست کھا کر کریمیا کی طرف بھاگا اور وہیں مر گیا۔ اس کے بعد پامپی ایشیائے کوچک سے ہوتا ہوا شام میں پہنچا جہاں طوائف الملکی پھیلی ہوئی تھی۔ سکندر اعظم کے سپہ سالاروں کی اولاد اس کی زرخیز وادیوں اور غدار شہروں پر برائے نام قابض تھی مگر ملک شام اور اس کے بڑے بڑے شہر مثلاً انطاکیہ و دمشق شاہ آرمینیا کے قبضہ میں آ گئے تھے اور جنوب میں یہودی بھی قریب قریب خود مختار تھے۔ گویا شام اس وقت ایک پختہ پھل تھا جسے صرف توڑنے کی ضرورت تھی۔ پامپی نے ملک شام کو ایک رومی صوبہ قرار دیا اور اپنی واپسی سے قبل تمام اقطاع شرق کا انتظام مناسب کر دیا۔ ملک شام کے علاوہ قدیم صوبجات بتھی نیا و سلیسیا کا انتظام بھی اس نے درست کیا اور بہت سے شہر

اور جدید سلطنتیں قائم کی گئیں تاکہ ایشیائے کوچک میں امن قائم رہے اور دریائے فرات کی طرف رومی سرحد محفوظ رہے۔ پامپی کے انتظامات نہایت اہم تھے اور جب تک رومیوں کا اقتدار مشرق میں قائم تھا ان کا اثر باقی تھا۔ ۶۲ ق م میں اس نے روما کی طرف کوچ کیا۔ اسے امید تھی کہ اس کا نہایت شاندار استقبال ہوگا مگر جب وہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ سخت ابتری پھیلی ہوئی ہے جس کے اسباب آئندہ باب میں بیان کئے جائینگے۔

باب چہاردہم

قیصر

جمہوریت روما اب عالم نزع میں ہے اور اس کی آزادی کا خاتمہ اس کے فتحمند فوجی سرداروں کی تلواروں سے ہو رہا ہے۔ سینیٹ اور کیٹیا اور عہدہ داران دستوری کے اقتدارات بحال کرنے کے لئے بھی کبھی کبھی کوشش ہوتی ہے مگر ان کا بارآور ہونا محال ہے۔ فوجی حکومت کے قیام کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور آئندہ چار سو سال تک حکومت خود اختیاری روز بروز ضعیف ہوتی جاتی ہے اور اس کے بجائے شخصی حکومت قائم ہو جاتی ہے جس کا دارومدار افواج کی وفاداری پر ہے۔

پامپی کے اطالیہ واپس ہونے سے قبل روما میں ایک سخت بغاوت ہو گئی جس کا سرگردہ کیٹالین تھا۔ اس بغاوت کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ مورخین کو اس کے اسباب و مقاصد کے متعلق اختلاف ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس زمانے کے مدبرین میں سے کون کون اس میں شریک تھے۔ مگر ہمارے نقطۂ خیال سے اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں کیونکہ رفتار زمانہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ روما میں فتنہ و فساد کے مختلف عناصر موجود تھے۔ غربا اپنے افلاس سے پریشان تھے اور سینیٹ سے بیزار اور انھیں وجوہ سے سیاسی اور تمدنی اصلاحات کے منتظر رہتے تھے۔ امرائے روما نے بھی اس ابتری کے زمانہ میں بہت تکالیف اٹھائی تھیں اور ان میں سے اکثر عیاشی اسراف

وغیرہ کی بدولت تباہ ہو چکے تھے۔ کیا ٹی لین بھی انھیں امرا میں سے تھا۔ اس کے علاوہ یہ اندیشہ بھی تھا کہ جب پامپی واپس آئیگا تو سولا کا طرز عمل اختیار کرے گا یا کم از کم اپنے لئے مطلق العنان حکومت کا اور اپنے سپاہیوں کے لئے زمینوں کا طلبگار ہوگا اور اس کے مطالبات بغیر قتل، اخراج اور عام ابتری کے پورے نہ ہونگے۔ اس بغاوت کی اصلیت سمجھنے میں دقت یہ واقع ہوتی ہے کہ باغیوں میں مختلف گروہوں کے لوگ تھے۔ بعض تو صرف سیاسی اصلاح اور جمہور کے اقتدارات کی بحالی چاہتے تھے۔ بعض ایک فوج قائم کرنا چاہتے تھے جو پامپی کی فوج کا مقابلہ کر سکے اور بعض صرف یہ چاہتے تھے کہ بدامنی پھیل جائے اور ان کو لوٹ مار اور غارتگری کا موقع ملے۔ کیا ٹی لین نے ابتدا میں دستوری ذرائع اختیار کئے اور تین دفعہ اس نے کانسل کے انتخاب کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ان ذرائع سے وہ برسر اقتدار نہیں ہو سکتا تو اس نے ابتری پھیلانے کی کوشش کی اور بگڑے دل مگر تجربہ کار سپاہیوں کی فوج اس نے اٹروریا میں جمع کرلی اور کمان خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو روما میں چھوڑ دیا کہ موقع پاکر شہر میں آگ لگا دیں اور جب ابتری پھیل جائے قبضہ قائم کرلیں۔ مگر اس زمانہ میں سسرو کانسل تھا۔ اس کے جاسوسوں نے باغیوں کے منصوبوں کی اسے اطلاع دیدی اور اس نے ایسا انتظام کیا کہ باغیوں کے منصوبے خاک میں مل گئے اور گرفتار ہو کر سب قتل کر دیے گئے۔ کیا ٹی لین کی فوج کو بھی فیسلے میں شکست ہوئی اور وہ خود بھی مارا گیا۔

روما میں اس وقت بہت سے مشاہیر موجود تھے۔ ان میں سے بعض سر برآوردہ اشخاص کے حالات بیان کئے جاتے ہیں جس سے اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہوگا۔ سسرو کا ذکر آچکا ہے۔ یہ شخص ایک معمولی خاندان سے تھا اور دیہات میں پیدا ہوا تھا۔ فن سپہگری سے اس کو مناسبت نہ تھی اس لئے اس نے پیشہ وکالت اختیار کیا کیونکہ سپہگری کے علاوہ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے روما میں کوئی شخص شہرت و نام آوری حاصل کر سکتا۔ روما کا سب سے بڑا مقرر ہونے

کی وجہ سے اس کا نام اب تک زندہ ہے اور اپنے زمانے اور زمانۂ مابعد پر اس کی تحریروں اور تقریروں کا ایسا بیّن اثر پڑا کہ زبان لاطینی اس کے اثر سے اب بھی خالی نہیں۔ فلسفے میں اسے کوئی رتبہ حاصل نہیں مگر ادبیات یونان میں اسے خاص مہارت تھی اور اس نے بہت سی یونانی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ سیاسیات میں اس کا رجحان قدامت پسندی کی طرف تھا اور اس کی خواہش یہ تھی کہ روما کے دونوں ذی ثروت طبقوں یعنی امرا جن میں سے اراکین سینیٹ منتخب ہوتے تھے اور طبقۂ ساہوکاران آپس میں متحد ہو کر بدامنی، ابتری اور انقلابات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔ ایک حد تک اسے کامیابی بھی ہوئی اور اس نے ایک بغاوت فرو کر دی مگر چونکہ فوج اور اس کے سرداروں کے مقابلہ میں انسانیت، جمہوری روایات اور خوبی تقریر کی کوئی وقعت نہ تھی اس لئے اس فرد زمانہ ادیب کو اس کی سیاسی تدبیروں میں بالآخر ناکامی ہوئی۔

کیٹو ثانی بھی سیاسیات میں سسرو کا ہم خیال تھا مگر بالکل دوسری قماش کا آدمی تھا۔ یہ شخص کیٹو (جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے) کا پوتا تھا اور ہر بات میں اس کا نقلچہ تھا۔ اپنے دادا کی طرح یہ بھی زمانہ کی روش سے نالاں تھا۔ اسے ہمیشہ یہ رونا تھا کہ گزشتہ روایات کا احترام و ادب گھٹتا جاتا ہے، عیش پھیلتا جاتا ہے، عہدہ داران سرکاری میں رشوت کی گرم بازاری ہے، سینیٹ روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے اور عام رعایا ناہموار ہو گئی ہے۔ اخلاقی جرأت کی اس میں کمی نہ تھی اس لئے جس بات کو وہ اپنے اصول کے خلاف خیال کرتا اس کے خلاف صدائے احتجاج بلا لحاظ موقع و محل بلند کرتا اور خود بھی نہایت سادہ اور ایمانداری کی زندگی بسر کرتا۔ مگر اس میں کمی تھی تو عقل سلیم اور معاملہ فہمی کی۔ اس کے مداح بھی تھے مگر تمام زمانہ اس کا مذاق اڑاتا اور کسی نے اس کی تقلید نہ کی۔ مگر زمانہ مابعد کے مبصرین کا خیال ہے کہ حامیان جمہوریت میں سے یہ آخر تھا اور اس کی تعلیم روما کے ابتدائی شہنشاہوں کے لئے سد راہ تھی۔

کراسس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے دولت مند ساہوکار تھا اور دیگر ذرائع سے اس نے کثیر مال و متاع جمع کر لیا تھا۔

سپہگری اور سیاسیات میں بھی اس کو دخل تھا مگر دولت ہی کے سبب سے زیادہ تر اس کی قدر و منزلت تھی اور ہر سیاسی گروہ اس کو شریک کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ جولیس سیزر سے اس کو خاص تعلق تھا اور ابتدائی زمانے میں اس نے سیزر کی بہت کچھ امداد بھی کی تھی۔ سیزر سنہ ۱۰۲ ق م میں پیدا ہوا اور خاندانی تعلقات کے لحاظ سے وہ جمہور کا طرفدار تھا۔ لیکن اس زمانے تک اس نے نہ اپنی قابلیت کا ثبوت دیا تھا نہ اس کے حوصلوں سے عوام کو آگاہی ہوئی تھی۔ اگر اس میں کوئی خصوصیت تھی تو یہ تھی کہ ہمیشہ لباس فاخرہ زیب تن کیا کرتا اور اپنے اسراف اور دریا دلی کے سبب سے دلدادگان فیشن میں اس کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ ماریس کا خاص حامی تھا جس زمانے میں کہ ماریس کی حمایت کرنا سخت خطرناک تھا۔ خوش تقریر بھی تھا گو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اس کو سسرو سے کوئی نسبت نہ تھی مگر اپنے مضمون کو توضیح کے ساتھ بیان کرنے اور اپنے سامعین کو گرویدہ کر لینے کا اس میں خاص مادہ تھا۔ سیزر اور کراسس کو کیٹلین سے بھی کچھ تعلق تھا مگر ابتری پھیلانے میں انھوں نے اسے کوئی مدد نہیں دی تھی۔ اس لئے اس کے زوال سے ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

پامپی سنہ ۶۲ میں واپس ہوا اور اس نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ رومیوں کو اس سے جو اندیشہ تھا وہ بے سر و پا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے حوصلے بلند تھے مگر انقلاب پسندی اس کے خمیر میں نہ تھی۔ اسے گمان غالب تھا کہ دستوری ذرائع سے اس کی امیدیں اور حوصلے پورے ہو جائینگے۔ اس لئے برنڈزی میں اترتے ہی اس نے حسب قاعدہ اپنی فوج کی کمر کھلوا دی اور اس امید میں رہا کہ اس کے سطوت و جبروت کی وجہ سے سینیٹ مجبور ہوگی کہ شرق میں جو انتظامات اس نے کئے تھے انھیں منظور کرے اور اس کے سپاہیوں کو بطور انعام زمینیں عطا کرے۔ مگر اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ کیٹالین کی بغاوت فرو کرنے میں سینیٹ کو جو کامیابی ہوئی تھی اس سے سینیٹ کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ اس لئے اس کے ارکین نے پامپی کے بعض مطالبات کو بالکل رد کر دیا اور بعض کے متعلق فیصلہ کیا کہ ان پر بعد کو غور کیا جائیگا۔ شرق میں اسکے اختیارات شہنشاہوں سے

زیادہ تھے اور اب روما میں اگر محض ایک معمولی آدمی ہو گیا جبکہ اہلِ سینیٹ شہر چھوڑ گئے تھے اس لئے اس نے اپنے حامی اور مددگار تلاش کرنے شروع کئے تاکہ وہ سینیٹ کی قوت کو توڑ سکے۔ سیزر، کراسس اور جمہوری جماعت کے لوگ اس کے طرفدار ہو گئے کیٹی لین کی بغاوت فرو ہو جانے کے بعد سیزر ہسپانیہ کو سپہ سالار بنا کر بھیجدیا گیا تھا مگر اب واپس آگیا تھا اور سینیٹ کا وہ بھی مخالف تھا۔ اس لئے تینوں زبردست اشخاص نے ایک دوسرے کی حمایت کا بیڑا اٹھایا جن میں سے ہر ایک میں ایک نہ ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ پامپی کے کارنامے شہرۂ آفاق تھے کراسس کے پاس بے شمار دولت تھی جس کے بغیر کوئی فوجی کارروائی نہ ہو سکتی تھی اور سیزر کا اثر فوج اور جمہور پر غالب تھا۔ ان کا مقابلہ کرنے سے مجبور تھی۔ اس اتحاد کو مورخوں نے "اتحادِ ثلاثۂ اوّل" کے نام سے نامزد کیا ہے۔ ابتداءً اتحاد مخفی رکھا گیا مگر اس کے نتائج جلد ظاہر ہو گئے۔ سیزر ۵۹ ق م میں کانسل منتخب کیا گیا۔ پامپی کے مشرقی کارناموں کا اعتراف کیا گیا اور اس کے سپاہیوں کو زمینیں دی گئیں۔ سینیٹ اب بالکل بے دست و پا ہو گئی تھی کیونکہ ذرا سی مخالفت پر سیزر کی فوج ان کی سرکوبی کے لئے تیار تھی۔ ۵۶ء کے اختتام پر اتحادِ ثلاثہ نے سلطنتِ روما کے لئے جدید انتظامات کئے۔ سیزر پانچ سال اور پھر دس سال کے لئے غالیہ میں سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ پامپی نے روما میں قیام کیا۔ تاکہ سینیٹ کی نگرانی کرتا رہے اور کراسس کو اپنی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے جدید صوبے ملنے اور سپہ سالاری کا بھی وعدہ کیا گیا۔

۵۸ ق م میں سیزر مہم غالیہ کو سر کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ دنیا میں کسی مہم کی تاریخ اس سے بہتر نہیں لکھی گئی کیونکہ سیزر نے خود اس کا تذکرہ اپنے قلم سے لکھا ہے جو نہایت واضح اور صحیح ہے اور شیخی کی بو سے بالکل خالی ہے۔ سب سے پہلے اس نے قوم سوئس کو پیچھے ہٹایا جو رومی صوبوں پر حملے کر رہے تھے اور اس کے بعد جرمنوں کی طرف متوجہ ہوا جو صوبہ غالیہ کو تاخت و تاراج کرنے کی تیاری میں تھے جرمن بھی اپنے ہم نسل اقوام کمبری اور ٹیوٹن کی طرح رومیوں کے لئے نہایت خطرناک دشمن ثابت ہوئے مگر سیزر نے ان کا قلع قمع کر دیا اور ان کی تعداد کثیر کو قتل کر کے دریائے رائن کی طرف بھگا دیا۔ اس وقت تک تو سیزر یا تو صوبجات روما کی حفاظت کر رہا تھا یا ان

اقوام کی جن سے روما سے ارتباط تھا مگر اب وہ ملک غالیہ کی تسخیر پر کمربستہ ہوگیا جس کے لئے ملک گیری کی ہوس کے سوا کوئی معقول عذر نہ تھا۔ اس غرض سے اسنے دریائے رائن کو دو مرتبہ عبور کیا اور جن غالی قبائل نے اس کا مقابلہ کیا سب کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد وہ برطانیہ میں پہنچا اور برطانیوں کو رومی شمشیر کا مزہ چکھایا مگر اس اثناء میں غالیہ کے جدید مقبوضات میں بغاوت شروع ہوگئی۔ ۵۲ ق م میں اس نے بغاوت فرو کی تو اس کے شعلے جنوب میں بھڑک اٹھے اور سیزر کو سخت دقتیں پیش آئیں مگر آخر کار اس نے باغیوں کے سردار کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا اور باوجود باغیوں کے سخت مقابلہ کے سیزر کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس معارک عظیم میں سخت خونریزی ہوئی۔ سیزر نے خود اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی تہ تیغ کیے گئے۔ باغی قبائل کی زمینیں ویران کر دی گئیں۔ قبائل کے قبائل اسیر بنا کر غلامی میں بیچ ڈالے گئے۔ مگر باوجود ان امور کے زمانہ قدیم کے اخلاقی معیار کے لحاظ سے سیزر کے مظالم ناقابل برداشت نہ تھے۔ سیزر کے جنگہائے غالیہ کی تاریخ یورپ میں خاص اہمیت ہے کیونکہ ان کے سبب سے جرمن اقوام کے حملے تین سو سال کے لئے رک گئے اور اس زمانہ تک مغربی ممالک ان کی دار وگیر سے محفوظ رہیں۔ اسی اثناء میں فرانسیسی قوم اور سلطنت کی بنیاد پڑی کیونکہ تمدن وعلوم روما اس ملک میں سرعت کے ساتھ پھیل گئے اور غالیوں نے نہ صرف رومی حکومت کو خوشی کے ساتھ قبول کیا بلکہ رومی تعلق پر فخر کرنے لگے۔ ان محاربات کا سیزر کے مستقبل اور روما کے نظام سلطنت پر جو اثر پڑا وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس کی فوج کو اگر عقیدت مندی تھی تو اس کی ذات سے نہ کہ سلطنت روما سے۔ متواتر جنگ و پیکار کی وجہ سے یہ فوج بہت جسیم کارآزمودہ اور نبرد آزما ہوگئی تھی۔ نقل و حرکت نہایت سرعت کے ساتھ کرتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سپاہی قواعد داں اور بہادر تھے اور ان کو اپنے کارناموں پر ناز تھا۔ انھیں سپاہیوں کی امداد سے کچھ عرصہ بعد سیزر تخت و تاج شاہی کا دعویدار ہوا۔

مگر جس وقت سیزر ایک ملک کے بعد دوسرا ملک فتح کر رہا تھا روما میں بھی تغیرات مسلسل ہوتے رہتے۔ پامپی کے سپرد جو کام ہوا تھا وہ سیزر کے کام سے زیادہ دشوار تھا اور اس کی کامیابی بھی اس درجہ کی نہ تھی جو سیزر کو حاصل ہوئی تھی کیونکہ روما کی

شورہ پشت آبادی میں امن وامان قائم رکھنا جرمنوں اور غالیوں کو رام کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ ۵۶ ق م میں یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اقتدار ثلاثہ کے دشمن قریب تھے کہ غالب آجائیں اور سینیٹ پامپی کے دباؤ سے نکل جائے۔ سسرو اس بغاوت کا بانی اور سرغنہ تھا۔ صورت حالات اس قدر نازک ہوگئی کہ سیزر اپنا کام غالیہ میں چھوڑ کر اطالیہ واپس ہوا اور لیوکا واقع الطالیہ میں پہنچا جہاں اس کے دونوں شرکا ر پامپی اور کراسس بھی اس سے جا ملے۔ سسرو اور اس کے ہمخیال ارکین سینیٹ کو امید تھی کہ پامپی اور سیزر کے باہمی اختلاف سے انھیں کامیابی ہوگی مگر انھیں بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اتحاد ثلاثہ میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوگا، اور اگر انھوں نے مخالفت جاری رکھی تو سیزر کی تلوار نیام سے نکل آئیگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کے عناصر ناپید ہو گئے اور سسرو اور دیگر مخالفین اتحاد نے اپنے افعال پر پشیمانی ظاہر کی اور معافی چاہی۔ ارکین اتحاد ثلاثہ نے پھر روما کا جدید انتظام کیا۔ سیزر کی سپہ سالاری میں پانچ سال کی توسیع کی گئی۔ پامپی اور کراسس سال آئندہ کے لئے کانسل مقرر کرائے گئے اور کراسس کو اس کے علاوہ پارتھیا کے خلاف مہم لیجانے کا بھی بطور انعام وعدہ کیا گیا۔ مگر اب اقتدار ثلاثہ کے ٹوٹنے کا وقت قریب تھا۔ ۵۴ ق م میں کراسس اپنی مشرقی مہم پر روانہ ہوا جس کی اس کو حد درجہ آرزو تھی مگر اس کو شکست ہوئی اور وہیں مارا گیا۔ اس کی موت سے سیزر اور پامپی کے درمیان کوئی مصالحت کرنے والا باقی نہ رہا اور ان دونوں میں مخالفت شروع ہوگئی مگر مخالفت کا اصل سبب یہ تھا کہ دونوں میں خلقی حسد تھا کیونکہ اس زمانہ میں پامپی نے کوئی ایسا کارنمایاں نہ کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی قوت اور شہرت میں ترقی ہوتی۔ اس باہمی مناقشہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پامپی سینیٹ کی طرف جھکا اور سینیٹ ہی کا حامی بنکر اس نے سیزر سے دوستانہ تعلقات ترک کر دیئے جس سے خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ یہ جنگ سیاسی اسباب کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ دو اولوالعزم اشخاص کے ذاتی حسد کی وجہ سے گویا پامپی برائے نام سینیٹ اور سینیٹ کے اقتدارات کا حامی تھا اور سیزر جمہور روما اور ان کے حقوق کے لئے لڑ رہا تھا۔ ابتداءً کچھ گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا مگر آخر کار جنگ شروع ہوگئی اور سیزر روبی کون ندی عبور کر کے الطالیہ میں داخل ہوا۔

ابھی تک رومیوں نے سیزر کا لوہا نہیں مانا تھا ان کا خیال تھا کہ اس کو جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں وہ غالیہ کے نیم وحشی اقوام کے مقابلہ میں تھیں مگر اس نے ثابت کر دیا کہ قواعدداں رومی افواج بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ پامپی اور ارکین سینیٹ کو کامیابی کی قوی امید تھی مگر شروع سے آخر تک ایک جنگ میں بھی سرخروئی نصیب نہ ہوئی۔ سیزر نے نہایت سرعت کے ساتھ روما پر حملہ کیا جس کی مدافعت کا پامپی کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اہل اطالیہ نے سلطنت جمہوری کی حمایت میں کسی قسم کی گرمجوشی ظاہر نہ کی کیونکہ مسلسل خانہ جنگیوں اور انقلابات کی وجہ سے سیاسی معاملات میں انھیں دلچسپی باقی نہ رہی تھی انھیں صرف امن وامان کی ضرورت تھی تاکہ اطمینان سے تجارت و زراعت میں مشغول رہیں۔ اور سیزر نے بجائے تاخت و تاراج اور غارتگری کے تالیف قلوب کو اپنا اصول قرار دیا۔ دشمنوں کے ساتھ ہمیشہ مراعات کرتا اور قیام امن وامان میں ہمیشہ ساعی رہتا۔ اس لئے پامپی اپنی افواج لیکر برنڈسی کی طرف ہٹا اور وہاں سے ایپائرس کا رخ کیا اس امید میں کہ جس ملک میں اس کو غیر معمولی کامیابی ہوئی تھی وہاں اب بھی اسے سپاہی اور مددگار ملجائینگے۔ سیزر نے اس کا تعاقب مناسب خیال نہ کیا۔ سپانیہ میں بغاوت ہوگئی تھی وہاں حسب عادت تیزی کے ساتھ پہنچکر باغیوں کا قلع قمع کیا اور پھر اطالیہ واپس آیا۔ یہاں حالت نازک ہورہی تھی کیونکہ نہ صرف پامپی کی فوج نہایت غدار تھی بلکہ سمندر پر بھی اس کا قبضہ تھا۔ مگر سیزر ان خطرات سے ہراساں نہ ہوا اور براہ سمندر ایپائرس پہنچا۔ پامپی پر اس نے پہلا حملہ جو کیا اس میں سخت ناکامی اور نقصان ہوا مگر پھر اس نے تھسیلی کا رخ کیا اور وہاں فارسالیا میں پامپی کو شکست فاش دی۔ پامپی میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اور ایشیائے کوچک کی طرف چلا اس امید میں کہ اس کا نام سنتے ہی لوگ اس کے گرد جمع ہو جائینگے۔ مگر شکست نے اس کی شہرت کو خاک میں ملا دیا تھا اور آخرکار ایک مدت کی سرگرانی کے بعد ساحل مصر کے قریب کسی قاتل نے اس کا کام تمام کر دیا۔ مگر سلطنت روما پر تمام و کمال قبضہ حاصل کرنے کیلئے سیزر کو زمانے تک مصروف جنگ رہنا پڑا۔ تسخیر مصر و افریقہ کے بعد حامیان پامپی و سینیٹ نے ہسپانیہ میں سر اٹھایا مگر وہاں بھی منڈا میں سیزر نے ان کو شکست دے کر انکی قوت

ہمیشہ کے لئے توڑ دی۔

ان فتوحات کے بعد تمام سلطنت روما سیزر کے قبضہ اقتدار میں آگئی مگر سکندر کی طرح حیات نے وفا نہ کی۔ اس کے کارناموں سے ظاہر ہے کہ سپہ گری کے علاوہ تدبیر مملکت میں بھی اسے خاص دسترس حاصل تھی۔ اور اگر زندگی نے کچھ اور ساتھ دیا ہوتا تو سلطنت روما کا وہ معقول اور دوامی انتظام کر دیتا۔ باوجود اس کے کہ اس نے شہنشاہی روما کی مکمل عمارت تعمیر نہیں کی اور صرف اس نے ابتدائی خاکہ تیار کیا تھا شہنشاہی روما کا حقیقی بانی وہی تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جو طرز عمل اس کے جانشین آگسٹس اور دوسرے شہنشاہوں نے اختیار کیا وہ جولیس سیزر کے مجوزہ انتظامات سے مختلف تھا مگر سیزر ہی پہلا شخص تھا جس کی اولوالعزمی سے ایک فرد واحد کے ہاتھ میں سلطنت رومائی عنان حکومت آگئی اور اسی کے جبروسطوت اور عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے شہنشاہی روما کا آئندہ چل کر قیام عمل میں آیا۔ سیزر کے مجوزہ انتظام حسب ذیل تھے۔ تمام اقتدارات ایک ہی شخص کے قبضے میں رہیں مگر اس کی موت تک یہ طے نہیں ہوا تھا کہ اس شخص کو شہنشاہ یا بادشاہ یا ڈکٹیٹر کہا جائے۔ سینیٹ کے عزو وقار کو قائم رکھا جائے اور اس کی تعداد میں اضافہ کر کے ۹۰۰ کر دیا جائے تاکہ صوبجات کے مشاہیر اور اکابر بھی اس میں شریک ہو سکیں مگر اس کے احکام قطعی ہو نہیں سکتے تھے اور آئندہ سے وہ سلطنت کی مجلس شوریٰ ہو گئی۔ سیزر شہنشاہی کے درخت جمہور کا حامی بنکر پہنچا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کے مجوزہ نظام میں کمیٹیا کے اختیارات کے بحال رہنے کا کوئی موقع نہ تھا کیونکہ شہریان روما کو کوئی معقول حق نہیں تھا کہ وہ ساری دنیا پر حکمرانی کریں۔ اس لئے شہریان روما کو وہ اختیارات دینے سے مجبور تھا جو گراکس ان کو دینا چاہتا تھا مگر گراکس کے دوسرے اصلاحات کو سیزر نے بحال رکھا مثلاً غربا کی امداد اور جدید نوآبادیوں کا قیام جدید شہنشاہی کے یہی اصول تھے۔ مگر بہت سی باتیں اسکے اٹھ جانے سے رہ گئیں مثلاً جانشینی اور مفتوحہ صوبجات کا انتظام جہاں اصلاح کی سخت ضرورت تھی۔

سیزر کے کارنامے صرف فتوحات اور سیاسی اصلاحات تک محدود نہیں۔ اس کے ... بیشمار رومائی مشہور مصنفوں میں سے ہے۔ ... دالطالیہ میں آزاد مجالس بلدی کے قیام

اور تنظیم کے لئے اس نے ایک نہایت اہم قانون نافذ کیا۔ جنتری میں اس نے اصلاح کی اور اسی کی اصلاح شدہ جنتری سنہ ۱۶۰۰ء تک یورپ میں جاری رہی۔ یورپ میں اس سے زیادہ ذہین اور ذکی شخص پیدا نہیں ہوا اور اگر اس کی حیات نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو نوع انسان کی ترقی اور فلاح کے لئے یہ برگزیدہ شخص بہت کچھ کر سکتا۔ مگر اس کے اصلاحات کو روما کی اکثر جماعتیں اندیشے اور عناد کی نظر سے دیکھتی تھیں کیونکہ ان اصلاحات کو عمل میں لانے سے جمہوری روایات نظر انداز ہو رہی تھیں اور نہ عوام کے جذبات کا خیال رکھا گیا تھا۔ سنہ ۴۴ ق م میں مختلف جماعتوں نے سیزر کے خلاف سازش شروع کی۔ ان میں سے بعض کو سیزر کی ذات سے بغض تھا۔ وہ اسکے غلوئے مرتبیت کو دیکھ نہیں سکتے تھے اور بعض کو دراصل سلطنت جمہوری کے مٹ جانے کا افسوس تھا۔ مارچ سنہ ۴۴ ق م میں ان اشخاص نے سیزر کا کام تمام کر دیا جس سے سلطنت روما پھر بدامنی اور ابتری کا شکار ہو گئی اور تیرہ سال کی خانہ جنگی کے بعد سیزر ہی کے تجاویز پر عمل کرنے سے امن و امان قائم ہو سکا۔

باب پانزدہم

آگسٹس

روایت ہے کہ سیزر کی موت کے بعد سسرو نے کہا تھا کہ "جابر کا تو خاتمہ ہو گیا مگر نفسِ جبر ابھی زندہ ہے"۔ سسرو کو امید تو ضرور تھی کہ سیزر کی ہلاکت کے بعد جمہوریت کی قوت پھر زور پکڑے گی مگر اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جمہوریت کی بنیاد تک ہل گئی تھی۔ اس طرزِ حکومت کا زمانہ اب باقی نہ تھا اور سلطنت روما کے مزید قیام کے لیے بادشاہی کا احیا کسی نہ کسی صورت میں لازمی تھا۔

سیزر کی موت کے بعد روما میں سخت ابتری پھیل گئی۔ بروٹس اور کیسیس جن کے ایما سے سیزر کا قتل عمل میں آیا تھا اپنے آپ کو "آزاد کنندگانِ روما" کہتے تھے اور انھیں امید تھی کہ اب وہی برسرِ اقتدار ہوں گے۔ مگر سیزر کے دوست انٹونی نے جو اس سال کا کونسل مقرر ہوا تھا اپنا عمل دخل کر لیا اور قاتلانِ سیزر منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان لوگوں کے علاوہ ایک دعویدارِ سلطنت اور بھی تھا یعنی جولیس سیزر کا وارث اور بھانجا آکٹاویانس سیزر جس نے اپنی خداداد فہم و فراست سے اپنے حریفوں کے منصوبے خاک میں ملا دیے اور آخر کار شہنشاہِ روما ہو گیا۔ شہنشاہ ہونے کے بعد اس نے آگسٹس کا لقب اختیار کیا۔ مگر سہولت کے لیے ہم ابھی سے اسے آگسٹس کہتے ہیں۔ اپنے نانا کے انتقال کے وقت آگسٹس اپائرس میں تھا۔ جولیس سیزر نے اپنے وصیت نامہ میں اس کو اپنا وارث قرار دیا تھا اور گو اس وقت اس کا سن صرف انیس سال کا تھا مگر ہمت کر کے روما پہنچا اور سیزر کے ترکہ کا دعویدار ہوا

جس کے حصول میں بے شمار خطرے تھے۔ جب وہ روما میں وارد ہوا اس وقت اس کی کامیابی کی بہت کم امید تھی کیونکہ ہر فرد اور ہر گروہ اس تاک میں تھا کہ اس حسین نوجوان کو اپنے حصول مطلب کا ذریعہ قرار دے مگر یہ لڑکا سازش اور تدبیر میں ان کا استاد نکلا اور نشیب و فراز خوب سمجھ کر بمعیت انٹنی و لیپیڈس "اتحاد ثلاثہ ثانی" کی بنیاد ڈالی۔ ان تینوں میں باہمی اختلاف تھے مگر ایک امر میں اتفاق کلی تھا یعنی سیزر کے نام کو بدنامی سے بچایا جائے، اس کی پالیسی کو قائم رکھا جائے اور اس کے قاتلوں کو واقعی سزا دی جائے۔ مقاصد مذکورہ میں تینوں شرکاء کو بہت جلد کامیابی ہوئی کیونکہ آگسٹس سیزر کا جانشین تھا اور اس وجہ سے فوج والے اس کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انٹنی اس وقت سلطنت روما کا سب سے قابل سپہ سالار تھا، اس لئے اس کے زیر علم اس قدر سپاہی جمع ہو گئے جس کی بروٹس اور کیسیس کو کبھی خواب و خیال میں امید نہیں ہو سکتی تھی۔ سنہ ۴۲ ق م میں ان دونوں قاتلان سیزر کو بمقام فلپی سخت شکست ہوئی اور دونوں وہیں مارے گئے۔ اس طرح دو سال کے بعد دستور جمہوری پھر زیر و زبر ہو گیا اور عالم روما میں پھر شخصی سلطنت قائم ہو گئی گو بجائے ایک کے تین اشخاص حکمراں تھے۔

مگر اتحاد ثلاثہ مدت تک قائم نہیں رہا۔ لے پی ڈس میں نہ کوئی مادہ تھا نہ قابلیت اس لئے اس کو اتحاد سے علیحدہ کر دیا گیا اور دونوں باقی ماندہ اراکین میں یہ تصفیہ ہوا کہ انٹنی مشرق میں سکونت پذیر ہو اور سلطنت روما کا مشرقی حصہ اس کے زیر فرمان رہے اور آگسٹس نے روما اور مغرب لے لیا۔ اس انتظام کے لحاظ سے انٹنی کا پلہ بھاری تھا کیونکہ اس کے حصے میں سب مشرقی زرخیز صوبے آ گئے تھے مگر آگسٹس کو بھی یہ نفع تھا کہ اس کی حکومت شہر روما پر تھی اور اس لحاظ سے گویا وہ سلطنت روما کی ہستی اور روایات کا حامی و ممد خیال کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کو خوش قسمتی سے آدمی بھی اچھے مل گئے۔ آگسٹس کو بذات خود فن سپہگری میں دخل نہ تھا مگر اس کا سپہ سالار اگریپا اپنی بہادری اور شجاعت کئی میدانوں میں ثابت کر چکا تھا۔ میناس بھی اس کے اراکین دولت میں سے تھا جس میں خاص انتظامی مادہ تھا اور رومیوں کی دل جوئی میں کمال رکھتا تھا۔ اس طرح

گویا آگسٹس میں وہ تمام خوبیاں جمع ہوگئیں جو رومیوں میں پسندیدہ خیال کی جاتی تھیں
برخلاف اس کے اینٹنی نے بالکل متغائر طریقہ اختیار کیا کیونکہ اس نے سکندریہ میں
اقامت اختیار کی اور ملکہ مصر کلیوپیٹرا کا بندۂ بے درم ہوگیا جس کی وجہ سے روما میں
یہ افواہیں پھیلنے لگیں کہ اس نے مشرقی طرز زندگی اختیار کر لیا ہے، روما کو مصر کے
زیر نگیں کرنا چاہتا ہے اور مشرقی اقوام کے مقابلہ میں اپنا جوہر سپہگری اب نہیں
دکھا سکتا۔

دونوں حریفوں میں صلح کرانے کی بھی کوششیں ہوئیں مگر جب خلقی رقابت
باہمی بغض وحسد کے علاوہ اصول متغائر ہوں تو صلح وآشتی کا قائم رہنا دشوار ہے
آخر کار ۳۱ ق م میں جنگ چھڑ گئی اور یونان کے مشرقی ساحل پر بمقام ایکٹیم کے
قریب ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں اینٹنی کو باوجود اس کی شہرت اور وسعت
تجربہ کے آگسٹس اور اس کے سپہ سالاروں نے شکست فاش دی۔ اینٹنی اپنی مصری
ملکہ کو لیکر سکندریہ پہنچا مگر آگسٹس نے انھیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور اس شہر
کا محاصرہ کیا۔ اینٹنی اپنے زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور کلیوپیٹرا نے زہر کھا کر اپنا کام
تمام کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام سلطنت روما پھر ایک فرد یعنی آگسٹس کے
زیر فرمان ہوگئی۔

آگسٹس کو اس مرحلے کے طے کرنے کے بعد اپنی وسیع سلطنت کے انتظامات
کو مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کی ضرورت ہوئی جس کے تین طریقے تھے۔ یا تو جولیس سیزر
کی تجاویز کو عملی جامہ پہناتا یا سلطنت جمہوری کو بحال کرتا یا کوئی دوسرا طرز حکومت
اختیار کرتا۔ آگسٹس مدت تک غور وخوض میں رہا، کئی تغیر اس نے کئے اور پھر ان
کو پلٹ دیا اور آخر کار بار بار تجربوں کے بعد اس نے وہ نظام سلطنت قائم کیا جو
روما میں کئی صدیوں تک جاری تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شہنشاہی روما کا بانی
اصل میں جولیس سیزر تھا مگر آگسٹس کے انتظامات ایک حد تک اس کی تجاویز
سے متغائر تھے جس کا سبب یہ تھا کہ جولیس کو انقلابی تغیرات کرنے میں دریغ نہ
ہوتا تھا، سیاسیات میں اس کو جمہور سے زیادہ ہمدردی تھی، اس لئے اس نے
روما کے قدیم روایات کی کچھ پروا نہ کی اور سینیٹ کے اقتدارات کو کالعدم کر کے

ایک جدید طرز حکومت پر اپنی سلطنت قائم کی۔ مگر آگسٹس قدامت پسند تھا اور انقلابات سے خائف۔ سیزر کا حسرت ناک انجام ہر وقت اس کے پیش نظر رہتا تھا اور علاوہ خوف و خطر کے اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ جدید حکومت میں روما کے قدیم روایات کا اثر غالب ہو اور رومیوں کی اور شاید خود اس کی نظروں سے وہ انقلاب عظیم مخفی رہے جو روما کے طرز حکومت میں ہو چلا تھا۔ ان وجوہ سے نہ آگسٹس نے دستور میں کسی تغیر کا اعلان کیا نہ کوئی خطاب اختیار کیا نہ بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا شہنشاہ کہلوایا بلکہ بقول خود اس نے وہ اقتدارات اختیار کر لئے تھے جو جمہور روما نے اسے بطیب خاطر دیئے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنے دوران حکومت میں رومی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے عہد سلطنت کے آخر میں اس نے اپنے کارناموں کو مختصر جملوں میں السنہ یونانی و لاطینی میں لکھوا کر اس کے کتبے مختلف مقامات پر لگا دیے تھے۔ ان میں سے ایک کتبہ جو صوبہ گلاشیا کے ایک مندر میں نصب کیا ہوا تھا اب تک محفوظ ہے۔ آگسٹس نے ان کتبوں میں یہ دعوی کیا ہے کہ حکومت اس کے ہاتھوں میں تمام رعایا کی مرضی سے آئی مگر اس نے ان اقتدارات کا استعمال نہیں کیا بلکہ جمہوریت کو بحال کیا۔ اس جملہ میں غالباً اس نے ریاکاری سے کام نہیں لیا ہے کیونکہ اس نے دستور روما کو بحال کرنے کی بہت کوشش کی اور تمام اقتدارات کا اس کی ذات میں جمع ہو جانے کا سبب اس کا طلب عز و جاہ نہ تھا بلکہ رومیوں کی ناگفتہ بہ حالت جس کی وجہ سے جمہوریت عود نہ کر سکتی تھی۔

آگسٹس کا طرز حکومت بالاختصار یہ تھا کہ اس نے اپنی ذات کو مختلف عہدہ داروں کے اقتدار کا مرکز بنا لیا تھا اور یہی اجماع اقتدارات اس کی حکومت کی ممتاز خصوصیت ہے۔ اس کی قوت اس قدر زبردست تھی کہ رعایا اور اہل سینیٹ اس کی انگلیوں کے اشاروں پر چلتے۔ اسی لئے تمام اہم عہدوں پر اس کا قبضہ ہو گیا اور اس نے اپنے آپ کو کانسل اعظم اور ٹربیون تا حین حیات مقرر کرا لیا۔ کانسل اعظم ہونے کی وجہ سے تمام رومی افواج اس کے ماتحت ہو گئیں اور ٹربیون ہونے کی وجہ سے اسے نہ صرف مذہبی عظمت حاصل ہوئی بلکہ وضع قوانین

اور عہدالتوں پر اس کا پورا اقتدار ہو گیا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس نے کوئی خطاب اختیار نہیں کیا مگر رہما اس کو اس کے جانشینوں کو پرنسیپس یعنی امیر کہا جاتا تھا جس سے صرف یہ منشا تھا کہ وہ سلطنت کا سب سے سربرآوردہ فرد تھا اور اس کا ترجمہ بجائے شہنشاہ کے امیر جمہوریہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

نظام سلطنت پر نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آگسٹس سینیٹ کی حد درجہ عزت و توقیر کرتا تھا اور اس جماعت کو اس نے بہت سے اختیارات بھی دیدیئے تھے جن کے دینے کا جولیس سیزر کو خیال تک نہ تھا۔ سیزر نے سینیٹ کی تعداد بڑھا کر ۹۰۰ کر دی تھی اور اس میں صوبجات کے ممتاز افراد کو بھی شریک کیا تھا مگر آگسٹس نے تعداد سابقہ بحال کر دی اور اس کی رکنیت روما کے امرا کے لئے مخصوص کر دی۔ سلطنت کے نصف صوبے جن میں افواج کی ضرورت نہ تھی سینیٹ کے زیر انتظام کر دیئے گئے اور اس کے علاوہ یہی مجلس بہت جلد سلطنت روما کی عدالت العالیہ بھی ہو گئی۔ آگسٹس ہر موقع پر اس مجلس کی عزت و احترام کرتا جس کی وجہ سے اس کے ارکین اس سے بہت خوش تھے۔

جدید نظام سلطنت میں مجلس سینیٹ کے اقتدارات اس قدر وسیع تھے کہ اس نظام سلطنت کو "حکومت دوئی" کہتے ہیں۔ اس کی رو سے نصف سلطنت آگسٹس کے زیر فرمان تھی اور بقیہ نصف سینیٹ کے۔ مگر یہ محض ظاہر داری تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ قطعی اختیارات صرف آگسٹس کو حاصل تھے اور مجلس سینیٹ جو کچھ کرتی تھی اس کی منظوری سے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تغیرات مذکورۂ بالا سے ابتداءً سینیٹ کے احترام و اقتدار میں بہت کچھ اضافہ ہوا۔ روما کی دوسری قومی مجالس کا حشر اچھا نہیں ہوا۔ جولیس کے زمانے میں ہی ان کی حالت سقیم ہو چکی تھی اور آگسٹس نے ان کو بالکل دبا دیا۔ وضع قوانین کا ان کو اختیار نہ رہا، کمیٹیا کے جلسے صرف مضر نعوں کی سماعت کے لئے ہونے لگے اور ان مجالس کو بعض عہدہ داروں کے انتخاب کے علاوہ کوئی اختیار باقی نہ رہا۔ مگر یہ اختیار بھی کچھ کارگر نہ تھا کیونکہ جن عہدہ داروں کا یہ مجلس انتخاب کرتی مثلاً کانسل، پریٹر، ٹریبون وغیرہ سب شہنشاہ کے مقرر کردہ عہدہ داروں کے ماتحت ہوتے اور آگسٹس کی موت کے

بعد تو عہدہ داروں کے انتخاب کا طریقہ بالکل مسدود ہو گیا۔ صوبوں کے انتظام کی بھی اصلاح کی گئی کیونکہ ان کے باشندوں کی حالت بدانتظامی اور عہدہ داروں کے استحصال بالجبر سے قابل رحم ہو گئی تھی۔ مگر سلطنت جمہوری کے زوال کے بعد ان کی حالت سنبھلنے لگی کیونکہ شہنشاہ کو صوبہ جات کی بدنظمی سے نقصان تھا اور ان کی فلاح سے نفع۔ اس لئے صوبہ داروں کے افعال کی نگرانی ہونے لگی انکی تنخواہیں مقرر کر دی گئیں اور رشوت ستانی کی سخت ممانعت ہو گئی۔ ان اصلاحات کے بعد ظلم و تعدی کی شکایات کہیں نہ کہیں باقی رہیں مگر شاذ و نادر جس کی وجہ سے یہ کہنا بجا ہو گا شہنشاہیت کے قیام سے رومیوں کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا مگر باشندگان صوبجات مفتوحہ کے لئے موجب فلاح و برکت ہوا۔

آگسٹس ہر دلعزیزی کی ضرورت خوب محسوس کرتا تھا اور اس لئے اس کے بقا میں ہر طرح کوشاں رہتا۔ چنانچہ شہر روما میں اس نے بادشاہت کے لوازمات کبھی اختیار نہ کئے بلکہ معمولی امیروں کی طرح رہتا تاکہ جمہور کا یہی خیال رہے کہ تمام اقتدارات شاہی جبراً اس کے سر منڈھ دیئے گئے تھے۔ اس کے معاصر مصنفین اور شعراء نے اس کے اقتدارات کے قیام اور رعایا کی دلجوئی میں اس کی بہت کچھ مدد کی۔ اس کی داد و دہش کی کوئی انتہا نہ تھی مگر اہل علم کو ہمیشہ اپنے وزیر میناس کے ذریعہ سے لیتا دیتا تھا۔ آگسٹس کے عہد کی تمام تصنیفات سے وہ خوش اعتقادی اور حسن ظن ظاہر ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو اس کی ذات سے تھا اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو یقین کامل تھا کہ اس کی ذات سے روما کو بے شمار فائدے ہوئے۔ اس زمانے کے دو مشہور شعراء ہوریس اور ورجل اسکی مدح سرائی میں رطب اللسان ہیں۔ ہوریس نے اپنی نظموں اور غزلیات میں آگسٹس اور اس کے وزرا کی تعریف کے پل باندھ دیئے ہیں اور شہنشاہ اور اس کے خاندان کے کارناموں کو آسمان تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا قول ہے کہ "آگسٹس ایک دیوتا ہے جو ہم لوگوں میں آکر جلوہ افروز ہوا ہے۔" ورجل کی خدمات اس سے بھی زیادہ قابل قدر ہیں کیونکہ اس نے آگسٹس کے ہر فعل اور ہر کارنامے کی تعریف کی ہے اور جمہوریت روما اور سادہ دیہاتی زندگی کی خوبیوں کی

تعریف کے ساتھ اس نے اپنی زبردست نظم اے نیڈ میں ثابت کیا ہے کہ آگسٹس کے خاندان کو بانی روما سے تعلق ہے اور یہ کہ آگسٹس شہر روما اور اس کی عظمت کا دوسرا بانی ہے۔ مگر آگسٹس نے علاوہ مصنفین کی امداد کے مذہب سے بھی تقویت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی گو مذہب کا اس زمانہ میں کوئی اثر باقی نہ رہا تھا، لامذہبی کا زور تھا، مندروں کے در و دیوار مسمار ہو رہے تھے اور دیوتاؤں کی پرستش کے بجائے جدید مشرقی عقائد کی اشاعت ہو رہی تھی۔ مگر آگسٹس نے مندروں کی مرمت کرائی، دیوتاؤں کی پرستش کو دوبارہ رواج دیا تاکہ اس کا اقتدار مذہبی بنیاد پر قائم ہو جائے اور اہل روما اس سے عقیدت مند ہی رہیں۔ مگر یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ احیاء مذہب سے اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ اپنی طاقت کو تقویت دے بلکہ اس کا حقیقی منشا یہ تھا کہ روما کی عظیم الشان روایات کو تازہ کرکے مذہبی رسوم کو دوبارہ رواج دے، زراعت کو وسعت دے اور سادہ زندگی کی طرف اہل ملک کو مائل کرے۔

جنگ ایکٹیم کے بعد سلطنت روما میں سکون ہو گیا جو دو سال تک کم و بیش قائم رہا۔ مگر سلطنت روما کے بقا کے لئے اس کی سرحدات کی حفاظت اور استقامت کی ضرورت تھی اور اس غرض سے سرحدات کو وسعت دی گئی گو آگسٹس کو فن سپہگری سے مناسبت نہ رکھنے کی وجہ سے جنگ و جدال سے طبعی منافرت تھی۔ شمالی سرحد کو بہت وسعت دی گئی اور سلطنت روما کی حدود شمال میں دریائے رائن اور ڈینیوب تک پہنچ گئیں بلکہ ایک زمانہ میں تو دریائے ایلب تک پہنچ گئی تھیں۔ شہنشاہ آگسٹس کی بیوی کے پہلے شوہر کے بیٹوں (ڈروزس اور ٹائی بے ریس) نے مسلسل رزم و پیکار کے بعد جرمن اقوام کو مغلوب کر لیا تھا مگر یہ کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ جرمنوں کی غیور اور آزاد طبائع رومیوں کی غلامی اور ان کے حکام کے جبر و تعدی برداشت نہ کر سکیں اور ۹ء میں ان کے سرگروہ آرمی نیس نے رومی سپہ سالار وارس کی افواج کو شمال مغربی جرمنی کی دلدلوں میں تباہ کر دیا۔ آگسٹس کے عہد حکومت میں یہی ایک ہزیمت اس کی افواج کو ہوئی تھی اور اس سے کچھ وہ ایسا دل برداشتہ ہو گیا کہ انتقام کی ہوس بھی باقی نہ رہی گویا آگسٹس کا

طالع اقبال اس کی حکومت کے ختم ہونے سے قبل ڈوب گیا۔ اس کی خانگی زندگی بھی پُرحسرت تھی جس کے اثر سے سلطنت بھی بچ نہ سکی۔ اس نے تین شادیاں کیں مگر تادم مرگ اس کی جانشینی کے مسئلہ کا تصفیہ نہ ہوا۔ شہنشاہ کا جانشین نہ ہونا شہنشاہیت کے مزید قیام کا منافی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ جمہوریت برائے نام باقی تھی اس لئے جانشینی کے لیئے قواعد وضع کرنا بھی دشوار تھا مگر آگسٹس کے اقتدارات اس قدر وسیع تھے کہ وہ اپنے اقتدارات وخطابات جس شخص پر چاہتا منتقل کر دیتا۔ اس کے ایک لڑکی تھی جس کی کئی اولادیں ہوئی تھیں مگر ان کی موت یا اوباشانہ زندگی کی وجہ سے ان میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کر سکا۔ آخر کار اس نے طوعاً وکرہاً اپنے ربیب ٹائی بے ریس کو اپنا جانشین بنایا جس کی قابلیت اور امانت میں تو شک نہیں تھا مگر ہر دلعزیزی پیدا کرنے کا مادہ نہ تھا۔ اور اس لئے وہ آگسٹس کی حکومت کی ممتاز خصوصیات برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ آگسٹس نے ۱۴ء میں انتقال کیا اور یہی شخص اس کا جانشین ہوا۔

مگر قبل اس کے کہ ہم دوسرے شہنشاہ کا تذکرہ کریں ہم اپنے ناظرین کو بتانا چاہتے ہیں کہ تاریخ عالم میں شہنشاہی روما کے قیام کی کیا خاص اہمیت ہے کیونکہ ایک تو اس کے قیام سے تاریخ عالم کے دور قدیم کا اختتام ہوتا ہے اور دوسرے زمانہ قدیم میں جو طرز ہائے حکومت رائج تھے وہ گویا اس میں ضم ہو گئے اور زمانہ حال کی حکومتوں کے دستور اس کے اثر سے خالی نہیں۔ شہنشاہی روما کے قیام سے بنی نوع انسان کو جو پہلا فائدہ پہنچا وہ قیام امن و امان تھا کیونکہ جنگ ایکٹیم کے بعد ممالک سلطنت روما میں برابر امن قائم رہا اور اس رقبہ عظیم میں صرف چار لاکھ فوج امن و امان کے قیام کے لئے کافی تھی جہاں اب لاکھوں سپاہی ہیں۔ امن و امان کی وجہ سے تمدن کا اثر تمام سلطنت میں پھیل گیا۔ مشرق میں یونانی اور مغرب میں لاطینی زبان کی کافی اشاعت ہو چکی تھی۔ مگر شہنشاہی کے قیام کے بعد مغربی صوبوں میں لاطینی قومی زبان ہو گئی اور اس طرح رفتہ رفتہ فرانسیسی ہسپانی اور اطالوی زبانوں کا آغاز ہوا۔ مغربی یورپ کی اقوام میں نہ صرف روما کی زبان رائج ہو گئی بلکہ انھوں نے اس کا تمدن بھی اختیار کر لیا اور قانون رومی کے اصول کے پابند ہو گئے۔ تمدن

روما کا بہترین ثمرہ قانون رومی تھا جس کا آئندہ نسلوں پر رومیوں کا سب سے بڑا احسان خیال کرنا چاہیے جیسے کہ یونان کے احسان عظیم فلسفہ اور فنون لطیفہ میں۔ قانون رومی کی بنیاد تو جمہوریت کے زمانہ میں پڑ چکی تھی مگر عہد شہنشاہی میں اس کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی۔ اس قانون کو آئندہ نسلیں آیۂ الٰہی خیال کرنے لگیں اور یہی یورپی ممالک کی قوانین کی بنیاد ہیں گو انگلستان نے قوانین پر اس کا نسبتاً کم اثر پڑا ہے۔ یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ شہنشاہی کے قیام سے آزادی کا خون ہوا۔ شہر روما میں تو ضرور آزادی تقریر مسدود ہو گئی اور اس زمانہ کے مورخین نہایت رقت کے لہجہ میں سینٹ کے اقتدار و احترام کے زوال اور شہر روما کے باشندگان کی بے بسی کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر شہنشاہیت سے باشندوں کی تعداد غالب کو نہ صرف دنیاوی فلاح ہوئی بلکہ ان کی آزادی کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ آگسٹس اور اس کے جانشینوں کی پالیسی تھی کہ شہروں کو حکومت خود اختیاری دی جائے جس کی وجہ سے تمام سلطنت روما میں ہزاروں آزاد شہر وجود میں آ گئے جن کی آزاد بلدیت عرصہ تک قائم رہی۔ ایک شہر یعنی عروس البلاد روما کی آزادی کا تو خون ہوا مگر اس کے بدلے ہزاروں آزاد شہر پیدا ہو گئے۔ قیام شہنشاہیت کا اثر جو زمانہ ما بعد کے تمدن پر پڑا ہے وہ دین مسیحی کی اشاعت سے ہوا ہے۔ آگسٹس نے بے حد کوشش کی تھی کہ پھر بت پرستی کا زور بڑھے، ان مساعی میں اسے کچھ کامیابی ہوئی مگر اس کے قائم کردہ نظام سلطنت کو مذاہب قدیم کے بجائے مذہب جدید کو زیادہ نفع ہوا۔ شہنشاہیت روما ایک عظیم الشان سلطنت تھی جس میں مختلف اقوام آباد تھیں جن کے نظام سیاسی، السنہ اور مذاہب میں حد درجہ مغائرت تھی مگر اس ریاست "بین الاقوامی" کے لیے ایک مذہب "بین الاقوامی" کی ضرورت تھی۔ مذہب مسیحی کے زور پکڑنے سے قبل یہ آثار قوی ہوتے جاتے تھے کیونکہ اتنی بڑی سلطنت کے لئے ایک عام مذہب کی ضرورت تھی اور اس کی خصوصیات ایسے مذہب کی اشاعت کے موافق تھیں۔ حکومت رومی کا رقبہ نہایت وسیع تھا گویا تمام اقطاع عالم ایک ہی فرمانروا کے زیر نگیں تھے۔ اس لئے داعیان مذہب بلا کسی دقت کے شام سے برطانیہ تک جا سکتے تھے۔ عمدہ سڑکیں ہر جگہ موجود تھیں۔

سکہ تمام ممالک میں ایک ہی رائج تھا اور چونکہ سلطنت ایک ہی تھی اس لئے ایک ملک کی سرحد سے دوسرے ملک میں جانے میں جو قیود ہوتی ہیں وہ بھی انکی آمد و رفت میں مانع نہ تھیں۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ ہر جگہ یونانی یا لاطینی میں اپنے مذہب کا پیام سنا سکتے تھے۔ وہ زمانہ جلد آنے والا تھا جب کہ سلطنت روما اور کلیسائے مسیحی میں سخت دشمنی پیدا ہو گر شہنشاہیت کے وجود سے دین مسیحی کی اشاعت میں کامیابی ہوئی اور سخت جنگ و جدال کے بعد مسیحیت سے شہنشاہیت کو طاقت اور تقویت حاصل ہوئی۔

باب شانزدہم

روما کی شہنشاہی کا ابتدائی زمانہ

شہنشاہیت کے قیام سے یورپ کے عام متمدن ممالک کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئیں اور ان ممالک کی تاریخ پر آیندہ صدیوں میں بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جا سکتی ہے بجائے اس کے کہ ہر ملک کی تاریخ پر فرداً فرداً تبصرہ کیا جائے کیونکہ سب ایک ہی شہنشاہیت بلکہ ایک ہی شہر کے ماتحت ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے مورخ اپنا فرض اختصار اور وضاحت کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ اس عہد میں صوبہ جات کی تاریخ خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ان کی مالی حالت روبہ ترقی تھی اور تمدن کو فروغ ہو رہا تھا۔ ان کے باشندے تمدن و تہذیب کے لحاظ سے عرصۂ قلیل میں اطالیہ بلکہ خود روما کے ہم پلہ ہوگئے۔ زمانۂ حال کے مورخین نے ان کی انفرادی تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی ہے مگر ہر ایک صوبے کی مسلسل تاریخ لکھنا دشوار ہے کیونکہ زمانۂ قدیم کے مورخین نے صوبجات کی تاریخ کا ذکر انھیں مواقع پر کیا ہے جب غالیہ، ہسپانیہ، مصر یا شام میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس کا اثر شہنشاہی کی تاریخ پر پڑتا ہو۔ مگر کتبوں کی مدد اور آثار قدیمہ کے مطالعہ سے صوبجات کی مالی حالت کا پتہ چلتا ہے اور یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شہنشاہی کا قیام ان کی ترقی کا باعث ہوا۔

مگر خاص شہر روما میں شہنشاہی کی ہر دلعزیزی قائم نہ رہی کیونکہ آگسٹس کے جانشینوں میں تالیف قلوب کا مادہ نہ تھا اور نہ انھوں نے اپنے زمانے کے اہل علم کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ہوریس اور ورجل

آگسٹس کی مدح سرائی میں رطب اللسان تھے مگر آئندہ پچاس سال کے مورخین شہنشاہوں کا تذکرہ حقارت اور نفرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس کے دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ آگسٹس کے جانشینوں میں تدبر، فراست اور اعتدال کا مادہ کم تھا اور دوسرے جتنی جتنی کہ آگسٹس کے عہد کے قبل کی ابتری اور طوائف الملوکی کی خرابیاں فراموش ہونے لگیں جمہور اور خصوصاً امرائے روما کو خیال ہونے لگا کہ دنیا کی حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس عہد کے رومی تصانیف سے اس سیاسی بے چینی کا پتا چلتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شہر روما کی قدیم اہمیت اب باقی نہ تھی اور اس کے باشندوں کی پریشان حالی سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرنا چاہیئے کہ تمام سلطنت روما میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

آگسٹس کے پہلے چار جانشین اس کے اعزہ میں سے تھے۔ ٹائی بے ریس پہلا شخص ہے جو اس کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے شخصی خصائل نہایت متضاد تھے اس لیے اس کے حالات کا صحیح اندازہ دشوار ہے۔ مشہور مورخ روما ٹیسی ٹس نے اسے اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یہ شہنشاہ نہایت ظالم و جابر تھا اور اس کے عہد میں سلطنت روما میں ایک قیامت صغریٰ قائم ہو گئی تھی۔ مگر اس کی رائے کے ماننے میں ہمیں تامل ہے کیونکہ جو تفصیلی حالات اس نے بیان کئے ہیں اس سے خود اس کے دعاوی کا ابطال ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ شہنشاہ سے اس کو ذاتی عناد تھا۔ ٹائی بے ریس کے طرز حکومت سے ظاہر ہے کہ وہ آگسٹس کا لائق جانشین تھا اور اسکی طرح صلح جو، ہوشیار، مستقل مزاج اور کار آزمودہ تھا۔ آگسٹس نے اپنے وصیت نامہ میں اسے ہدایت کی تھی کہ سرحدوں کو بڑھانے کی کوشش نہ کرے۔ مگر ٹائی بے ریس کو ابتدا ہی سے خیال تھا کہ جرمنی کی تسخیر عمل میں لائے۔ وارو کی شکست کے باوجود جس کا ذکر آچکا ہے رومی فوجیں پھر ایلب کی طرف بڑھیں اور ٹائی بے ریس کے بھانجے نے جس کو اس فتح کی وجہ سے جرمانکس کا خطاب ملا رومی افواج کی شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا مگر اس کے بعد ٹائی بے ریس نے اس مہم کا خیال چھوڑ دیا اور دریائے رائن پھر سلطنت روما اور جرمنی کے درمیان حد فاصل ہو گئی۔ شہر روما میں اس رجعت کو

قومی تحقیر سے تعبیر کیا گیا مگر ٹائی بے ریس سمجھ گیا تھا کہ اس مہم میں بے شمار زر و مال اور سپاہیوں کی جانیں ضائع ہونگی اور کامیابی کی امید بھی موہوم تھی۔ جب رومیوں کے حملوں کا خوف جاتا رہا تو جرمنوں میں خود پھوٹ پڑ گئی اور ان کا سرگروہ آرمی نیس اس خانہ جنگی میں مارا گیا جس سے آئندہ دو سو سال تک روما کی شمالی سرحد بالکل محفوظ رہی۔ دوسرے ممالک میں بھی امن و امان قائم تھا۔ اپنی سلطنت کے آخری زمانہ میں ٹائی بے ریس نے بجائے روما کے شہر کاپری (قریب نیپلز) میں قیام اختیار کیا اور روایت کی جاتی ہے کہ وہاں عیش و عشرت کا بازار خوب گرم تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی عقل میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ سنہ ۳۷ء مسیحی میں اس نے انتقال کیا اور کیالی گولا اس کا جانشین ہوا۔ اس شخص کے خصائل عجیب و غریب تھے گویا تو بالکل فاتر العقل تھا یا شہنشاہی اقتدارات کے مل جانے سے اس کا دماغ پھر گیا تھا۔ اس کے اسلاف نے کبھی اپنے طرز زندگی میں اپنی مطلق العنانی کا اظہار نہیں کیا تھا مگر اس بادشاہ کو اس کا بالکل لحاظ نہ تھا۔ اس نے جو آداب دربار میں جاری کیئے اس کی رو سے دیوتاؤں سے زیادہ اس کا احترام ہوتا اور ہر شخص پر لازم تھا کہ اس کی حضوری میں نہایت عجز و انکسار سے پیش آئے۔ چند سال سلطنت کرنے کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور اس کا چچا کلاڈیس اس کا جانشین ہوا۔ یہ شخص بھی متضاد خصائل کا آدمی تھا۔ علمی لیاقت بہت اچھی تھی اور معاملات سیاسی پر جو تقریریں اس نے کی ہیں ان سے اس کی فہم و فراست کا پتا لگتا ہے مگر اس کے مزاج میں استقلال نام کو نہ تھا اور اس کی مجلس نا گفتہ بہ عیاشیوں کا مرکز تھی۔ اس کے عہد سلطنت میں مقبوضات میں ایک اہم اضافہ ہوا۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جولیس سیزر نے برطانیہ پر یورش کی تھی مگر اس نے قبضہ نہ کیا۔ مگر اب سنہ ۴۳ء میں رومی فوجیں دوبارہ آبنائے ڈوور عبور کر کے برطانیہ پہنچیں اور چونکہ وہاں کے باشندے ان کا مقابلہ نہ کر سکے انھوں نے کال چیسٹر تک قبضہ کر لیا۔ کلاڈیس بھی جنگ کے آخری زمانہ میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس زمانہ سے برطانیہ کا شمار رومی صوبجات میں ہوتا ہے اور رومیوں نے رفتہ رفتہ جزیرہ نما کے شمالی اور مغربی حصوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ کلاڈیس بھی سنہ ۵۴ء میں قتل ہوا اور بجائے اس کے نیرو شہنشاہ ہوا جو سابقہ بادشاہوں سے بدرجہ

بہتر تھا۔ ثانی بے رس میں اگر کچھ خرابیاں تھیں تو اس کے محاسن کا پلہ بھاری تھا۔
کلاڈیس کے افعال وحرکات کی پردہ پوشی ممکن ہے مگر نیرو کی خباثت میں کوئی شک نہیں
کیونکہ اس کی وجہ سے تمام سلطنت روما مورد مصائب و آلام ہو گئی۔ اپنے عہد سلطنت
کے ابتدائی پانچ سال میں وہ مشہور فلسفی سینیکا اور ایک لائق سپاہی بوروس کے مشورہ
سے امور سلطنت طے کرتا رہا جس سے لوگوں کو امید تھی کہ سابقہ بادشاہوں سے اس
کا عہد حکومت بہتر ہوگا۔ مگر ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے مشیروں کو الگ کر دیا اور
ذمہ داری سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے بجائے عیش و عشرت اور فضول خرچی
میں پڑ گیا یہاں تک کہ عام جلسوں میں ناچنے گانے لگا جس سے رومیوں کو اس سے
سخت نفرت ہو گئی۔ اس کی مجلسرا میں روز نئی رنگ رلیاں ہوتیں جس کا نتیجہ ہوا کہ
آئے دن اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ دربار میں افواہ پھیل گئی
کہ شمالی افواج نے علم بغاوت بلند کیا ہے جس میں خود مجلسرا کی محافظ فوج شامل ہے۔
بزدل نیرو ان افواہ سے پریشان ہو کر روما سے فرار ہو گیا اور آخر کار شدہ میں
خودکشی کرلی۔

حالات مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ ان بادشاہوں کے افعال وحرکات
اور ان کی عیش کی داستان بیان کرنے سے کوئی نفع نہیں بلکہ اس سے بہتر ہوگا کہ
سلطنت کے عام حالات پر نظر ڈالی جائے اور رعایا کی پریشان حالی اور ابتری کے
اسباب دریافت کئے جائیں۔ پہلی چیز جو ہمارے پیش نظر ہوگی وہ خود شہنشاہ کی
شخصی حیثیت تھی جس کا سمجھنا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ جمہوریت ابھی تک بظاہر
قائم تھی شہنشاہوں کے اقتدارات اور فرائض ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے
تھے اور اس زمانہ کے روایات کسی فرد واحد کی مطلق العنانی کے بالکل خلاف
تھے مگر پھر بھی تمام سلطنت رومان کے تابع فرمان تھی اور اس سلطنت کے
رقبہ میں دنیا کے تمام ممالک شامل تھے جن کا رومیوں کو علم تھا۔ زمانۂ مابعد میں
یورپ میں کوئی بادشاہ یا ایسا حاکم نہیں گزرا ہے جس کی ذات شہنشاہان روما
سے اعلیٰ وارفع ہو کیونکہ دوسرے ممالک میں ان کی موجودگی میں دوسرے
طاقتور بادشاہ اور شہنشاہ تھے مگر شہنشاہان روما کا دنیا میں نہ کوئی حریف تھا

نہ ہمسر تھے ہر جگہ ان سے نہ صرف خوشامد اور چاپلوسی کا برتاؤ ہوتا بلکہ قریب قریب دیوتاؤں کی طرح ان کی پرستش ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر نشۂ اقتدار سے مخمور ہو کر دنیا و ما فیہا کو فراموش کر بیٹھے۔ جانشینی کے متعلق بھی کوئی قواعد نہ بنائے گئے تھے اور نہ صورت حالات کے لحاظ سے بنانا ممکن تھا۔ جانشینی کے متعلق مختلف امیدواروں کی طرف سے اور ان کے مددگاروں کی طرف سے سازشیں ہوتیں اور اکثر خفیہ قتل بھی ہوتے۔

ملازمان بارگاہ شہنشاہی میں آزاد شدہ غلاموں کا بھی گروہ تھا جن کا ظہور رفتہ رفتہ اسی زمانے میں ہوا۔ ان کم اصل اشخاص کو شہنشاہوں کی ذاتی املاک کا انتظام سپرد تھا کیونکہ قدیم امرا پر شہنشاہوں کو بالکل اعتماد باقی نہ رہا تھا اور یہ آزاد شدہ غلام جن کی تعداد میں یونانی عنصر غالب تھا خاصے تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور معمولی کاروبار میں انھیں خاص ملکہ تھا اور شہنشاہوں کی اغراض کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ اس کے قبل بھی روما کے زمیندار اس قسم کے آزاد شدہ غلاموں کو اپنی املاک کے انتظام کے لئے مامور کرتے تھے اور چونکہ اب تمام سلطنت روما ایک ہی فرد کی ملک ہو گئی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان اشخاص کے رسوخ اور وقار میں افزائش ہوئی اور سیاسی اقتدارات بھی انھیں حاصل ہو گئے۔ مگر رومی امرا کو ان غلاموں کا عزو جاہ و اقتدار سخت ناگوار تھا اور شہنشاہوں سے ان کو جو خاص عناد تھا اس کی وجہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ انصرام معاملات سلطنت میں ان کو ضرور دخل تھا مگر کم اصلی کی وجہ سے پاس عزت بالکل نہ تھا اور نہ دیانت و امانت کا خیال تھا جس کی وجہ سے محلسرائے شاہی میں جتنی خرابیاں تھیں سب انھیں پر محمول کی جا سکتی ہیں۔

پریٹورین گارڈز یعنی محافظان محلسرائے شاہی کا بھی قیام اسی زمانے میں عمل میں آیا۔ جمہوریت کے زمانے میں شہر روما یا اس کے مضافات میں کبھی فوج نہیں رکھی جاتی تھی مگر شہنشاہوں نے اپنے ابتدائی زمانے ہی سے شہر روما کے دروازوں پر اپنے پہرے بٹھا دیئے تھے۔ ان سپاہیوں کے فرائض یہ تھے کہ محلسرائے شاہی کی حفاظت کریں اور شہر روما کے شورہ پشت عناصر کو دبائے رکھیں۔ یہ فوج صرف اطالیہ سے بھرتی کی جاتی تھی اور صوبجات کی افواج سے ان کو زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ ابتداءً تو یہ سپاہی شہنشاہوں کے وفادار خادم بنے رہے مگر رفتہ رفتہ جب ان کو اپنی قوت

کا احساس ہو گیا تو شہنشاہیت کو ان کی ذات سے ہر وقت خطرہ رہنے لگا۔

عام انتخابات کا سلسلہ ٹائی بے ریس کے عہد حکومت میں مسدود ہو گیا تھا اور ان عہدہ داروں کا اقتدار بھی باقی نہ تھا اس لیے رعایا کو ان کے بند ہو جانے کا افسوس نہ ہوا مگر سینیٹ اب بھی باقی تھی اور گئی گزری حالت میں بھی امراء روما کو اس کی رکنیت کی ہوس باقی تھی۔ اراکین سینیٹ اور شہنشاہوں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے بلکہ تین چار شہنشاہوں کا تذکرہ ہم اس باب میں کر چکے ہیں ان کے زمانہ میں علانیہ مخالفت پیدا ہو گئی۔ اراکین سینیٹ کبھی اپنی گزشتہ عظمت فراموش نہ کر سکتے تھے اور شاید وہ کوشاں تھے کہ پھر اس کی عظمت عود کر جائے اسی لیے شہنشاہ انھیں ہمیشہ باغی خیال کرتے اور آئے دن ان پر مصیبتیں ڈھاتے تھے شہنشاہ کی ذات کی حفاظت کے لئے ایک موہوم قانون نافذ تھا اور جو مخبر کسی شخص کے مقابلہ میں بغاوت کا الزام کامیابی کے ساتھ ثابت کر دیتا اس کو خزانۂ شاہی سے بیش قرار انعام ملتا۔ اراکین سینیٹ کی جان مصیبت میں رہتی کیونکہ بغاوت کے مقدمات کی سماعت میں گویا انصاف و عدالت کا مضحکہ اڑایا جاتا۔ مخبروں نے ان انعامات سے اپنے گھر بھر لیے اور امراء روما کو ان سے آزاد شدہ غلاموں سے بھی زیادہ نفرت تھی۔

سنہ ۱۴ء سے جب کہ آگسٹس نے انتقال کیا نیرو کے قتل (سنہ ۶۸ء) تک سلطنت روما کی عام حالت یہی تھی جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ نیرو کی موت کے بعد طوائف الملوکی کی صورت پیدا ہو گئی۔ افواج مقیم غالیہ و ہسپانیہ میں بغاوت پھیل گئی اور خود روما کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ نیرو کے فرار اور خودکشی کا سبب یہ تھا کہ روما میں افواج پریٹوریَن کی بغاوت کی خبر پھیل گئی تھی۔ ایک مدت تک روما پر ان کا پورا اقتدار رہا اور انھوں نے اپنے حسب خواہش ایک سن رسیدہ اور معزز رکن سینیٹ گالبا کو شہنشاہ نامزد کیا جو غالیہ کی بغاوت میں شریک تھا مگر گالبا نہایت دیانت دار اور راست باز آدمی تھا امور سلطنت میں اس نے کسی کی رو رعایت جائز نہ رکھی اور نہ سپاہیوں کو بیش قرار انعام دیئے جس کی وہ امید میں تھے بلکہ نیرو نے جو انعام اکرام دیئے تھے ان کی بھی واپسی کا حکم دیا گویا اس کی جزرسی اس کے زوال کا باعث ہوئی۔ ایک نوجوان رومی

امیسمی اوتھو نے فوج کی ناراضی سے فائدہ اٹھا کر گالبا کے خلاف سازش کرنی شروع کی اور افواج پریٹورین کو داد و دہش کی لالچ سے اپنا مطیع بنالیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گالبا قتل کیا گیا اور اوتھو اس کی جگہ پر شہنشاہ روما ہو گیا۔

مگر سیاسیات روما میں اب ایک جدید عنصر کا غلبہ شروع ہوتا ہے۔ ناظرین پر واضح ہو گیا ہوگا کہ اب سپاہی سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے ہیں۔ تغیرات مذکورہ بالا میں شہریان روما یا سینیٹ کو کوئی دخل نہیں اب تک صرف افواج پریٹورین کا دور دورہ تھا مگر اب سلطنت روما کی دوسری افواج پریٹورین افواج کے اقتدارات اور بیش قرار مشاہرات کو حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں اور ان کو احساس ہونے لگا کہ اس ابتری اور طوائف الملوکی سے صرف ایک ہی جیش کیوں نفع اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے افواج صوبجات شہر روما پر دھاوا کرنے لگیں اور سلطنت روما ان افواج کی باہمی نفاق کا شکار ہو گئی۔ سب سے پہلے جرمنی کی فوج نے جس کے سپرد شمالی سرحد کی حفاظت تھی اپنے سپہ سالار ویٹیلیس کی شہنشاہی کا اعلان کیا اور اس کے دعاوی کو تقویت دینے کے لئے اطالیہ کی طرف کوچ کر دیا۔ اوتھو نے ادھر اُدھر سے کچھ فوج جمع کی اور نوواردین سے اطالیہ کے شمال کی طرف مقابلہ کیا مگر افواج شمالی کے مقابلہ میں اس کی فوج کی کوئی ہستی نہ تھی اور ویٹیلیس شہنشاہ ہو گیا۔ مگر اس کی حالت بھی قابل اطمینان نہ تھی کیونکہ تدبیر مملکت میں اس کو بالکل دخل نہ تھا اور سپہ سالار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ شام میں جو رومی افواج تھیں وہ اس وقت بیت المقدس کے محاصرہ میں مشغول تھیں، ان کو افواج جرمنی کی کامیابی سخت شاق گزری، اس لئے انھوں نے بھی سلطنت روما پر قبضہ کرنے کے قصد سے اپنے سپہ سالار ویس پاسین کی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا اور بیت المقدس کا محاصرہ چھوڑ کر روما کا رخ کیا۔ مقام کریمونا میں دونوں افواج میں نہایت خونریز جنگ ہوئی مگر ویٹیلیس کی افواج روما کے قیام اور وہاں کی عیش پرست زندگی کی وجہ سے سست پڑ گئی تھیں اور ان کو شکست ہوئی۔ ویٹیلیس مجبوراً شہر روما کو واپس آیا اور وہاں بھی کوئی قرار واقعی مدافعت نہ کر سکا۔ حملہ آوروں نے شہر پر دھاوا کر کے اس کو لے لیا، ویٹیلیس اس معرکہ میں قتل ہوا اور ویس پاسین شہنشاہ ہو گیا۔

یہ سب واقعات ایک ہی سال میں ہوئے اور جتنے تغیرات ہوئے سب افواج کی چیرہ دستی سے ہوئے ہیں۔ ان میں شہریان روما یا سینیٹ کی اولوالعزمی یا باشندگان صوبجات کی حریت پسندی کا کوئی حصہ نہیں۔ اس زمانہ کے مورخین نے خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ افواج صوبجات کے سپاہی اطالی النسل نہ تھے اور نہ اپنے کو "شہری" خیال کرتے تھے، جو انھیں صرف غارتگری یا فوجی عزت حاصل کرنے کا خیال تھا۔ سیاسی اغراض ان کی اولوالعزمیوں سے وابستہ نہ تھیں۔ صرف غالیہ کے شمالی حصہ میں قومی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک بغاوت اس سال کے آخر میں ہوئی مگر جب ویس پاسین نے امن وامان قائم کیا تو رومی افواج نے بہت جلد اس بغاوت کو فرو کردیا۔

قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ویس پاسین کو بھی انھیں مشکلات کا سامنا ہوگا جس کی اوتھو اور وٹیلیس تاب نہ لاسکے اور شامی افواج کی کامیابی دوسری افواج کی ترغیب و تحریص کا باعث ہوگی۔ مگر جتنی بڑی فوجیں تھیں سب یکے بعد دیگرے اس قضیہ میں شریک ہوچکی تھیں۔ علاوہ اس کے ویس پاسین کی نہ صرف فوجی قابلیت نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی بلکہ وہ نہایت مستقل مزاج تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عنان سلطنت فوجی انقلابات کے سبب سے اس کے ہاتھ میں آئی مگر اس نے روما کی بہترین روایات کے مطابق حکومت شروع کی اور اس کے عہد حکومت سے روما کے بھلے دن پھر آئے۔ تمام سلطنت میں ابتری پھیلی ہوئی تھی، خزانہ خالی تھا، سینیٹ میں متعدد جائدادیں خالی تھیں اور تمام ممالک مغربی میں بدامنی تھی۔ مگر اپنے استقلال اور کفایت شعاری سے اس نے تمام افواج کو اپنا مطیع کیا، مالی حالت درست کردی بلکہ سینیٹ کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ ایک زبردست جنگ شام میں کامیابی کے ساتھ ختم ہوئی۔ ہم بیان کرچکے ہیں کہ افواج شام نے بیت المقدس کا محاصرہ چھوڑ کر روما کی طرف رخ کیا تھا مگر جیسے ہی ویس پاسین کی قوت مستحکم ہوگئی یہودیوں کے خلاف جنگ شروع کردی گئی۔ یہودیوں اور رومیوں کے تعلقات ہمیشہ سے نازک تھے جس کا سبب یہ تھا کہ یہودی خود نہایت شوریدہ پشت اور راہبت سے تھے نہ یہ کہ رومی ان پر ظلم کرتے تھے۔ یہودیوں نے سنہ ۶۶ء میں بغاوت کی مگر ابتدا ہی سے یہ ظاہر تھا کہ ان کے ذرائع اس قدر وسیع نہ تھے کہ سلطنت روما کی

مجموعی قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ سنہ ۶۹ء کی خانہ جنگی سے یہودیوں کو کچھ دن کے لیے چین مل گیا مگر سنہ ۷۰ء میں ویسپاسین نے مہم اپنے بیٹے ٹٹس کے سپرد کیا۔ یہودی غایت شجاعت اور بہادری سے لڑے مگر ان میں خود آپس میں پھوٹ پڑ گئی تھی جس سے وہ اور بھی ضعیف ہو گئے تھے۔ آخرکار رومیوں نے دھاوا کر کے بیت المقدس پر بے حد کشت و خون کے بعد قبضہ کر لیا اور تصفیہ کیا کہ یہ متبرک شہر مسمار کر دیا جائے اور یہودیوں کو اس کی دوبارہ تعمیر کی اجازت کبھی نہ دی جائے۔ رومی فوج کا ایک دستہ اس کے مضافات میں متعین کر دیا گیا۔ ظفریاب ٹٹس روما واپس ہوا اور کچھ روز بعد اپنے باپ کے مرنے پر اس کے تخت و تاج کا وارث ہوا۔ یہودی اس سے قبل بھی تمام سلطنت روما میں پھیلے ہوئے تھے مگر سقوط بیت المقدس سے ان کا مذہبی مرکز اور جائے اجتماع ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس واقعہ کے بعد سے تاریخ یورپ انکے مصائب پریشانی مظلومی اور دولت کی عجیب و غریب داستانوں سے پر ہے۔

ٹٹس نے صرف دو سال یعنی سنہ ۷۹ء سے سنہ ۸۱ء تک سلطنت کی اور اس کے بعد اس کا بھائی ڈومی شیان شہنشاہ ہوا (سنہ ۸۱ء۔ سنہ ۹۶ء) اس کی عہد حکومت میں ابتدائی شہنشاہوں کی بے اعتدالیوں کا پھر کچھ نقشہ آگیا۔ روما میں پھر ابتری اور پریشانی پھیل گئی، کسی کو اپنی جان کی خبر نہ تھی، مخبروں کا بازار گرم تھا، ناکردہ گناہوں پر بغاوت کے الزام عائد کیے جاتے تھے اور ادھر محلسرا میں رنگ رلیاں منائی جانے لگیں اور سازشیں ہونے لگیں۔ اس بادشاہ کے عہد حکومت کا روما کی ترقی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور آخرکار اس کے خلاف ایک سازش ہوئی جس میں اس کی بیوی، اس کے آزاد شدہ غلام اور افواج پریٹوریَن سب کے سب شامل تھے اور قاتل کے خنجر نے اس کا کام تمام کر دیا۔

بابِ ہفدہم

عہدِ شہنشاہانِ اینٹونائن

ڈومی ٹین کی موت کے بعد شہنشاہی روما میں ایک مبارک دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں تمام سلطنت ہر قسم کے قضیوں اور بدامنی سے پاک رہی اور اس عرصہ میں یعنی ۹۶ء سے ۱۸۰ء تک جتنے شہنشاہ تختِ روما پر جلوہ افگن ہوئے سب مستقل مزاج نکوکردار اور کارآزمودہ تھے۔ یہ زمانہ دورِ عہدِ شہنشاہانِ اینٹونائن کے نام سے مشہور رہا ہے مگر اینٹونینس صرف دو آخری شہنشاہوں کا نام تھا۔ اس ۸۰ سال کے زمانہ میں شاہانِ سابقہ کے عہد کی بدامنی کا گویا بالکل خاتمہ ہوگیا، نہ کوئی خانہ جنگی ہوئی نہ کوئی شہنشاہ قتل کیا گیا اور مجلسِ اعیانِ شاہی کی حالت بھی بہ نسبت سابق بہت بہتر تھی۔ تمام رومی دنیا پر ایک عالمِ سکون طاری تھا مگر یہ سکون وہ تھا جو طوفان کے قبل ہوتا ہے کیونکہ تیسری صدی عیسوی میں سلطنتِ روما زیروزبر ہوگئی۔

اس عہد میں پانچ شہنشاہ گزرے ہیں۔ جانشینی کا مشکل مسئلہ بھی اس طرح حل ہوگیا تھا کہ شہنشاہ کسی سربرآوردہ ملکی عہدہ دار کا انتخاب کرکے اس کو اپنا بیٹا بنالیتا اور اگر اس کا چال چلن ٹھیک ثابت ہوتا تو کچھ دن بعد اس کو اپنا ولی عہد قرار دیتا۔ شہنشاہ کو اس طرح اپنے جانشین کی تربیت کا موقع ملتا اور یہ بھی اندازہ کرسکتا کہ رعایا اس کے انتخاب پر صاد کرتی ہے یا نہیں۔ تبنیت کا طریقہ اس زمانہ میں ایسا کامیاب ثابت ہوا کہ تعجب ہے کہ زمانۂ حال میں کسی ریاست نے جانشینی کا یہ عمدہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ مگر باایں ہمہ اس طریقہ کا نفاذ از روئے قانون نہیں کیا گیا تھا

بلکہ شہنشاہوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ان شہنشاہوں میں سے ایک نے باوجود اپنے فرزند کی موجودگی کے دوسرے شخص کو اپنا جانشین نامزد کیا۔

اس مبارک عہد میں شہنشاہوں اور سینیٹ کے درمیان جو سخت مخالفت عرصہ سے چلی آرہی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ نہ مخبروں کی مخبریاں باقی رہیں، نہ بغاوت کے مقدمے، نہ خودکشیاں، نہ قتل۔ شہنشاہوں اور سینیٹ کے خوشگوار تعلقات دستوری تغیرات سے نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ واقعات گزشتہ کے سبب سے ارکین سینیٹ کے حوصلے پست ہو گئے تھے اور شہنشاہ بھی ان کا لحاظ رکھتے اور ان کی خدمات سے مستفید ہوتے۔ کشیدگی پھر بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتی مگر زیادہ تر ہم اس عہد میں دیکھتے ہیں کہ سینیٹ شہنشاہ کے ساتھ وفاداری سے پیش آتی ہے۔

صوبجات میں بھی حکومت شہنشاہی موجب فلاح و برکت ہو چلی تھی اور وہاں کے باشندے اپنے آپ کو روما کا ماتحت نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اطالیہ اور خود روما کے ہمسر خیال کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس عہد کے پہلے شہنشاہ کے سوا اس کے جانشین سب صوبجات کے رہنے والے تھے اور جن شہنشاہوں کی حکومت سے سلطنت روما کو اس درجہ کا فلاح ہوا ان کا زاد و بوم ہسپانیہ تھا۔ اس زمانے سے سلطنت روما کے شہنشاہ اور صوبہ دار زیادہ تر صوبجات کے باشندے ہوتے ہیں اور دارالخلافہ روما یا اطالیہ سے شاذ و نادر۔ حکومت بلدی کو بھی اس زمانہ میں خوب فروغ ہوا۔ جن جن مقامات کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد حکومت بلدی قدیم انتظامات کی جگہ لے رہی ہے گویا سلطنت روما آزاد بلدیات کا عظیم الشان مجموعہ بن رہی تھی جن میں بحیثیت شہنشاہوں کی حکومت مرکزی سے قائم تھی۔

ہم متعدد مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ دور شہنشاہی کی نمایاں خصوصیت قیام امن تھی مگر اس درجہ کسی عہد میں نہ تھی۔ ٹریجن کے زمانے میں سرحدات ڈینیوب و فرات کے پار اہم محاربات ہوئے اور مارکس آریلیس کے عہد کے آخری سالوں میں جرمن اقوام کے پرخطر حملے شروع ہو گئے۔ مگر یہ سب سلطنت کی سرحدوں کے باہر تھے

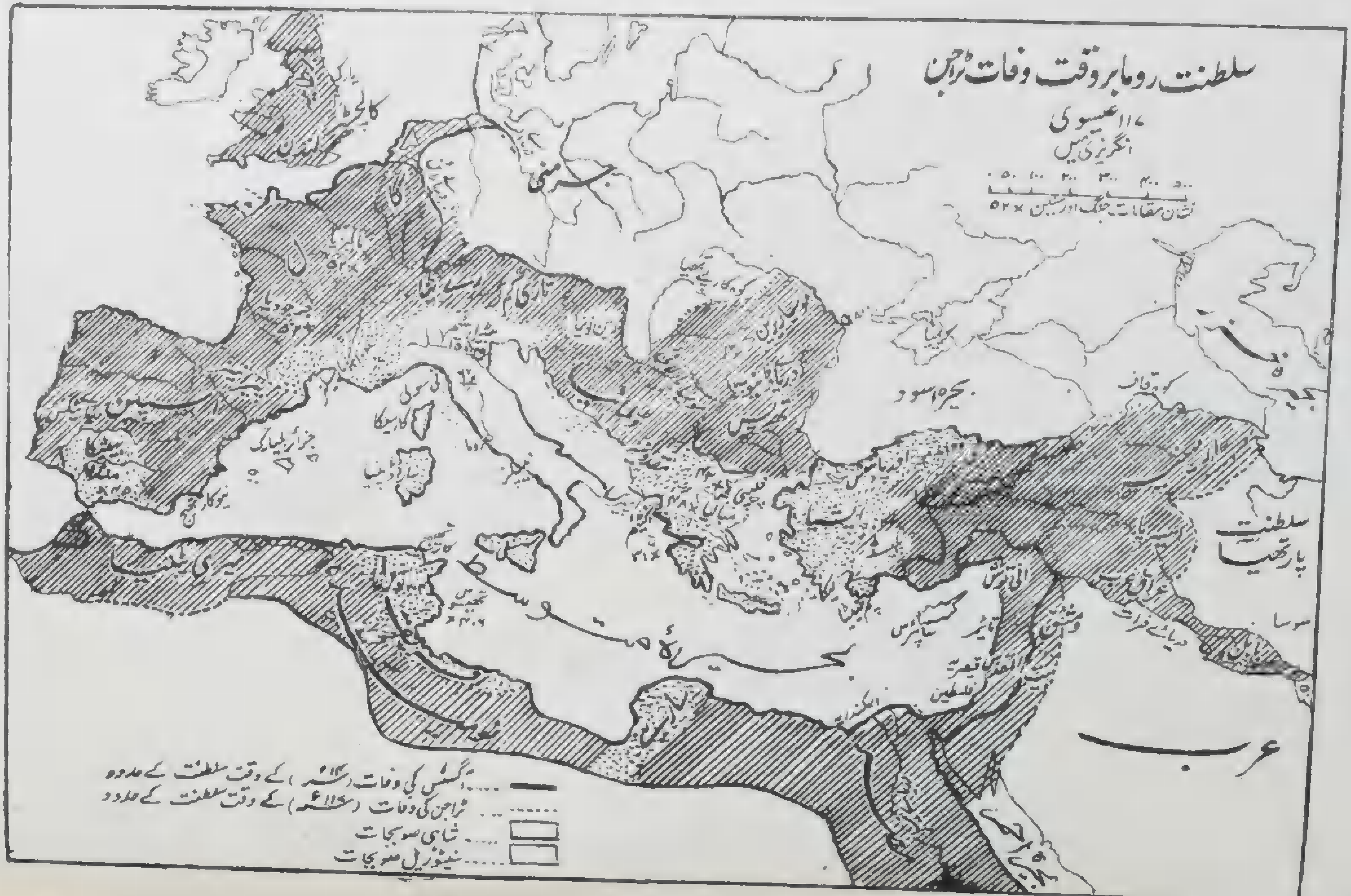
اور ہیڈرین اور انیٹونینس پائس کے زمانہ میں ایک جنگ بھی نہ ہوئی۔ تاریخ یورپ میں کوئی زمانہ نہیں گزرا ہے جس میں اتنے طویل عرصہ تک اور ایسے وسیع رقبہ میں کسی قسم کی فوجی تحریک نہ ہوئی ہو۔

باوجود اس امن و امان اور سکون کے علمی ترقی کا دروازہ بھی بند نہ ہوا تھا بلکہ لاطینی ادبیات کو دوبارہ فروغ ہوا اور جووینل (شاعر) ٹیاسی ٹس (مورخ) اور پلینی اسی دور علمی کے درخشاں ستارے تھے۔ فنون بت تراشی اور تعمیر میں اس عہد کے صناعوں نے اپنے جوہر خوب دکھائے۔ روما اور دوسرے مقامات کے عجائب خانوں میں عہد قدیم کی جو اشیاء محفوظ ہیں ان میں سے بہترین اسی دور کی صناعی کے نمونے ہیں اور زیادہ تر شہنشاہ ہیڈرین کے محل کی صناعیوں کے ٹکڑے ہیں۔ ادبیات اور فنون لطیفہ کے علاوہ عالم مذہبی میں بھی بحث و مباحثہ کا بازار گرم تھا۔ قوانین رومائی ترتیب و تدوین کا سلسلہ بھی ہیڈرین ہی کی حکومت سے شروع ہوا۔ فلسفہ یونان اور خصوصاً فلسفہ رواقیین کا فیض رساں اثر رومی بت پرستوں میں بڑھنے لگا کلیسۂ مسیحی بھی باوجود دوسرے مذاہب کی سخت مخالفت اور اندرونی مناقشات کے ترقی کر رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ طاقت اور تقویت حاصل کرے جو آخر کار ان شہنشاہوں کی قائم کردہ حکومت اور تمدن کے زوال کا باعث ہوئی مگر اس تمدن میں تخم زوال کے عناصر موجود تھے اور ایسی سیاسی، مذہبی اور معاشی تحریکیں پیدا ہو گئیں تھیں جن سے اس تمدن میں انقلاب لازمی تھا۔ مگر جب تک یہ مبارک دور قائم رہا اس کی مقبولیت اور پسندیدگی میں کوئی کمزوری واقع نہ ہوئی اور بقول گبن اگر کسی فلسفی سے پوچھا جائے کہ تاریخ انسانی میں وہ کس دور کو ایسا خیال کرتا ہے جس میں بنی نوع انسان سب سے زیادہ عافیت میں رہے ہوں تو بلاخرخشہ وہ جواب دے سکتا ہے کہ وہ شاہان انیٹونائن کا عہد تھا۔

اب ہم ان شہنشاہوں کی حکومت کے مختصر حالات بیان کرینگے۔ اس سلسلہ کا پہلا شہنشاہ نروا اراکین سینیٹ میں سے تھا۔ یہ شخص صلح جو طبیعت کا آدمی تھا اور مختصر مگر بابرکت حکومت کے بعد ٹریجن کو اپنا جانشین بنا کر ملک عدم کو چل بسا۔ ٹریجن سنہ ۹۸ء میں تخت نشین ہوا جو شہنشاہان روما میں عظیم ترین اور قابل احترام ہے۔ اس کی نیک نیتی کا

یہ عالم تھا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں ایک روایت مشہور تھی کہ بت پرستوں میں صرف ٹریجن بہشت میں داخل ہوسکیگا۔ اگر اس کی حکومت داخلی پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی سعی بلیغ تھی کہ ٹیکس کم کردیئے جائیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ریاست کا خزانہ معمور رہتا تھا۔ سینیٹ کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے یہاں تک کہ اس کے مداح نے کہا ہے کہ وہ سلطنت روما کا آقا نہ تھا بلکہ اراکین سینیٹ کا سرگروہ تھا۔ مسلسل خانہ جنگیوں سے ملک اطالیہ ویران ہوچلا تھا۔ ٹریجن اس کی سرسبزی اور آبادی میں ہمیشہ کوشاں تھا۔ یتامٰے کی پرورش کا بھی اس نے خاص انتظام کیا۔ پلنی ایک رومی ادیب اور مصنف گزرا ہے جس کا ہم تذکرہ کرچکے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں ایک صوبے کا حاکم اعلیٰ تھا اور شہنشاہ سے خط و کتابت رکھتا تھا۔ ان خطوط سے ظاہر ہے کہ صوبجات کے نظم و نسق کے ذیلی امور پر بھی اس کی نگاہ رہتی تھی اور باشندگان صوبجات کی راحت و آسائش اور مرکزی حکومت کا وقار قائم رکھنے کا اسے ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ شہر روما کی آرائش و تزئین کے لئے متعدد مندر، مینار اور کمانیں بنوائیں مگر اپنے پیشروں کی طرح اس نے تعمیرات کا شوق رعایا پر محصولات کا بار گراں ڈالکر پورا نہیں کیا۔

ٹریجن کے زمانۂ حکومت میں رومی افواج غیر ملکوں میں جنگ و جدال میں مصروف تھیں اور اپنی فتوحات سے انھوں نے ثابت کردیا کہ ان کے ضبط اور بنرد آزمائی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہے۔ شہنشاہ ٹریجن خود نہایت قابل سپہ سالار تھا۔ پہلی مرتبہ وہ اپنی افواج ڈینیوب کے پار کے ملک میں لے گیا جسے رومی ڈیشیا کہتے تھے اور جو زمانا رومانیہ کہا جاتا ہے۔ اس اطراف کے وحشیوں نے رومی صوبجات میں لوٹ مار مچا رکھی تھی اور چونکہ ان کے ملک میں سونے کی کانیں تھیں اس لئے رومی نوآباد اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان محاربات کے تفصیلی حالات ضبط تحریر میں نہیں لائے گئے ہیں مگر ٹریجن کا بنایا ہوا ایک مینار روما میں اب تک موجود ہے جس پر اس کی افواج کی نقل و حرکت کے نظارے اب تک منقوش ہیں۔ جنگ مذکور میں ٹریجن کو آسانی سے فتح حاصل نہیں ہوئی۔ پہلے تو دریائے ڈینیوب پر اسے سنگی پل بنانا پڑا۔ یہ پہلا پل ہے جو تاریخ عالم میں مذکور ہے۔ کئی لڑائیوں کے بعد شاہ ڈیشیا مارا گیا اور ڈیشیا بھی ایک رومی صوبہ ہوگیا۔ اس جنگ کے کچھ زمانے کے بعد رومیوں کو اپنی پوری قوت پارتھیا



سلطنت روما بروقت وفات ٹراجن
۱۱۷ عیسوی
انگریزی میل
جرمنی
بحیرۂ اسود
بحیرۂ متوسط
سلطنت پارتھیا
عرب
آگسٹس کی وفات (۱۴ء) کے وقت سلطنت کے حدود
ٹراجن کی وفات (۱۱۷ء) کے وقت سلطنت کے حدود
شاہی صوبجات
سینیٹوریل صوبجات

کے خلاف میں صرف کرنا پڑی۔ یہ جری قوم ایرانی نسل سے تھی۔ ایرانی یونانیوں سے ہزیمت اٹھا چکے تھے مگر کئی پشتوں سے یہ قوم رومیوں کی خطرناک دشمن ہو گئی تھی اور کئی دفعہ رومی افواج کو ہزیمت دیکر ان کے علم چھین چکی تھی۔ مگر جب رومیوں نے اپنا پورا زور لگا دیا تو پارتھی ان کے مقابلہ سے عاجز آ گئے اور ۱۱۵ء میں ٹریجن فاتحانہ عراق میں داخل ہوا۔ شہر بابل اس نے فتح کر لیا اور صوبجات آرمینیا اور عراق سلطنت روم میں شریک کر لیے۔ انھیں مشرقی مہمات میں اس زبردست شہنشاہ نے ۱۱۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ٹریجن کے انتقال کے بعد اس کا پسر متبنےٰ ہیڈرین مالک تخت و تاج ہوا جو ہسپانی الاصل تھا۔ ہر ملک کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور روم کی نسبت ایتھنز میں اس کو زیادہ لطف آتا۔ اپنی دوران حکومت میں اس نے اپنی تمام سلطنت کا دورہ کیا اور شاید ہی کوئی صوبہ بچ گیا ہو جس کی نظم و نسق مالیات اور سرحدات کی حفاظت میں اس کے معائنہ سے اصلاح نہ ہوئی ہو۔ برطانیہ میں جو فصیل رومیوں نے دریائے ٹائن سے دریائے سالوے تک بنائی تھی اس کی تعمیر اسی کی طرف منسوب کی جاتی ہے گو زمانۂ مابعد کے حکام نے اس کی توسیع کی ہے۔ اس کا قول تھا کہ میں سلطنت کو اپنی ذاتی جائداد خیال نہیں کرتا بلکہ اس کو قوم رومی کی ملک سمجھتا ہوں اور شاید ہی کسی جمہوری سلطنت کے میر مجلس نے اپنے فرائض اس خوبی سے ادا کئے ہوں۔ مگر عہد جمہوری کے رومیوں سے اس کی خصائل بالکل متضاد تھیں۔ فنون لطیفہ سے اسے انہماک تھا۔ فلسفے اور مذہب کے پیچیدہ مسائل پر وہ نہایت کاوش کے ساتھ غور کیا کرتا تھا اور خانگی زندگی میں قدیم رومیوں کے سخت اخلاق کا پابند نہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں صرف یہودیوں کے سبب سے کچھ نقض امن ہوا۔ سلطنت کے جنوبی مشرقی حصہ میں یہودیوں کی تعداد کثیر تھی اور باوجود سقوط بیت المقدس انھیں اب بھی امید تھی کہ ان کی قوم دنیا میں پھر سرخرو ہو گی جس کی وجہ سے مصر اور قبرص میں ان کا قتل عام ہوا اور فلسطین میں ان کی بغاوت فرو کی گئی۔ فوج کی حالت وہی تھی جو ٹریجن کے زمانہ میں تھی مگر ہیڈرین نے صوبجات آرمینیا اور عراق پر سے رومی قبضہ اٹھا لیا غالباً اس کا سبب یہ ہو گا کہ سرحد مشرقی پر رومیوں کو آئے دن کی لڑائیوں سے گلوخلاصی ہو جائے مگر صوبۂ ڈیشیہ پر اس نے اپنا قبضہ بحال رکھا کیونکہ رومی آبادکاروں

کی تعداد کثیر وہاں اقامت گزیں تھی یا اس لیے کہ وہاں سونے کی کانیں تھیں۔
نظم ونسق سلطنت میں بھی ہیڈرین اہم تغیرات عمل میں لایا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ
شاہان سابق نے اپنے آزاد شدہ غلاموں کو ذمہ داری کی خدمتیں سپرد کر رکھی تھیں۔
یہ طریقہ نقص سے خالی نہ تھا اور اس کی وجہ سے امراء میں برافروختگی پھیل گئی تھی۔ ہیڈرین
نے بجائے اس کے باضابطہ نظام انتظامی رائج کیا اور عہدے قائم کئے جنھیں اعلیٰ طبقات
کے افراد قبول کر سکیں۔ ملازمت سرکاری امرائے روما کے لئے اب باعث اعزاز خیال
کی جانے لگی۔ مگر آئندہ چل کر ہمیں معلوم ہوگا کہ ایک صدی بعد ان عہدہ داروں کے
اختیارات بہت بڑھ گئے یہاں تک کہ ان کا وجود سلطنت کے لئے مضر ہوا اور اس
کے زوال کا باعث ہوا۔ لیکن ہیڈرین کے زمانہ میں اور ایک عرصہ تک اس کے بعد
بھی اس جدید نظام سے عمدہ نتائج مترتب ہوتے رہے اور رعایا پر کوئی مزید بار ان
عہدہ داروں کے سبب سے عاید نہ ہوا۔ ہیڈرین نے اپنے پیشرو کے کار خیر جاری
رکھے اور غلاموں پر ان کے مالکوں کے جو اختیارات تھے بہت کچھ گھٹا دیئے گئے۔
ہیڈرین کو بھی تعمیرات کا شوق تھا۔ شہر روما اور صوبجات کے بڑے بڑے شہروں
میں اس نے عظیم الشان عمارتیں بنوائیں اور روما سے چند میل کے فاصلہ پر ایک عالیشان
قصر تیار کرایا مگر ٹریجن کی طرح ہیڈرین نے بھی اپنا شوق پورا کرنے کے لئے رعایا پر
بھاری محصول نہیں لگائے۔ ہیڈرین کی موت (۱۳۸ء) کے بعد اس کا پسر متبنیٰ
انٹونینس پائس تخت نشین ہوا اور ۲۳ سال تک برسر حکومت تھا۔ اس کے خصائل
حمیدہ اور حسن ادائے فرائض کی خود اس کے مشہور جانشین نے بے حد تعریف کی ہے۔
اس کے دوران حکومت میں نقض امن کی کوئی مثال نہیں ملتی یہاں تک کہ یہ دعوے
کیا گیا ہے کہ ۲۳ سال کی حکومت میں نہ کسی رومی کا خون بہا نہ کسی غیر ملکی کا۔ اپنے
پیشرو کی طرح وہ بھی غلاموں کے مصائب رفع کرنے میں کوشاں تھا۔ باشندگان
صوبجات کو شہریت روما کے حقوق اس نے نہایت فیاضی سے دیے اور قوانین روما
کی تدوین اس کی وجہ سے ہوئی۔
اس شہنشاہ نے ۱۶۱ء میں انتقال کیا اور اس کا پسر متبنیٰ مارکس آریلیس اس
کا جانشین ہوا اور ۱۸۰ء تک حکمراں تھا۔ اسی کے زمانہ میں سلطنت روما کی خوشحالی

میں کیڑا الگ گیا اور اسے خود شمال کی وحشی اقوام سے کئی خونریز مقابلے کرنے پڑے گو اس میں کامیابی اسی کو ہوئی۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق اس کے فتوحات کے نظارے ایک کالم پر منقوش ہیں جو شہر روما کے ایک چوک میں اب تک موجود ہے۔ مگر زمانۂ حال میں اس کی شہرت اس کے فوجی کارناموں کے سبب سے نہیں ہے بلکہ فلسفی اور مذہبی تخیلات کی ایک چھوٹی سی کتاب پر ہے جس میں اس کے متفرق نوٹ اس کے انتقال کے بعد جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ تخیلات گویا فلسفۂ رواقی کا ایک مجموعہ ہیں جس میں عملی اور مذہبی پہلو پر زیادہ تر بحث کی گئی ہے۔ سلطنت روما کی دوسری نظام ہائے فلسفہ کی طرح رواقیت کی بنیاد بھی یونان میں پڑی تھی۔ اس فلسفہ کا مقصد یہ تھا کہ عالم طبعی کا رمز دریافت کیا جائے مگر اس کے معتقدین ایک قادر مطلق کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ ابتداءً اس کے ماننے والے اصول اخلاق کی پابندی نہایت سختی کے ساتھ کرتے تھے جو بعض وقت مبالغہ کی نوبت پہنچ جاتی اور بعض ان میں سے ریاکار بھی تھے۔ شہنشاہی کے ابتدائی زمانے میں ان لوگوں نے شہنشاہوں کی نہایت سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی۔ کیٹو اور سیزر کے قاتلوں کے بیحد مداح تھے اور بادشاہوں کے قتل اور خودکشی کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے نیرو اور ویسپاسین کے زمانے میں یہ گروہ نہایت مطعون ہوا اور اس پر ظلم بھی ہوئے مگر اب امن و امان سے گزر رہی تھی اور ان کے عقائد میں وہ افراط و تفریط باقی تھی۔ اس فلسفہ کے مبلغین میں دو شخص سر برآوردہ سمجھے جاتے ہیں ایک تو سنیکا جو نیرو کا وزیر تھا اور پھر اس کے ظلم کا نشانہ بنا اور دوسرا اپےکٹیٹس ایک یونانی غلام جو ویسپاسین کے دور حکومت میں روما میں موجود تھا۔ مارکس آریلیس کے ساتھ تو یہ فلسفہ یا مذہب گویا سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس مذہب کی عظمت بھی گویا اس تلاطم کی نشانی ہے جو لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں پیدا ہو رہا تھا اور جس کی طرف ہم پھر اشارہ کرینگے۔

مارکس آریلیس کی تحریر کے بموجب فلسفۂ رواقی کے عقائد حسب ذیل تھے۔

دنیا مظہر ہے ایک فوق الانسانی ذات کی قوت ارادی کا مظہر ہے جس کے آگے انسان کو بطیب خاطر سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ انسان کی قوت ارادی اور قوت فکر کو بیرونی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے انسان کی خوشی اسی کے ہاتھ میں ہے اور حقیقی خوشی سکون

قلب اور نشیب و فراز زندگی سے دماغ کو بالکل الگ تھلگ رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مگر ان عقائد کے علاوہ اس کے تخیلات سے ظاہر ہے کہ نہایت ہی حلیم الطبع تھا، اخوت انسانی کا اسے بہت خیال تھا اور تمام بنی نوع انسان کو بلا لحاظ قومیت، مذہب یا طبقہ مستفید کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس فلسفہ سے اسے کامل روحانی تشفی حاصل نہیں ہوئی اور گو مسیحیت کو اس نے پسند نہیں کیا اور مسیحیوں پر مظالم بھی کیے مگر اس کا مطمح نظر مسیحی عقائد سے قربت رکھتا تھا۔

اس کے عہد حکومت کے دوسرے واقعات کا تفصیلی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ شمالی وحشیوں سے خطرہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس زمانے میں ایک وبا تمام سلطنت روما میں پھیل گئی اور اس نے تمام سلطنت روما کو ویران کر دیا۔ شہنشاہ میں فوجی مادہ بہت کم تھا مگر اس خطرے کا اس نے بہادری سے مقابلہ کیا اور آخر میں کامیاب رہا۔ دشمن کو کوہ آلپس کی وادیوں میں متعدد شکستیں ہوئیں مگر اثنائے جنگ میں اس پر خود بھی وبا کا اثر ہو گیا اور ۱۸۰ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے مرتے ہی شاہان اینٹونائن کا قائم کردہ نظام سلطنت زیر و زبر ہو گیا۔ اس کی موت اس پراگندگی کا باعث نہ تھی بلکہ اس کی پہلی نشانی۔

باب پنجم

شہنشاہیت روما کا زوال

مارکس آریلیس کی موت کے بعد شہنشاہیت کے برے دن شروع ہوگئے۔ شہنشاہان انٹونائن کے زمانہ کے امن وامان اور خوش حالی کے بجائے خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور تیسری صدی عیسوی میں وحشیوں کے حملے کا آغاز ہوا۔ اس انقلاب اور سلطنت روما کے زوال کے اسباب پر اب ہم غور کریں گے۔

سلطنت روما کا زوال کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا کیونکہ کوئی انقلاب یا شکست یا کوئی عنصر و واقعہ ایسا نہیں ہے جس کی طرف اسے منسوب کیا جائے اور یہ بھی تیقن کے ساتھ کہنا دشوار ہے کہ کب اور کس سنہ میں سلطنت روما کا خاتمہ ہوا۔ سنہ ۴۱۰ء میں قوم گاتھ کے سردار الارک نے روما پر قبضہ کر لیا مگر سلطنت روما اس سانحۂ عظیم کے بعد بھی قائم تھی۔ سنہ ۴۷۶ء میں شہنشاہیت کا سایہ اطالیہ سے اٹھ گیا اور بعض لوگ اسی تاریخ سے شہنشاہیت روما کا اختتام شمار کرتے ہیں مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ سلطنت قائم تھی صرف اس کا دارالسلطنت روما سے قسطنطنیہ کو منتقل ہوگیا اور شہنشاہیت کا سب سے بڑا کارنامہ یعنی ترتیب قوانین روما کی تکمیل اسی تاریخ کے بعد عمل میں آئی۔ سنہ ۸۰۰ء میں باوجود اس کے کہ شاہان قسطنطنیہ شہنشاہ ہونے کا دعوے کرتے تھے چارلس اعظم نے ایک دوسری شہنشاہیت روما قائم کی۔ شہنشاہیت روما شرقی کا ترکوں نے سنہ ۱۴۵۳ء میں کام تمام کردیا اور گبن نے اپنی تاریخ عظیم اس واقعہ پر ختم کی ہے۔ مگر جب قسطنطنیہ کی دیواروں پر ہلال کا نشان ہلالی اڑنے لگا اس وقت بھی جرمنی میں سلطنت روما مقدسہ قائم تھی جو شہنشاہان

روما کی نام لیوا تھی اور اس کا سلسلہ ۱۸۰۶ء تک جاری تھا۔ ۱۸۰۶ء کے بعد سے کسی سلطنت نے شہنشاہیت روما مقدسہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے مگر زمانۂ حال کی شہنشاہیت جرمنی میں اس کی قدیم روایات اب تک موجود ہیں اور اس سلطنت کو شہنشاہیت روما کا جانشین خیال کرنا چاہیئے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ سلطنت روما کا کسی سانحۂ عظیم سے خاتمہ ہو گیا اس میں مسلسل تغیرات ہوتے رہے اور باوجود ان تغیرات عظیم کے وہ فنا نہیں ہوئی۔

زوال سلطنت روما سے اصل میں مراد یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی صدیوں میں اس کی قدیم خصوصیات بالکل مسخ ہو گئیں یعنی دین مسیحیت کو مذہب شاہی ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اضلاع مغربیہ پر وحشی حکمرانوں کا غلبہ ہو گیا اور تمدنی حالات میں انقلاب عظیم ہوا۔ شہنشاہان انٹونائن کے عہد کا امن و امان ہمیشہ قائم نہ رہ سکتا تھا اور نہ انتظامات ہمیشہ تک قائم رہ سکتے تھے۔ نظم و نسق کے زیر و زبر ہو جانے کا سبب یہ نہیں تھا کہ باشندگان صوبجات نے روما کا جوا اپنے کندھے سے اتار دیا کیونکہ رومیوں کی مدبرانہ روش کے سبب سے ان کو روما سے کسی قسم کی رنجش نہ تھی۔ نہ اس کا یہ سبب تھا کہ باشندگان سلطنت کے اخلاق خراب ہو گئے تھے گو عام طور سے یہی خیال ہے کیونکہ مذہب مسیحی کی ترقی سے شہنشاہیت کے اخلاق بجائے خراب ہونے کے درست ہو گئے تھے۔ جن وجوہ سے سلطنت روما کا زوال ہوا ان کی اہمیت کے متعلق اختلاف ہے مگر جو اسباب ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں اہم ترین ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شہنشاہوں کی نیک نیتی میں تو شبہہ نہیں مگر باوجود اس کے وہ بالکل مطلق العنان تھے۔ خود شہر روما میں حکومت خود اختیاری کا وجود نہ تھا۔ دوسرے شہروں میں مقامی آزادی ایک حد تک تھی مگر شہنشاہان انٹونائن نے اس پر بھی بہت دراز دستی شروع کر دی تھی گو ان کی مداخلت نیک نیتی پر مبنی تھی۔ بالائی انتظامیاں رہ گئے اور اپنے اقتدارات قائم رکھنے کے لئے انھوں نے ہر شہر میں عہدہ دار مقرر کر دیئے تھے اور رفتہ رفتہ یہ شہر بجائے آزادی کے مرکز ہونے کے شہنشاہی املاک کی نشستوں کے مرکز ہو گئے۔ اس افسوسناک حالت کے پیشتر سے قبل بھی آزادی تقریر اور اختیار تمیزی کا وجود مفقود تھا اور رعایا کی

خواہشات یا ان کی ضروریات کے احساس کا کچھ خیال نہ تھا۔ قوانین روما کا اصول یہ تھا کہ قانون شہنشاہ کی قوت ارادی کا مظہر ہے۔ اس طرح گویا شہنشاہیت قطعی اور کامل حکومت مطلق العنان تھی اور تاریخ سے ثابت ہے کہ ایسی حکومتیں نفع بخش ہوتی ہیں مگر ان کا زوال فوری اور کامل ہوتا ہے۔

ان سیاسی اسباب کے علاوہ فوج میں بھی ابتری پھیل رہی تھی۔ ایک زمانہ سے فوجوں میں روما اور اطالیہ کے باشندوں کی بھرتی بند ہو گئی تھی اور سرحدات کی محافظ سپاہ صوبجات سے فراہم کی جاتی تھی۔ روما کے ان سپاہیوں نے وفاداری سے خدمت کی مگر ظاہر ہے کہ اطالیہ سے انھیں کوئی خاص انس نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ابتدا ہی سے رومیوں نے غیر ممالک کے لوگوں کو جنھیں وہ حقارت سے وحشی کہتے تھے اپنی افواج میں شریک کر دیا تھا۔ وحشی باقاعدہ افواج میں شریک نہیں کئے جاتے تھے بلکہ رسالوں یا ذیلی افواج میں اور جب مدت دراز تک رومی افواج میں نوکری کر کے وہ اپنے وطن کو واپس ہوتے تو رومیوں کے فن حرب اور ہتھیاروں سے بخوبی واقف ہو جاتے اور اپنے ہموطنوں کو سکھاتے۔ اس طرح یہ وحشی رفتہ رفتہ رومیوں کے مدمقابل ہو گئے اور آخر کار ان وحشیوں نے رومیوں کا قلع قمع انھیں کے ہتھیاروں اور انھیں کے طریقہ جنگ سے کیا۔ اس طرح سے جتنی وحشی اقوام نے سلطنت روما پر حملہ آوری کی ہے ایک نہ ایک وقت میں یا تو روما کے حریف رہے ہیں یا اس کی افواج میں سپاہی تھے۔ اس قسم کے واقعات تاریخ میں کئی بار ہوئے ہیں مثلاً جیسے کہ رومیوں کے شاگرد ان کی تخریب کا باعث ہوئے اسی طرح زمانۂ مابعد میں نپولین کو انھیں ذرائع سے شکست ہوئی جو اس کی ابتدائی فتوحات کا باعث ہوئے تھے۔

یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ سلطنت میں غلاموں کی تعداد کثیر تھی۔ ان کی حالت روبہ ترقی تھی۔ شہنشاہوں نے ایسے قوانین نافذ کئے تھے جن سے ان کے مصائب رفع ہوں۔ بلکہ یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ غلامی کا طریقہ موقوف ہو جائے یا کم از کم اس کی صورت بالکل بدل جائے۔ مگر ظاہر ہے کہ غلاموں کو سلطنت کے قیام و زوال میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اس لئے غلامی کا وجود بھی سلطنت روما کے متزلزل ہونے کا ایک سبب ہے۔

مگر اصل بات یہ ہے کہ جن سیاسی اور فوجی وجوہ کا ہم ذکر کر آئے ان سے کہیں زیادہ حصہ سلطنت روما کی بنیاد کمزور کرنے میں مذہبی تحریکات کا ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ شہنشاہان انٹونائن کے پر امن عہد میں مذہبی دنیا میں سخت تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ اور مختلف فلسفیانہ عقائد کی روما کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اشاعت ہو رہی تھی ان میں سے فلسفہ ہائے رواقی و فیثاغورث قابل ذکر ہیں۔ فلسفۂ فیثاغورث میں تصوف کا رجحان زیادہ تھا فلسفۂ رواقی کا ذکر گزشتہ باب میں آچکا ہے۔ مگر فلسفہ سے زیادہ مذہب کا اثر ہے۔ بت پرستی میں بھی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ سسرو کے عہد میں مذہب کی طرف سے بددلی پیدا ہو گئی تھی اور لامذہبی کا زور تھا مگر اب ان میں بھی ایک قسم کے تصوف کا رواج ہو گیا تھا۔ مشرقی مذاہب کے مقابلہ میں مقامی دیوتاؤں کا رنگ پھیکا ہو رہا تھا۔ مصری دیوتاؤں اور سائبلی کی پرستش کا اطالیہ اور ممالک مغربی میں رواج ہو چکا تھا۔ گو تیسری صدی میں بت پرستوں میں سب سے زبردست مذہبی تحریک متھرازم کے نام سے موسوم ہے۔ اس مذہب کا ایران میں آغاز ہوا اور آفتاب پرستی اس کا جزو اعظم تھا مگر اس میں بھی تصوف کا رنگ اور قوت الٰہی کا احساس پیدا ہو گیا۔ تیسری صدی میں یہ مذہب گویا ایک مرکز بن گیا تھا جس کے گرد احیا شدہ بت پرستی کی تنظیم عمل میں آ رہی تھی۔

مگر مذہب مسیحی کی ترقی اور کلیسیائے مسیحی کی تنظیم زمانۂ مستقبل کے لحاظ سے اہم ترین ہے۔ سلطنت روما میں مذہبی رواداری کی کمی نہ تھی اور مسیحیت پر ظلم کرنے کا الزام اس پر عائد نہیں ہو سکتا مگر تمام مطلق العنان حکومتوں کی طرح سلطنت روما بھی ہر ایک ایسی تحریک یا نظام کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی جس پر خود اس کی نگرانی اور اقتدار نہ ہو اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ مسیحیوں کے عقائد حکام روما کو ناگوار نہ تھے بلکہ ان کے کلیسیہ کے نظام سے وہ خائف تھے۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت تک مسیحیوں کے خلاف کوئی خاص قوانین نافذ نہیں ہوئے تھے لیکن یہ مذہب سلطنت کے لئے خطرناک خیال کیا جاتا تھا اور اس کی اشاعت کی اجازت نہیں ہوئی تھی اس لئے اس کے پیرو ہمیشہ معرض خطر میں رہتے تھے۔ یہ لوگ بت پرستی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور شہنشاہوں کی پرستش کے منکر تھے اس لئے ہر وقت

ان پر بغاوت اور آداب مذہب کی خلاف ورزی کا الزام عاید ہو سکتا تھا۔ مسیحیوں پر مارکس آریلیس کی موت سے قبل بھی مظالم ہوئے۔ نیرو نے بھی ان پر سخت ظلم کیا اور ٹریجن، ہیڈرین اور مارکس کی عہد حکومت میں بھی ان کے ساتھ بیرحمی کا برتاؤ ہوا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ سلطنت کلیسیہ کے مناقشات سخت تر ہوتے گئے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کا وجود گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ شہنشاہیت کا اصرار تھا کہ ہر امر میں رعایا اس کے احکام کی پابندی کرے کلیسیہ کا دعویٰ تھا کہ ہر شخص اس کے اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ اصلاح مذہب مسیحی کی تحریک سے تمام یورپ میں ایک سو سال تک جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا اور انگلینڈ میں قومی کلیسیہ کی مخالفت میں بغاوت ہو گئی اور بادشاہ کے قتل کی نوبت آ گئی۔ جب صرف اصلاحات اور فروعی معاملات سے یہ نوبت پہنچ جاتی ہے تو ہم کو تعجب نہ ہونا چاہیے اگر یہ عظیم مذہبی انقلابات یعنی مذہب مسیحی کی اشاعت و تبلیغ سخت مناقشات اور سلطنت کے تہ و بالا ہو جانے کے بغیر نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ شہنشاہیت اور کلیسیہ میں ربط پیدا ہو گیا مگر یہ اسی وقت ہوا جب کہ کئی سخت مقابلوں میں ثابت ہو گیا کہ سلطنت کلیسیہ کا اقتدار روک نہیں سکتی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جدید مذہب کی ترقی کی وجہ سے وہ نظام حکومت قائم رہ سکتا تھا جس کی ہیڈرین کے عہد حکومت میں ہم اس قدر تعریف کر چکے ہیں۔

مارکس آریلیس کے بعد اس کا بیٹا کموڈس تخت نشین ہوا مگر تہنیت کے بجائے بیٹے کا وارث تخت و تاج ہونا سعید نہ ثابت ہوا کیونکہ کموڈس اپنے بدترین پیشرؤں سے جرائم و معاصی میں کم نہ تھا۔ خود پسند، عیاش اور مطلق العنان ہونے کے علاوہ اس بادشاہ کو مسلح پہلوانوں کی کشتیوں کا بھی بہت شوق تھا۔ اکھاڑوں میں پہلوان بنکر اترنا اپنے لئے مایۂ فخر خیال کرتا تھا۔ ہرکیولز کے لباس میں اس نے اپنے کئی مجسمات بنوائے تھے اور اس کے سوانح نویس نے لکھا ہے کہ ۷۳۵ کشتیاں لڑا تھا۔ مطلق العنانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے لئے نئے نئے خطابات تراشے جن سے اس کے بیہودہ پیشرو محترز رہتے تھے۔ امیر جمہوریہ کا خطاب اس نے ناکافی خیال کیا اور "خداوند اور دیوتا" کا لقب اختیار کیا۔ اس کی خانگی

زندگی خطرناک تھی۔ سینیٹ سے بھی مالی معاملات میں اختلاف ہو گیا اور آخر کار ۱۹۲ء میں سازش کا شکار ہو کر مارا گیا۔ جانشینی کا کوئی مسلمہ قاعدہ نہ ہونے سے پھر سلطنت پر مصیبت آگئی اور نیرو کے انتقال پر جیسی ابتری پھیل گئی تھی پھر وہی حال ہوا یعنی پہلے تو سینیٹ نے ایک شہنشاہ نامزد کیا مگر اس کو افواج پریٹورین نے تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے مال و متاع کے وعدوں پر دوسرے شخص کو نامزد کیا۔ صوبجات کی افواج کو ناگوار ہوا کہ دار الخلافہ کی افواج سیاہ سفید کی مالک ہو جائیں اور با اختیار ہونے سے نفع اٹھائیں اس لئے برطانیہ شام اور دریائے ڈینیوب کے جنوب کے صوبہ میں بغاوت شروع ہو گئی۔ آخر الذکر افواج روما سے قریب تر تھیں اور ان کی حالت بھی بہ نسبت دوسرے کے بہتر تھی لہذا کچھ خفیف جنگ و جدال کے بعد انھوں نے اپنے سپہ سالار سپٹی مس سے وی رس کی شہنشاہت کا اعلان کیا (۱۹۳ء)۔ اس بادشاہ کا طرز حکومت اپنے پیشرووں سے بالکل جداگانہ اور رعایا کے لئے موجب تکلیف تھا۔ افریقہ کا باشندہ ہونے سے امید تھی کہ سے وے رس روما کی روایات برقرار رکھیگا کیونکہ اس صوبہ میں رومی تمدن کا رنگ غالب تھا اور تیسری، چوتھی اور پانچویں صدیوں میں کلیسیٔہ مسیحی کے متعدد نامور افراد اسی صوبہ کے باشندے تھے مگر یہ شخص مسیحیت سے ناآشنا تھا اور تمدن رومی کی اسے بالکل پروا نہ تھی، اور نرا اجڈ سپاہی تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ میرے لئے فوج کو اپنا ہمدرد رکھنا کافی ہے رعایا کی مجھے چنداں پروا نہیں۔ گویا اس کے عہد حکومت سے سلطنت پر فوجی رنگ بالکل غالب آگیا اور کبھی رفع نہیں ہوا۔ سے وے رس نے افواج پریٹورین کا خاتمہ کر دیا۔ ملک اطالیہ کو اس نے خاص حقوق سے محروم کر دیا اور شہر روما کو معمولی فوج کے ایک دستہ کے سپرد کر دیا۔ سپاہیوں کی اس نے تنخواہیں بڑھا دیں اور دوسری مراعات بھی ان کے ساتھ ملحوظ رکھیں یعنی ان کو مناکحت اور چھاؤنیوں کے بجائے شہروں میں رہنے کی اجازت دی۔ جس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ سپاہیوں کو اپنی قوت کا اور بھی زیادہ احساس ہو گیا اور ثانیاً ان کو سلطنت کے اس حصہ سے زیادہ انس ہو گیا جس میں وہ بود و باش رکھتے تھے۔ دور دراز مقامات پر تبادلہ کرنے میں زمانہ ما بعد کے بادشاہوں کو سخت وقت پیش آنے لگی۔

سے وے رس نے آٹھ سال تک حکومت کی اور اس کے بعد اس کا بیٹا کراکلا شہنشاہ ہوا جو اپنے باپ کی طرز عمل پر کاربند تھا مگر اس میں سختی کا مادہ زیادہ تھا اور قابلیت بہت کم۔ فوجی معاملات میں اسے انہماک تھا مگر اس کے عہد کے اہم ترین واقعہ کو فوج سے کوئی تعلق نہیں یعنی اس نے سلطنت روما کے تمام آزاد باشندوں کو رومی شہریت کے حقوق عطا کئے۔ حقوق شہریت روما کی توسیع نہ صرف شہنشاہیت کے قیام بلکہ زمانہ قبل سے ہوتی آئی تھی یہی آزاد خیالی یعنی مفتوحہ اقوام کو مساوات کے حقوق دینا سلطنت روما کے استحکام کا باعث تھی۔ جولیس سیزر نے گالیوں اور دوسری اقوام کو نہایت فراخدلی سے یہ حقوق عطا کئے تھے اور گو اس کے جانشینوں نے اس کو اسی پیمانہ پر جاری نہ رکھا تاہم اس اثنا میں صوبجات کے کثیر التعداد باشندوں نے یہ حقوق حاصل کر لئے تھے۔ صوبجات اور اطالیہ میں جو امتیاز تھا وہ عرصہ ہوا رفع ہو چکا تھا اور گو یہ ممکن ہے کہ کراکلا کا یہ فعل روما اور اطالیہ کی تحقیر پر منتج ہو مگر شہنشاہیت روما کے بہترین روایات کے منافی نہیں ہے اس انقلاب عظیم میں فوجی اور مالی اغراض بھی مضمر تھیں۔ کیونکہ فوج کی بھرتی میں شہری اور غیر شہری کے امتیاز کی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور عطائے حقوق کے عوض میں محصولات کا بار تمام باشندگان سلطنت پر ڈالا جا سکتا تھا۔

تیسری صدی کے بہت کم شہنشاہ طبعی موت سے مرے ہیں اور یہی انجام آخرکار اس بادشاہ کا بھی ہوا اور پھر طوائف الملوکی ہو گئی۔ ۲۱۸ء میں شام کی افواج نے ایک عجیب و غریب نوجوان کو تخت روما پر بٹھایا جو ایلاگا بالس کے نام سے مشہور ہے۔ اس بادشاہ کی تخت نشینی سے ظاہر ہے کہ افواج شام کو اب وہی مقدرت حاصل تھی جو ایک زمانہ میں افواج ڈینیوب نے حاصل کر کے سے وے رس کو تخت نشین کیا تھا۔ مگر اس شہنشاہ اور اس کے جانشینوں کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مذہبی معاملات میں خاص حصہ لیا ہے۔ تخت نشینی سے قبل یہ شہنشاہ مقام اے مے سا کے سورج کے دیوتا کے پجاریوں میں تھا جو ایک سیاہ پتھر کا خاص احترام کرتے تھے اور جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ آسمان سے گرا تھا۔ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتے ہی اس شہنشاہ نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا

کہ اس پتھر کو روما میں منگایا اور وہاں کے بڑے مندر میں اس کی پرستش جاری کردی افسوس ہے کہ رومی اب ایک ایسے شخص کے زیر حکومت ہو گئے تھے جسے ایک سو سال قبل وہ نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے کیونکہ یہ شہنشاہ بالکل مشرقی نمونہ کا بادشاہ تھا اور گلوبند جوشن اور جواہرات زیب بدن کیا کرتا۔ چہرہ پر غازہ ملتا تھا جو روما میں سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ۲۱۸ء سے ۲۲۲ء تک یہ بادشاہ حکمراں تھا۔ اس عرصہ میں اس کی مجلس میں عیاشی اور عجیب وغریب مذہبی رسوم کا بازار گرم تھا۔ رومیوں نے تو اپنی بے بسی کے سبب سے اس کی حرکات پر تعرض نہ کیا مگر افواج روما نے اس کے خلاف سر اٹھایا اور اس کو قتل کر ڈالا۔ اس کا عزیز الیگزینڈر سیویرس اس کا جانشین ہوا جو ۲۳۵ء تک برسر حکومت تھا اور جس کی ذاتی خصائل اور طرز حکومت میں اس کے پیشرو سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس بادشاہ پر اس کی والدہ کا بہت اثر تھا جو غالباً مذہب مسیحی کی پیرو تھی اور خود بھی ایماندار اور سادہ مزاج شخص تھا فلسفہ اور ادب میں اسے خاص درک تھا۔ مگر اس کے زمانہ میں سلطنت کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا ہوا۔ ایران میں ایک جدید سیاسی انقلاب ہوا جس سے خاندان ساسانی کی حکومت شروع ہوئی۔ ساسانیوں میں قومیت کی روح تھی اور وہ ایران کے قدیم مذہب کے پابند تھے۔ اس جدید سلطنت نے قائم ہوتے ہی رومیوں سے جنگ چھیڑ دی اور اس سلطنت کے ساتھ کئی معرکے ہوئے جن میں سے کوئی فیصلہ کن نہیں تھا مگر روما کے لیے ایران کی طرف سے ہمیشہ کے لیے ایک خطرہ پیدا ہو گیا۔

اس بادشاہ کی معرکہ آرائیاں تو اب فراموش ہو گئیں مگر اس کی زندگی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کا سوانح نویس تذکرہ کرتا ہے کہ پالاٹائن پہاڑی پر اس نے اپنے خانگی مندر میں کئی مشاہیر عالم کے مجسمات جمع کیے تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا۔ مندر کے بیرونی حصہ میں ورجل (رومی شاعر) سسرو (رومی مقرر) اور ایکلیس (یونانی سورما) کے بت تھے اور اندرونی مندر میں اپولونیس، آرفیس، حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ کے مجسمات تھے۔ آخر الذکر چار ناموں میں وہ مذہبی رجحانات مضمر تھے جن کا اس زمانہ میں زور تھا یعنی فلسفہ فیثاغورثی، تصوف، یہودیت اور مسیحیت۔ روشن خیال شہنشاہ کا خیال تھا کہ



ذیل کے نقشہ میں ق م تا ۸۵۰ عیسوی
سلطنت روما
کا
عروج و زوال دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔
قبل مسیح
سن عیسوی
جمہوری اور پیگن سلطنت
عیسائی اور بیزنطینی سلطنت
مقدس سلطنت روما
مسلمان حملہ آور
سلطنت کے دیگر وحشی حملہ آور

جملہ بزرگان دین کی پرستش ایک ساتھ ممکن ہے مگر کم از کم اس زمانہ میں مذہبی رواداری
کا احساس پیدا نہیں ہوا تھا اور ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے بزرگان
دین کا احترام نہیں کرتے تھے اور آئندہ صدی میں وہ مذہبی جد و جہد پیدا ہوئی جس
میں آخرکار دین مسیحی کو فتح ہوئی۔ عہد سلطنت کے آخری سال میں افواج مقیم رائن میں
بغاوت پیدا ہو گئی جس کو فرو کرنا اس نوجوان اور امن پسند شہنشاہ کے لئے ممکن نہ تھا
اور وہیں کسی جنگ میں مارا گیا (۲۳۵ء)۔

باب نوزدہم

شہنشاہان انٹونائن کے عہد حکومت میں سلطنت روما کی تمدنی حالت

شہنشاہان انٹونائن کے پرشوکت اور با امن زمانے سے آگے بڑھنے سے قبل اس عہد کی تمدنی حالت کے نمایاں پہلوؤں پر نظر ڈالنی مناسب ہوگی۔ بعض امور میں اس عہد کا تمدن یورپ کی بیسویں صدی کی تہذیب سے مشابہت رکھتا ہے اور آج کل کے یورپین لوگوں کے خیالات، عادات، مذاق اور طریقہ ہائے تفریح کو بہ نسبت ازمنۂ وسطیٰ کے دوسری صدی کے تعلیم یافتہ رومیوں کے مذاق سے زیادہ مناسبت ہے۔ مگر تاریخ عالم کے کوئی دو دور بالکل متشابہ نہیں ہیں اور عہد مذکور کے تمدن میں بھی بعض باتیں ایسی ہیں جو ہمیں عجیب یا قابل نفرت معلوم ہوں گی۔

شہنشاہیت کے قیام سے امرائے روما کے طرز زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ دولت اب بھی ان کے قبضہ میں تھی نظم و نسق سلطنت روما میں ان کا بڑا حصہ تھا مگر ان کی آزادی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ افواج کی سپہ سالاری اور صوبجات کی صوبہ داری اب بھی ان کے دسترس میں تھی مگر دونوں حیثیتوں میں وہ شہنشاہ کے ملازم تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو غرور اور خود پسندی سے ملازمت شہنشاہی کسر شان خیال کرتے تھے اور شہر روما اور اس کے اطراف میں عالیشان محلوں میں عیش و عشرت کے ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانہ کے شعراء نے ان بے شغل امراء کا خوب مذاق اڑایا ہے اور خصوصاً جووینل اور ٹیسی ٹس نے ان کی خود نمائی عیاشی، بے رحمی، پرخوری اور بدکاریوں کا نہایت وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ان کے علاوہ روما میں ساہوکاروں کا بھی شہنشاہیت کے زوال کے قبل ڈیڑھ سو سال تک بہت زور رہا۔ یہ اصطلاحاً یہ طبقہ نائٹ یا اکوائنٹ کے نام سے موسوم تھا اور یہ زمانہ حال کے تجارتی رواج کے مطابق ان کی کمپنیاں ہوتی تھیں جو محصولات جمع کرنے کا ٹھیکہ لیتیں قرضہ دیتیں اور صنعت و حرفت کی سرپرستی کرتی تھیں جمہوریت کے آخری زمانہ میں ساہوکاروں کا زور بہت بڑھ گیا تھا کیونکہ سلطنت خود انکی سرپرست تھی اور باشندگان صوبجات کو ان کے ظلم و تعدی اور سخت گیری کے ساتھ کڑا سود وصول کرنے میں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ شہنشاہیت کے قیام سے امراء کی طرح ساہوکار پر بھی دار و گیر ہونے لگی اور کسی پر ظلم کرنے کی مجال نہ رہی مگر اس طبقہ کے دوسرے کاروبار جاری تھے جن سے سلطنت کے دارالخلافہ میں دولت کھنچی چلی آتی تھی۔

بلدہ ہائے سلطنت روما میں شہر روما ممتاز تھا۔ دوسرے شہر بھی تھے مثلاً ایتھنز، انطاکیہ، سکندریہ، لائنس اور قرطاجنہ مگر تمام سلطنت کا مرکز روما ہی تھا اور اس لئے بغیر اس شہر کی کوچہ گردی کے کسی حوصلہ مند شخص کے لئے ممکن نہ تھا کہ کسی قسم کا سیاسی اقتدار حاصل کرے۔ شہر روما ہر چیز کا مرکز تھا فنون لطیفہ کا، ادبیات کا، مذہب کا، اور عیاشی کا۔

دوسری صدی عیسوی میں فنون تعمیر و بت تراشی اوج کمال پر پہنچ گئے تھے۔ اصل سے بالکل مشابہ صوری مجسمات کے بنانے میں رومیوں نے یونانیوں کو بھی مات کر دیا۔ شہنشاہ ہیڈرین کو فنون لطیفہ میں خاص مہارت تھی اور وہ بصورت اشیاء کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ اس کا مذاق سلیم اس کے محل کے آثار سے ظاہر ہے۔ مگر روما میں کبھی فنون لطیفہ کے متعلق صحیح مذاق پیدا نہیں ہوا جیسا کہ ایتھنز میں پیرکلس کے زمانہ میں تھا۔ رومی اپنی بدمذاقی کے سبب سے حسن و خوش اسلوبی کے بجائے نمائش اور طمطراق کے زیادہ دلدادہ تھے اور فنون لطیفہ کو دلبستگی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ اس لئے روما میں نہ فنون لطیفہ کو کوئی خاص ترقی نصیب ہوئی نہ فن ڈراما نویسی میں۔ روما کے تھیٹروں میں معمولی تماشے ہوا کرتے تھے۔ ناچ گانے اور کشتیوں کا زیادہ رواج تھا اور تھیٹر کو قوم کی دماغی ترقی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ تفریح طبع کے لئے

رومیوں کو رتھوں کی دوڑ اور پہلوانوں کی کشتیاں خصوصاً مرغوب تھیں۔ رتھوں کی دوڑ ایک چھوٹے سے گھوڑدوڑ کے میدان میں ہوتی تھی اور رتھ جو رتھبانوں کی ہوشیاری کے یہ دوڑیں خطرناک ہوتی تھیں۔ تماشہ دیکھنے والے کسی نہ کسی رتھبان کے پرجوش طرفدار ہوتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس کا رواج بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ مشہور مصنف پلینی نے حقارت کے ساتھ ان کھیلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "تعجب ہے کہ ہزاروں آدمی بچوں کی طرح گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے اور رتھبانوں کو اپنی رتھوں پر جھکے ہوئے دیکھتے ہیں" مگر اس کھیل کی ہر دلعزیزی میں صدیوں تک کمی نہیں آئی اور قسطنطنیہ میں تو چھٹی صدی میں اور بھی زور ہو گیا۔

مگر رتھوں کی دوڑ سے مسلح پہلوانوں کی کشتیاں رومیوں کو کہیں زیادہ مرغوب تھیں۔ اس کھیل کے لئے روما میں ایک عظیم الشان عمارت بنی ہوئی تھی جسے کالیسیم کہتے تھے اور جس میں پچاس ہزار تماشائی بآسانی آ سکتے تھے۔ اس قسم کے بڑے بڑے تھیٹر سلطنت کے دوسرے شہروں میں بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ عمارات مختلف کھیلوں کے لئے استعمال میں آتی تھیں۔ روایت کی جاتی ہے کہ جب شہنشاہ ٹائٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا تو ۵۰۰۰ جنگلی جانوروں کا خون ہوا تھا۔ مگر صرف جانوروں کی خونریزی پر قناعت نہیں کی جاتی تھی بلکہ انسانوں کا خون بہانا بھی رومیوں میں جائز تھا۔ پہلوان ہندوستان کی طرح نہتے نہیں لڑتے تھے بلکہ ان کے ہاتھوں میں خنجر یا دوسرے ہتھیار ہوتے تھے۔ کبھی صرف دو پہلوان لڑتے اور کبھی کئی کئی ایک طرف ہوتے اور ایک ایک مقابلہ میں کئی آدمی جان سے جاتے۔ رومیوں کے تہواروں میں جتنے انسانوں کا خون ہوتا ان کی تعداد بیشمار ہے اور تعجب تو یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مرد اور عورت مزے سے اس خونریزی کو دیکھتے اور شاذو نادر اخلاق یا انسانیت کی بنا پر ان کھیلوں کی کوئی مخالفت کرتا۔ صرف چند عالی خیال لوگوں کو یہ انسانی قربانیاں ناپسند تھیں۔ سینیکا نے ہاتھیوں کے مارے جانے پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ ٹائی بیریس نے روما میں ان کھیلوں کو بند کر دیا تھا مگر کس سبب سے یہ معلوم نہیں۔ مارکس آریلیس نے حکم دیدیا تھا کہ پہلوان کند ہتھیاروں سے لڑیں مگر اس سے رومیوں میں بد دلی پھیل گئی۔ دینی

کے پیروؤں کے سوا ان کھیلوں پر کوئی معترض نہ تھا اور مسیحیوں کیلئے ان کھیلوں کا دیکھنا جائز نہ تھا۔ اغسطینوس نے جو کلیسیائے مسیحی کے اکابرین میں سے گزرا ہے ایک نوجوان کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کو چند لوگ پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کے لئے زبردستی کھینچ لے گئے۔ کچھ دیر تک تو وہ زمین پر اپنی نگاہیں جمائے رہا مگر جب ایک پہلوان زخمی ہو کر زمین پر گر گیا تو تمام تماشائیوں نے نعرہ خوشی لگایا جس سے اس کی نگاہیں بھی زمین سے اٹھ گئیں اور خون دیکھتے ہی اس کے مزاج میں خونخواری کا اثر ہو گیا۔ اس نے اپنی نگاہیں پھیرنے کی کوشش نہ کی بلکہ ٹکٹکی باندھ کر خونریزی کا دیکھتا رہا اور اس خونی کھیل کے لطف سے سرشار ہو گیا۔ مگر اس مدت میں عیسائیت کا زور ہو گیا اور ایک راہب ان کھیلوں کے روکنے کی کوشش میں مارا گیا جس سے اکثر لوگوں کو اس سے نفرت پیدا ہو گئی اور پانچویں صدی کے ابتدائی حصے کے بعد اس کا ذکر سننے میں نہیں آتا۔ مگر جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں یعنی دوسری صدی عیسوی میں مذہب مسیحی نے اس قدر زور نہیں پکڑا تھا اور کوئی اخلاقی موانع نہ تھے اس لئے رومی لطف کے ساتھ یہ خونخوار کھیل دیکھتے تھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یونانیوں کے کھیلوں میں انکی تہذیب و تمدن کا روشن پہلو ظاہر ہے مگر جن رومی کھیلوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان کے سبب سے رومی تمدن پر ایک سخت دھبہ ہے جو کسی طرح دھل نہیں سکتا۔

اس عہد میں رومیوں کی اعلیٰ تعلیم پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تعلیم کا لب لباب صرف فن بلاغت میں کمال پیدا کرنا خیال کیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں فصاحت و بلاغت کا حصول مفید ہو سکتا تھا کیونکہ جمہوریت ایتھنز کی طرح روما میں بھی عدالتوں اور سیاسی مجمعوں میں جو شخص پر اثر تقریر کر سکتا تھا اس کے لئے ترقی کا زینہ کھلا ہوا تھا۔ فن بلاغت کا رواج یونان سے روما میں آیا اور کیٹو نے اس کی سخت مخالفت کی مگر اس کا رواج بڑھتا گیا یہاں تک کہ سسرو کے زمانے میں فن تقریر میں کمال پیدا کرنا ہر رومی نوجوان کے لئے فرض ہو گیا۔ جولیس سیزر بھی بلاغت کے مدرسین کے درسوں میں شریک رہا تھا۔ روما میں سسرو نے فن تقریر کو معراج کمال پر پہنچایا جو تقریریں اس نے عدالتوں سینیٹ اور دیگر مجالس میں کی تھیں ان کا رومی

سیاسیات پر زبردست اثر تھا۔

مگر شہنشاہی کے قیام سے خطابت سے کام لینے کے مواقع بہت کم رہ گئے تھے۔ کیمشیا یا مجالس عوام کی ہستی باقی نہ رہی تھی اور عہدہ داران سرکاری مجمع عام میں کسی کا تقریر کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ سینیٹ کی آزادی باقی نہ رہی تھی جس کے ساتھ ہی آزادی تقریر کا موقع بھی جاتا رہا تھا، عدالتوں میں بھی فضول لفاظی اور لسانی کو ناپسند کیا جاتا تھا اور نفس معاملہ سے وکلاء کو ہٹنے نہ دیتے تھے۔ یہ کسی وکیل کے لیے ممکن نہ تھا کہ کسی مقدمے کی سماعت کے دوران میں سیاسی معاملات پر رائے زنی کرے۔ ملازمت سرکاری میں ترقی کے لیے صرف شہنشاہ کی مہربانی اور معاملہ فہمی کی ضرورت تھی جس سے فن تقریر کا اثر بالکل جاتا رہا۔ سیاسی اور قانونی اغراض کے لئے تو اب خوش تقریری کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر کمال یا ہنر کے طور پر اس کا عالمگیر رواج ہو گیا تھا۔ فن بلاغت کے استادوں کو روما میں خاص رسوخ حاصل تھا اور ان کے شاگرد ان کے ساتھ محبت اور ادب سے پیش آتے تھے۔ ان استادوں میں کونٹیلین (۱۱۵ء - ۳۰) کا نام بہت مشہور ہے کیونکہ اس کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ مختلف علوم میں ماہر تھا، ادبیات میں خاص مہارت تھی اور فن تعلیم میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ مقرر کی اس نے یہ تعریف کی ہے کہ بہترین مقرر وہ شخص ہے جو طباع ہونے کے علاوہ نیک بھی ہو مگر وہ بھی فن بلاغت کی مشق کو تعلیم کا بہترین ذریعہ خیال کرتا ہے۔ پانچ صدیوں تک (یعنی سنہ ۱ء سے سنہ ۵۰۰ء تک) روما کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا یہی مشغلہ تھا کہ تاریخی یا فرضی مضامین پر جو ان کے استاد مقرر کریں تقریر کیا کریں۔ آگسٹس کے زمانے کی ایک بلاغت کی کتاب میں حسب ذیل مضامین پر تقریریں ہیں (۱) تین سو اسپارٹی غور کرتے ہیں کہ تھرموپائلی میں انھیں سارے یونانیوں کے ساتھ بھاگ جانا چاہیے یا نہیں (۲) زرکسیز دھمکی دیتا ہے کہ اگر اہل ایتھنز وہ نشانات فتح واپس نہ کریں گے جو انھوں نے اس کی فوج سے چھینے تھے تو وہ پھر یونان پر حملہ کرے گا۔ طلبا کو سکھایا جاتا تھا کہ اثبات اور نفی دونوں پہلوؤں پر تقریر کریں۔ مگر مضامین ذیل ان سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں (۳) ایک شخص کی بیوی اور تین بچے جہاز کے ڈوبنے سے مر گئے اور اس کا مکان جل گیا۔ اس نے تنگ آکر

پھانسی لگائی۔ ایک راہگیر نے پھانسی کی رسی کاٹ دی۔ اس حرماں نصیب نے
ہرجے کا دعویٰ کیا (۴) ایک شخص کے تین بچے ضائع ہو گئے وہ ان کی قبر پر بیٹھا ہوا
رو رہا تھا۔ ایک عیاش آدمی آیا اور اس کو قبر سے کھینچ لے گیا اس کا لباس بدلا بال درست
کرائے اور دعوت میں شریک کیا۔ وہاں سے جب اسے گلو خلاصی ہوئی تو اس
نے حملۂ مجرمانہ کا دعویٰ کر دیا۔

کسی خاص دورِ تاریخ کے متعلق اس امر کا اندازہ کرنا کہ قوم کا رجحان ترقی
کی طرف تھا یا روبہ انحطاط اس عہد کے طریقۂ تعلیم سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جن
فنون کی تحصیل کا سلطنت روما میں اس زمانے میں رواج تھا ان سے نہ تو
خصائل و طبائع پر کوئی پسندیدہ اثر پڑ سکتا تھا نہ قوائے عقلی کی تربیت کے لئے ہی
کسی مفید صورت کا امکان تھا مزید براں رومیوں کو جو مشکلات اس زمانے میں
درپیش تھے ان کی عقدہ کشائی بھی ان علوم و فنون سے دشوار تھی۔ فصاحت و بلاغت
کی تحصیل سے چونکہ اس زمانے کے سیاسی اور تمدنی معاملات پر کوئی اثر نہ تھا
اس لئے سلطنت بھی فنون مذکور کی اشاعت میں حارج نہ ہوئی۔ مگر اس سے
یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ حقیقی علم بالکل معدوم ہو گیا تھا۔ سکندریہ کا مدرسۂ طبابت
حکیم جالینوس کے فیض سے خوب رونق پر تھا اور قانون روما کی تدوین و ترتیب
جاری تھی۔

اس عہد کے متعلق ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اس سے ممکن ہے کہ قیاس
کیا جائے کہ ہم اس عہد کے تمدن کو پسندیدہ خیال نہیں کرتے۔ مگر باوجود ان
عیوب کے اس عہد کے تمدن کے بعض روشن پہلو بھی تھے جو پلاٹارک کی
تصانیف اور پلینی کے خطوط کے مطالعہ سے عیاں ہونگے۔ پلوٹارک یونانی النسل
تھا اور سنہ ۱۲۰ء کے قریب روما میں مصروف درس و تدریس تھا۔ اس کے سوانح
کا شمار دنیا کی بہترین تصانیف میں ہے جس سے زمانۂ مابعد کی نسلوں کو بے انتہا
اخلاقی نفع پہنچا ہے کیونکہ علاوہ دلچسپی اور ادبی خصوصیات کے اس نے اپنے
ناظرین کے دلوں میں انسانیت شجاعت اور خدا پرستی کے پاک جذبات برانگیختہ
کرنے کی کوشش کی ہے پلینی کے خطوط سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے

مرد اور عورتوں میں نیکی اور مروت کی کمی نہ تھی۔ قدرتی مناظر کی دلفریبیوں میں ایسے خاص انہماک تھا۔ اور فنون لطیفہ اور علم ادب سے بھی ایک خاص لگاؤ تھا۔ روما کی جو تصویر اس نے اپنے خطوں میں کھینچی ہے اس سے ظاہر ہے کہ سلطنت روما کے باشندے نہ بالکل عیاشی میں مبتلا تھے اور نہ بالکل از کار رفتہ ہو گئے تھے کیونکہ انھوں نے پلوٹارک کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا فلسفۂ رواقی کی حد درجہ قدر کی اور مذہب مسیحی کو ان میں فروغ حاصل ہوا۔

دوسری صدی عیسوی کے تمدنی حالات کا ہم نے جو ذکر کیا ہے ان کا تعلق زیادہ تر شہر روما سے ہے۔ اطالیہ اور دیگر صوبجات سلطنت کے متعلق بہت کم حالات معلوم ہیں کیونکہ اہل قلم اور اہل سیف دونوں کا مرکز شہر روما تھا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جو حال روما کا تھا وہی قریب قریب اطالیہ کا بھی تھا۔ اطالیہ کے شہروں کو حکومت خود اختیاری حاصل تھی شہر پامپی کے کھنڈروں کے کھودنے سے ان شہروں کی تمدنی زندگی کی تفصیلی حالات بہت کچھ معلوم ہو چکے ہے شہر پامپی کے قریب ایک کوہ آتش فشاں ہے جسے ویسو ویس کہتے ہیں اور جس کی آتش فشانی سے یہ شہر سنہ ۷۹ء میں تباہ و برباد ہو گیا۔ اٹھارھویں صدی تک یہ شہر راکھ اور مٹی کے تودوں کے نیچے دبا رہا اور اب بھی اسکے بعض حصے زیر زمین ہیں مگر موجودہ احفارات سے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ اطالیہ کے شہر عیش و عشرت کے مرکز تھے نہ کہ تجارت کے کشتی کے اکھاڑے بھی موجود ہیں۔ مندر نئے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ نیا مندر مصری دیوی اسس کا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس دیوی کی عبادت شروع ہو چکی تھی۔ دیواروں پر جو تصاویر کندہ ہیں ان سے ظاہر ہے کہ فن تصویر کشی کو اس زمانے میں فروغ تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تباہی شہر کے وقت وہاں مجلس بلدی کے اراکین کا انتخاب قریب تھا کیونکہ دیواروں پر ایسی تحریرات موجود ہیں جن میں مختلف امیدواران انتخاب کے لئے رائے دینے کی درخواست کی گئی ہے۔

سلطنت روما کا عزم بالجزم تھا کہ حکومت بلدی کو تمام اقطاع سلطنت میں رواج دیا جائے۔ مشرق میں تو بلدیات کا وجود رومیوں کے ورود سے قبل ہی تھا۔ مگر ممالک غرب میں رومیوں کے زیر اثر متعدد شہر وجود میں آگئے جن کی حکومت بلدی کا نظام

وہی تھا جو جولیس سیزر نے اپنے قانون بلدیات میں قائم کیا تھا۔ صوبجات افریقہ غالیہ ہسپانیہ میں ان شہروں کو خوب فروغ ہوا۔ برطانیہ میں ان کی تعداد ذرا کم تھی۔ مگر ان شہروں کو پوری آزادی حاصل نہ تھی۔ شہر میں با اختیار جماعت مجلس بلدی تھی اور جن خاندانوں سے اس مجلس کے اراکین منتخب ہوتے تھے ان کا شمار اس نواح کے شرفا میں تھا۔

عوام کے حالات تمام اقطاع سلطنت میں روبہ اصلاح تھے اور ترقی کر رہے تھے۔ غلاموں کے حالات باوجود تفحص معلوم نہیں مگر ان کی تکلیفیں بھی رفع ہو رہی تھیں اور ان کی حفاظت کے لئے قانون نافذ ہو رہے تھے۔ فلسفہ اور مذہب کی تعلیم یہ تھی کہ ان کے ساتھ نرمی اور انسانیت کا سلوک کیا جائے۔ شہنشاہوں کی پرستش قائم رکھنے کی خدمت غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے سپرد تھی اور اکثر بلکہ تمام شہروں میں طبقۂ وسطےٰ میں ایک جماعت تھی جسے آگسٹیل کہتے تھے جس کا فرض یہ تھا کہ سیزروں کی پرستش جاری رکھے۔ مگر سلطنت رومائی بلدیات کی آزادی کا دور ختم ہو رہا تھا اور وہ زمانہ قریب تھا کہ مالی مشکلات کے بہانہ سے اس کی آزادی چھین لی جائے۔ مگر مالی مشکلات کا صرف بہانہ ہی بہانہ تھا اور شہنشاہی انتظام سے شہروں کی حالت اور بھی خراب ہو گئی اگر یہی اصول زمانۂ حال میں برتا جائے اور ذراسی مالی بد انتظامی کے شبہ پر کسی شہر کی آزادی سلب کر لی جائے تو آج نہ صرف یورپ بلکہ انگلستان میں بہت کم آزاد شہر باقی رہ جائیں۔

صوبجات کے تفصیلی حالات بہت کم معلوم ہیں جس سے ان کے متعلق رائے زنی کرنا دشوار ہے۔ بعض مقامات میں رعایا سخت تباہی کی حالت میں تھی۔ یونان کی آزادی تو خصوصاً گھٹتی جاتی تھی اور افلاس میں مبتلا تھی مگر دوسرے مقامات میں دوسو سال کی مسلسل امن و امان سے وہاں باشندے خوشحال اور فارغ البال تھے۔ صوبۂ افریقہ کے ویران کھنڈروں سے ظاہر ہے کہ صحرا کے وسط میں بھی سرسبز و شاداب مقامات تھے اور گزشتہ ہزار سالوں میں ان کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔

صوبجات کی سرسبزی کا قیام خود شہنشاہوں کی ذاتی اغراض کی وجہ سے ضروری تھا اور اس لئے وہ ہر طرح سے کوشش کرتے تھے کہ ان کی پوری حفاظت کریں اِس غرض سے انھوں نے طویل طویل فصیلیں بنوائی تھیں۔ برطانیہ

میں ایک فصیل دریائے ٹائن سے خلیج سالوے تک بھی اور جرمنی میں دریائے رائن سے دریائے ڈینیوب تک۔ اہل فوج کو بھی اختیار نہ تھا کہ باشندگان صوبجات پر ظلم و تشدد کریں گو نیرو کے قتل کے بعد ایک حد تک ابتری پھیل گئی تھی پلینی جس کے خطوط کا ہم نے ذکر کیا ہے ایک گمنام صوبہ کا صوبہ دار تھا۔ شہنشاہ وقت (ٹراجن) سے اس کا سلسلۂ خط و کتابت جاری تھا۔ حسن اتفاق سے یہ خطوط دست برد زمانہ سے اب تک محفوظ ہیں۔ ان کے ہر صفحہ سے صوبہ دار کی ایمانداری اور شہنشاہ کی توجہ کا اظہار ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی شہنشاہ یا اس کے معتمدین سے استمزاج کیا جاتا ہے اور شہنشاہ ان امور کے متعلق بہ نفس نفیس ہدایات دیا کرتا تھا۔ مثلاً حمام کی تعمیر، تالابوں کی مرمت، آگ بجھانے کا انتظام ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی شہنشاہ سے استمزاج کیا جاتا تھا۔ پلینی نے منجملہ دیگر امور شہنشاہ سے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ مسیحیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ شہنشاہ کا جواب انسانیت اور منصف مزاجی سے مملو ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مسیحیوں کی تلاش کی ضرورت نہیں نہ گمنام مخبروں کی اطلاعوں پر عمل کیا جائے۔ اگر وہ اپنے عقائد سے توبہ کریں انھیں معاف کر دیا جائے۔ مگر حکومت کا ذرا ذرا سے معاملات میں دخل دینا خرابی سے خالی نہیں۔ گو اس مداخلت کا سبب یہ تھا کہ شہنشاہ وقت جزوی معاملات کی طرف توجہ کرنا بھی اپنے فرائض میں داخل خیال کرتے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا میں کسی قسم کا احساس باقی نہ رہا۔ افسوس کہ شہنشاہوں کو مطلق یہ احساس نہ تھا کہ عمدہ حکومت کے لئے آزادی بھی ایک لازمی شے ہے۔

روما کے تمدنی حالات کے متعدد پہلو ابھی تک تاریکی میں چھپے ہوئے ہیں بالخصوص زراعت پیشہ لوگوں کے حالات اور نوعیت قبضۂ زمین کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ مختلف اقطاع سلطنت کے حالات میں وسیع اختلاف تھا۔ اطالیہ کے زراعت پیشہ لوگوں کی حالت اچھی نہ تھی اور ان کی آبادی گھٹتی جاتی تھی۔ شہنشاہان انٹونائن نے ان کی اصلاح میں سعی بلیغ کی تھی۔ جائدادیں امیروں کے ہاتھوں میں آتی جاتی تھیں۔ غلام آزادی حاصل کر رہے تھے مگر

آزاد کاشتکار معاشی وجوہ سے مالکان جائداد کے غلام بن رہے تھے۔ عہد مذکور میں یہ حالت نہ تھی مگر آزاد کاشتکار اپنا حق مالکانہ کھو رہے تھے اور بڑے بڑے زمینداروں کے اسامی بن گئے تھے۔ نقد یا جنس میں ان کو لگان دیا کرتے اور یوں بھی ان کے دباؤ میں تھے۔ ایسے اسامیوں کو کالونائی کہتے تھے۔ قبضۂ زمین کی نوعیت وہی شکل اختیار کر رہی تھی جس کو زمانۂ مابعد میں فیوڈلزم (جاگیریت) سے تعبیر کرنے لگے۔

باب ششم

انقلاب و احیاء

الیگزنڈر سیورس کی موت کے بعد تمام سلطنت روما میں ابتری پھیل گئی تھی اس لئے اس کے اہم مضامین پر تبصرہ کرنا ضروری ہے گو ان میں سے بعض نصف صدی کے بعد وجود میں آئے پہلی چیز جو ہمارے پیش نظر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وسطی حکومت بالکل کالعدم ہو گئی تھی۔ حکام روما کا نہ افواج پر اقتدار باقی تھا نہ وہ سرحدات کی محافظت کر سکتے تھے اور نہ سلطنت کا معمولی انتظام۔ اس کے مختلف ممالک میں مثلاً خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اس کا ثبوت یہ کہ یہ عہد "تیس جابر حکام کا زمانہ" کہا جاتا ہے۔ یہ فقرہ مبالغہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ وقت واحد میں اس قدر سلطنتیں موجود نہ تھیں مگر اس میں شک نہیں کہ متعدد سلطنتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ وسطی حکومت کی کمزوری سے وحشی اقوام نے سرحدوں پر یورش شروع کر دی اور ایسے ایسے صوبوں میں فتنہ غارتگری برپا کیا جو صدیوں سے دشمن کے حملوں سے محفوظ رہے تھے۔ ان وحشیوں اور ان کی مختلف اقوام کا ذکر بعد میں ہوگا۔ افواج روما بالکل سرکش ہو گئی تھیں اور انھیں اپنی طاقت کا احساس ہو گیا تھا۔ شہنشاہوں کا بنانا اور بگاڑنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کی کارکردگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا اور وحشیوں سے جب کبھی مقابلہ ہوا فتح انھیں کے ہاتھ رہی مگر اب انھیں نہ تو حکام روما کے احکام کی پروا تھی نہ سلطنت کے مفاد کی۔ حقیقت یہ تھی کہ اب انھیں اسی قسم کی روک تھام ناگوار تھی۔ افسر خود سپاہیوں کے دست نگر

ہوگئے تھے اور رعایا ان سے نالاں تھی۔ اس کے ساتھ ہی سلطنت کی مالی حالت نہایت خراب ہو رہی تھی۔ بدامنی سے تجارت کا بازار سرد پڑ گیا تھا فوجی اغراض کے لئے توفیر آمدنی کی ضرورت تھی جس کے لئے رعایا پر نئے نئے محصول لگائے جا رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت بالکل بند ہو گئی اور سلطنت کی مجموعی دولت معدوم ہو گئی۔ حکومت نے توفیر آمدنی کے لئے حکام اور محصول جمع کرنے والوں کی تعداد میں بے حد اضافہ کر دیا اور ہیڈرین نے جو نظام حکومت قائم کیا تھا اس نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ رعایا اس کے بوجھ سے دبنے لگی۔ ایک امر خصوصاً قابل لحاظ ہے یعنی شہنشاہیت کے ابتدائی زمانہ میں شہروں کی قوت اور سرگرمی سے اسے بہت کچھ تقویت تھی شہنشاہان انٹونائن کے زمانہ میں انکی آزادی پر کچھ قیود عائد کر دی گئیں تھیں مگر تیسری صدی سے بلدیات کی آزادی روز بروز گھٹنے لگی۔ پہلے تو یہ ہوا کہ بلدیات کے منتخب شدہ حکام شہنشاہی عہدہ داروں کے ماتحت کر دیئے گئے۔ اس کے بعد بلدیات سے ان عہدہ داروں کے انتخاب کا حق سلب کر لیا گیا اور ان کا تقرر راست شہنشاہ کی طرف سے ہونے لگا اور مجالس بلدی میں بجائے منتخب شدہ ارکین کے آس پاس کے زمینداروں کا عنصر غالب ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ہو گیا کہ تمام شہروں کے حکام اور مجالس بلدی ٹیکس جمع کرنے اور ان کے ادا کرنے ذمہ دار کر دیئے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ مجلس بلدی کی رکنیت جسے ہر شخص باعث اعزاز خیال کرتا تھا اس سے اب لوگ خائف ہونے لگے اور حکومت کی دھمکیوں سے جبراً و قہراً اس عزت کو قبول کرتے تھے۔ سلطنت کے آخری زمانے میں ان حکام بلدی کے منصب اور فرائض کے متعلق متعدد قوانین نافذ ہوئے۔ بلدیات کی آزادی، نظام حکومت اور تجارت کی تباہی سلطنت کی بربادی کے اہم اسباب میں سے ہے۔ ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے گو زیادہ اہم نہیں مگر اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زوال کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ رومی تمدن کے ظاہری محاسن معدوم ہو رہے تھے۔ علم کا چرچا گھٹ رہا تھا۔ کتبوں پر جو تحریریں ہیں نہ وہ صحیح ہیں نہ ان کا طرز تحریر دلپسند ہے سکوں کی وہی حالت ہے۔ فن بت تراشی بھی گئی گذری حالت میں ہے مثلاً شہنشاہ کانسٹانٹائن کی فتح کی کمان کو ہیڈرین کے زمانے کی دست کاری سے کوئی نسبت نہیں۔ فن تعمیر میں رومیوں کو ید طولیٰ حاصل تھا مگر یہ ہنر بھی انھوں نے کھو دیا تھا۔ سلطنت نہ صرف افلاس میں مبتلا تھی بلکہ خوف تھا کہ وحشیوں کے حملوں سے قبل خود رومی وحشی ہو جائیںگے۔ اس کے علاوہ ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے مذہب اور مذہبی مباحثوں کا

چرچا بہت بڑھ گیا تھا۔ قدیم طریقے کی بت پرستی کا رواج گھٹ رہا تھا مگر مندر ابھی باقی تھے اور بتوں کی پرستش کچھ کچھ جاری تھی۔ تصوف کا اس پر رنگ چڑھ رہا تھا اور اس کے پیرو کی کوشش تھی کہ اپنے عقائد اور نظام مذہبی میں یگانگی قائم کریں۔ فلسفۂ رواقی کا زور بالکل گھٹ گیا تھا کیونکہ اس عہد کی تصنیفات میں عقلیت کی بالکل جھلک نہیں۔ ان امور سے قیاس کیا جاسکتا تھا کہ کوئی ایسا جدید مذہب قائم ہوگا جس میں رہبانیت اور مافوق العادت عقائد کے عناصر غالب ہوں گے۔

وحشیوں کے حملوں کا زمانہ اب شروع ہوتا ہے۔ جن قوموں کو روما کے جبروت و سطوت سے کبھی اس کی سرحدوں کی طرف نگاہ اٹھا کے دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی انھیں اب اس کے حدود میں لوٹ اور غارت گری کرنے کی جسارت ہوگئی گو ابھی تک انھوں نے سلطنت روما کے کسی حصہ پر مستقل قبضہ نہیں کیا تھا۔ نئی نئی وحشی قوموں کے نام سننے میں آتے ہیں۔ جرمنی کی اقوام نقل و حرکت کر رہی تھیں اور انھوں نے بڑے بڑے جتھے بنائے تھے دریائے رائن کے بالائی حصہ میں قوم المانی آباد تھی جس نے ابتداءً غالیہ پر حملہ کیا اور پھر خود اطالیہ میں لوٹ مار مچادی۔ دریائے رائن کے نشیبی حصہ میں قوم فرنگ آباد تھی۔ رومی ان کو وحشیوں میں سب سے زیادہ عیار بے رحم اور سخت دل خیال کرتے تھے اس قوم کی عظمت کا زمانہ ابھی کچھ دور تھا مگر سنہ ۲۵۳ء میں اس قوم کی ایک شاخ یلغار کرتی ہوئی غالیہ سے ہسپانیہ ہوتی ہوئی افریقہ تک پہنچ گئی۔ مگر تیسری اور چوتھی صدیوں میں وحشیوں کی سب سے زیادہ نام آور قوم گاتھ تھی جن کی آبادی کا مرکز دریائے ڈینیوب کے نشیبی حصے یعنی کریمیا کے قرب و جوار میں تھا۔ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ قوم وحشی تھی مگر رومی تمدن اور دین مسیحی اس قوم نے بہت جلد قبول کر لیا۔ مگر تیسری صدی میں یہ لوگ محض کندۂ ناتراش تھے تھور اور اوڈن دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ تحریر کا رواج ان میں ہو چکا تھا۔ ان کا رسم الخط ریونک ہے جو زمانۂ حال کی روسی زبان کے حروف سے مشابہ ہے۔ ان کے نظام میں زبردست استواری نہ تھی اور بادشاہ انتخاب کے ذریعہ سے مقرر ہوتے تھے چونکہ تمام معاملات مجالس شوریٰ میں طے ہوتے تھے۔ سنہ ۲۵۰ء میں قوم گاتھ نے دریائے ڈینیوب عبور کیا۔ شہنشاہ ڈیسیس نے اس سیلاب کو روکنے کی سعی

عبث کی اور اس میں مارا گیا۔ چند سال بعد اس قوم نے بحیرۂ اسود کے سواحل پر بحری یورشیں کرنی شروع کر دیں اور بحیرۂ باسفورس کو بھی عبور کر کے بحیرۂ ایجین کے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ڈائنا دیوی کے تقدس کا بھی خیال نہ کیا اس کا مندر جلا دیا۔ ایتھنز پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا اور جزیرہ نما پیلوپونیس تک پہنچ گئے۔ سلطنت روما کی اس بدنظمی سے ایرانیوں نے نفع اٹھایا اور صوبۂ شام پر حملہ کر دیا۔ سنہ ۲۶۰ء میں شہنشاہ ویلیرین کو ان کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی۔ ایرانیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور کئی سال تک دربار کسریٰ میں اس نے ذلت و خواری کی زندگی بسر کی۔

سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ہر صوبہ کے باشندوں کو اپنی اپنی عافیت کا خیال تھا کیونکہ رومی اب انکی حفاظت نہ کر سکتے تھے۔ شہنشاہیت روما میں تین حکومتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک اطالیہ کی جس کے ساتھ صوبۂ افریقیہ ملحق تھا دوسری غالیہ کی جس میں برطانیہ بھی شامل تھا اور امید تھی کہ یہ ریاست قوی اور خود مختار ہو جائے گی اور تیسری مشرق میں صوبہ جات شام و مصر شہر پالمیرا کے مطیع ہو گئے تھے جو کاروانوں کے راستہ پر ایک عظیم الشان تجارتی منڈی تھی۔ اس شہر کو کچھ عرصہ کے بعد ملکہ زنوبیہ کے زمانہ میں بہت عروج حاصل ہوا۔

مگر سلطنت میں ابھی تک قوت احیاء باقی تھی اور اس کے علاوہ سلطنت کے کسی حصے کے باشندوں میں روما سے علانیہ قطع تعلق کر لینے کی خواہش نہ تھی۔ سنہ ۲۶۸ء میں کلاڈیس کو سپاہیوں نے شہنشاہ بنایا اور اس نے کم از کم فوجی نقطۂ خیال سے ثابت کر دیا کہ اس کا انتخاب نامناسب نہ تھا۔ قوم گاتھ سلطنت میں دوامی قیام کا قصد کر رہی تھی اس لئے سب سے پہلے اسے اس طرف رخ کرنا پڑا اور اس نے جزیرہ نمائے بلقان میں اس قوم کو سخت شکست دی جس میں ان کا نقصان عظیم ہوا۔ مگر سنہ ۲۷۰ء میں یہ شہنشاہ مرض طاعون کا شکار ہوا جس کے شیوع سے اس ابتری کے زمانہ میں سلطنت روما میں اور بھی پریشانی پھیلی ہوئی تھی مگر حسن اتفاق سے اس کا جانشین آرئے لین اس سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوا اور زمانۂ مابعد میں "محی العسکر اور محی العالم" کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ سلطنت کے پراگندہ شیرازہ کو اس نے از سر نو مجتمع کیا۔ قوم گاتھ کو اس نے کئی مرتبہ شکست دی اور ان کے ساتھ دوامی معاہدہ کر کے ان کو صوبۂ ڈیشیا میں اس شرط پر آباد

ہونے کی اجازت دی کہ رومی فوج کے لئے سپاہیوں کی ایک مقررہ تعداد فراہم کریں قوم المانی کی تھی اس نے سرکوبی کی اور گالیہ اور برطانیہ کو بغیر کسی جنگ و جدال کے مطیع کر لیا۔ مگر اس کا مشہور ترین کارنامہ شہر پامیرا کی تسخیر ہے۔ اس شہر کی ملکہ زنوبیہ نے ریگستان کے درمیان میں نہایت زبردست قوت پیدا کر لی تھی۔ آئندہ تمدن کی ترقی اور مہذبی کے لئے بہتر ہوتا کہ اس ابتری کے زمانہ میں یہ حکومت اور اسی قبیل کی دوسری جو سلطنتیں قائم ہوئی تھیں باقی رہتیں کیونکہ سلطنت روما میں بہ سبب وسعت یہ ممکن نہ تھا کہ ایک ہی مرکز سے تمام سلطنت کا انتظام خوش اسلوبی کے ساتھ ہو سکتا اور جدید سلطنتیں جو قائم ہوتیں ممکن تھا کہ ان میں آزادی کا عنصر بھی ایک حد تک ہوتا۔ مگر ہر قابل حکمران سلطنت روما کی عظمت کو بحال کرنا اپنا فرض اولین خیال کرتا تھا اور اسی اصول پر کاربند ہو کر اس نے اپنی فوج کی باگ زنوبیہ کی طرف موڑی، بدنصیب ملکہ کو شکست ہوئی اور رومی اس کو شاداں و فرحاں سونے کی زنجیر میں جکڑ کر روما لے آئے مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی بیکسی پر فاتحین کو رحم آیا اور شہر روما کے قریب ایک محل میں اسے رہنے کی اجازت مل گئی شہر پامیرا کو رومیوں نے بالکل تباہ کر دیا اس کے نادر زمانہ مندر اور عمارات مسمار کر دی گئیں اور کنوئیں تک بند کر دیئے گئے۔ اس شہر کے کھنڈرات اب تک ریگستان کے وسط میں موجود ہیں سلطنت روما کے دشمنوں کو آرے لین نے زیر کر لیا تھا اور اب سیاسی معاملات طے کرنا باقی تھا، مگر روما کی بغاوت پسند فوجوں کو اس کی حکومت ناگوار تھی۔ ۲۷۵ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور پھر بدامنی شروع ہو گئی جو دس سال تک باقی رہی ۲۸۴ء میں ڈینیوب کی فوجوں نے اپنے سپہ سالار ڈائیوکلیشین کو سریر آرائے سلطنت کیا۔ ابتداءً اس کی تخت نشینی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی کیونکہ تیسری صدی عیسوی میں بیسوں ایسے بادشاہ ہوئے اور چند روزہ حکومت کے بعد صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئے۔ مگر اس کی تخت نشینی سے روما کی تاریخ میں ایک جدید اور دیرپا دور شروع ہوتا ہے کیونکہ یہ بادشاہ ایک نبرد آزما سپاہی تھا مشرق اور مغرب میں اس نے اپنا سکہ جما کر سلطنت روما کو پھر متحد کر دیا مگر اس کی شہرت کا دارومدار صرف اس کے فوجی کارناموں پر نہیں ہے بلکہ اس کے سیاسی اصلاحات اور مذہبی پالیسی اس سے زیادہ اہم ہے۔

ڈائیوکلیشین کا باپ غلام تھا اور تخت نشین ہونے سے قبل خود اس نے

سپاہیانہ زندگی بسر کی تھی مگر برسر اقتدار ہوتے ہی اس نے اپنی سیاسی قابلیت ثابت کر دی نظام سلطنت میں اس نے وسیع اصلاحات کیں جو آگسٹس کی اصلاحات سے کم اہم نہ تھیں گو ان اصلاحات کا مدعا کچھ اور ہی تھا۔ آگسٹس کے انتقال کے بعد جو تین صدیاں گذریں ان میں جمہوریت کا جو کچھ ظاہری دکھاوا باقی تھا وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہوتا گیا اور شہنشاہوں کی مطلق العنانی ظاہر ہونے لگی۔ ڈائیوکلیشین کے زمانہ میں اس دکھاوے کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اب سلطنت روما لفظاً و معناً شہنشاہیت ہو گئی۔

سب سے زیادہ ضرورت فوجی اصلاح کی تھی کیونکہ فوج کی تعداد ناکافی تھی اس کے علاوہ فوج اکثر باغی ہو جایا کرتی تھی اور مختلف سرحدوں پر افواج کو مطیع رکھنا ایک شخص کے بوتے سے باہر تھا۔ ان خرابیوں کو رفع کرنے کی ڈائیوکلیشین نے کوشش کی اور اس میں اس کو کامیابی بھی ہوئی۔ شہریان روما کی آزادی یا ان کی فلاح کی اس کو بالکل پروا نہ تھی۔ اس کو جو کچھ خیال تھا وہ فوج کی درستی کا تھا۔ یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے مشرقی دربار آداب و طریق کو روما میں رواج دیا یعنی جن چیزوں سے رومیوں کو سخت نفرت تھی اب ان کو طوعاً و کرہاً قبول کرنا پڑا۔ ڈائیوکلیشین نے اپنے سر پر تاج شاہی رکھا اور اپنے کو خداوند و خدا کہلوایا۔ خواجہ سرا اور نقیب اس کے دربار میں دست بستہ حاضر رہا کرتے اور اس کی حضوری میں ہر شخص یہاں تک کہ وزرا کو بھی سربسجود ہو کر آنا پڑتا۔ رسوم مذکور کی ایجاد غالباً خود پسندی سے نہ ہوئی تھی بلکہ اس میں یہ حکمت عملی مضمر تھی کہ بادشاہ کا احترام مثل دیوتا کے ہونے لگے تاکہ سپاہی اسے دیوتا خیال کریں اور اس کے احکام کی بجا آوری بلا چون و چرا کیا کریں دربار کے جو آداب اس نے مقرر کیے تھے بلا کسی تبدیلی کے ہزار سال تک قائم رہے۔

نظام سلطنت میں بھی ڈائیوکلیشین نے مزید اصلاحات نافذ کیں جن کے بموجب آئندہ سے سلطنت روما میں دو شہنشاہ بہ لقب آگسٹس ہونے لگے جن میں سے ایک میلان (اطالیہ) میں رہتا اور دوسرا نیکومیڈیا واقع ایشیائے کوچک میں۔ ہر دو شہنشاہوں کا ایک ایک شریک ہوتا تھا جسے سیزر کہتے تھے جو شہنشاہ کی وفات کے بعد اس کا جانشین ہوتا۔ گویا اس طور پر سلطنت روما میں وقت واحد کے اندر چار شہنشاہ اور چار شاہی دربار ہونے لگے اور تقسیم اقتدارات کا اصول ہر طرف ہونے لگا سلطنت کو بارہ خطوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر خطے کو سو صوبوں میں۔ عہدہ داران ملکی واو نے کی تعداد میں اضافہ کثیر کیا گیا۔ سول اور فوجی عہدہ دار الگ الگ کر دیئے گئے۔ ان اصلاحات سے عہدہ داروں کی کارکردگی ضرور بڑھ گئی مگر رعایا پر بھی محصولوں کا بار بڑھ گیا یہاں تک کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے گویا نئے کے ساتھ ہی کہ محصول دینے والوں کی تعداد ان لوگوں سے کم ہو گئی ہے جن کی گذر اوقات محصولوں پر تھی۔

فوج کی بھی از سر نو تنظیم عمل میں آئی اور اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا یعنی جمعیت دو پیادہ پائیں کی تھی

جن کا کام دراصل محل شاہی کی حفاظت تھا گر رفتہ رفتہ ان کی تعداد اسّی ہزار ہوگئی اور قلب سلطنت کی حفاظت ان کے سپرد ہوگئی، دوسری فوج ملی ٹائٹی یعنی سرحدی تھی جس کے سپرد سرحدوں کی حفاظت تھی۔ تیسری کمی ٹاٹین سیس تھی جو ہمیشہ نقل و حرکت کرتی رہتی تھی اور جس کا کام یہ تھا کہ جب کوئی وحشی فوج سرحدوں کے اندر گھس آئے اس کی سرکوبی کرے یہی ڈائیوکلی شین کے اصلاحات کا لب لباب ہے گو اسکی "چار گونہ" سلطنت کا نظام اسکی موت کے کچھ روز بعد شکستہ ہوگیا گر دوسرے خصوصیات باقی رہے۔

ڈائوکلی شین کی مذہبی پالیسی کا ذکر باقی ہے۔ بادشاہ خود بت پرست تھا گر کچھ روز تک اس نے مذہب مسیحی کے ساتھ رواداری جایز رکھی کیونکہ خود اس کے خاندان میں اس مذہب کے حامی موجود تھے۔ گر اپنے عہد سلطنت کے آخری زمانے میں اس نے اس جدید مذہب کی تخریب و تباہی کی جان توڑ کوشش کی۔ اس کا یہ فعل تعصب پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کو خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کلیسائے مسیحی کا زبردست نظام جس نے تیسری صدی مسیحی میں بہت کچھ قوت پکڑ لی تھی سلطنت کا رقیب ہوجائیگا اور اس لئے اس نے خیال کیا کہ سلطنت کی بقا کے لئے اس کو نیست و نابود کرنا ہی مناسب ہے اس کے قبل مسیحیوں پر جو کچھ مظالم ہوئے تھے وہ مختص المقام تھے اور ان کا اثر چند روز میں زائل ہوگیا گر اس بادشاہ نے عزم بالجزم کرلیا کہ اس مذہب کو بالکل نیست و نابود کردے سنہ ۳۰۲ء میں اس نے اپنا پہلا فرمان جاری کیا کہ تمام کلیسوں کو مسمار کردیا جائے مسیحیوں کی کتب مقدسہ عہدہ داران شاہی کے حوالے کرکے جلادی جائیں اور تمام مسیحی جو شاہی ملازمت میں تھے اپنے عہدوں سے معزول کردیے جائیں کچھ عرصہ کے بعد اس نے حکم دیا کہ تمام مسیحی اسقف قید کرلئے جائیں اور مسیحیوں کو اپنے عقاید سے توبہ کرانے کے لئے سخت جسمانی تکلیف بھی دیجائے۔ ان کے احکام سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کتب مسیحی اور کلیسۂ مسیحی کے نظام کی اہمیت محسوس کرتا تھا مسیحیوں پر مظالم کا سلسلہ سختی کے ساتھ جاری رہا جس سے بہت سے مسیحیوں نے جان سے ہاتھ دھوئے اور اکثر نے اپنے عقاید سے توبہ کی گر ڈائیوکلی شین کو جلد معلوم ہوگیا کہ وہ ایسی طاقت سے برسرپیکار تھا جو اس سے زیادہ قوی تھی اور مسیحیوں کی قوت کو ناپید کردینا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے سنہ ۳۰۵ء میں وہ سلطنت سے دست بردار ہوگیا تاکہ اپنی باقی ماندہ زندگی امن کے ساتھ بسر کرے۔ صحت کی خرابی اور اپنی مذہبی پالیسی میں ناکامی غالباً اس عزم کا باعث ہوئی اور وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے جانشین اسکے قائم کردہ نظام سلطنت کو کس طرح چلا سکتے ہیں سنہ ۳۰۵ء سے ۳۱۳ء تک اس نے زندگی گوشہ نشینی میں بسر کی اور باوجود متعدد کوششوں کے پھر اس نے سیاسی میدان میں قدم نہ رکھا۔

باب بست و پنجم

بت پرستی کا خاتمہ

ڈائیوکلیشین نے جو نظام سلطنت قائم کیا تھا وہ اس کی زندگی ہی میں متزلزل ہونے لگا تھا۔ انتظامی معاملات کو اس نے جس ڈھرے پر لگایا تھا اسی پر چلتے رہے مگر ایک ہی سلطنت میں چار بادشاہوں کا وقت واحد میں ہونا ناممکن العمل ثابت ہوا کیونکہ یہ ایسی بات تھی جس کا کسی زمانہ میں فروغ پانا مشکل تھا اور پھر ایسے پر آشوب زمانہ میں جب کہ باہمی اعتماد مفقود تھا اس پودے کا سرسبز ہونا سخت دشوار تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت روما میں پھر ابتری پھیل گئی اور مختلف مدعیان تاج و تخت میں سخت مجادلہ و مقابلہ کے بعد سلطنت پھر ایک شخص کے زیر نگیں ہوئی۔ یہ شخص کانسٹن ٹائن تھا جس کا باپ اگسٹس کے عہدے پر ممتاز تھا۔ جب اس کے باپ نے انتقال کیا کانسٹن ٹائن شہر یارک واقع انگلستان میں اپنی فوج کے ساتھ تھا۔ اس کے سپاہیوں نے اپنی رضا و رغبت سے اس کو شہنشاہ بنایا (۳۰۶ء) اور اس کے رقیبوں نے بھی اس وقت کوئی اعتراض نہ کیا مگر آخر کار اس کو بزور شمشیر سلطنت پر قبضہ کرنا پڑا۔ سنہ ۳۱۲ء میں اس نے کوہ آلپس طے کر کے اپنے رقیب میکزن شیس پر حملہ کیا۔ روایت کیجاتی ہے کہ اس کے جھنڈوں پر علاوہ رومی عقاب کے حضرت عیسٰی کے نام کے حرف بھی تھے اور اس نے خود بیان کیا ہے کہ آخری فیصلہ کن جنگ کے ایک روز قبل اس نے آسمان پر ایک صلیب دیکھی جس کے نیچے یونانی حروف میں لکھا تھا "اس کے بھروسے پر فتح کرو" یہ جنگ عظیم روما کے قریب سنہ ۳۱۲ء میں ملوین پل پر ہوئی۔ اس کا حریف شکست کھا کر

مارا گیا اور اس طرح کانسٹن ٹائن مغربی یورپ کا مالک ہو گیا۔ دس سال کے بعد مشرقی شہنشاہ لی کی نیس سے جنگ کے اسباب پیدا ہو گئے اور صوبہ تھریس میں کئی لڑائیوں کے بعد کانسٹن ٹائن تمام روما کا شہنشاہ ہو گیا۔

جولیس سیزر کے سوا کسی دوسرے رومی شہنشاہ کا اثر زمانہ پر اتنا نہیں پڑا ہے جتنا کہ کانسٹن ٹائن کا مگر اس کے خصائل کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ سپہ گری اور انتظام سلطنت میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ اگر نظام سلطنت میں اس نے معرکۃ الآرا انقلاب نہ کئے ہوتے تو اس صورت میں بھی اس کا شمار روما کے اعلیٰ ترین جنرلوں اور مدبروں میں ہوتا۔ اس کے کارنامے عظیم الشان تھے اور ان کا اثر دیرپا تھا مگر اس کی طینت میں وہ خصائل نہ تھے جن کو عموماً دنیا کے بڑے آدمیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ نہایت ہی ذی ہوش اور محتاط تھا۔ کوئی کام بلا غور و خوض نہ کرتا۔ اس کے مذہبی عقائد کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ مذہب مسیحی کا معتقد ضرور تھا مگر تا دم مرگ بت پرستوں سے اس کا یارانہ تھا اور ترحم اور عزت کا پاس اس میں بہت کم تھا۔ اصل یہ ہے کہ مذہب کا پاس اسے بہت کم تھا اور اپنے ذاتی مفاد کے آگے مذہب کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ کئی امور میں اس کی پالیسی آگسٹس سے مشابہ ہے مگر اس کا زمانہ زیادہ پر آشوب تھا اور حل طلب مسائل جو اس کے پیش نظر تھے زیادہ دقیق تھے۔

نظام سلطنت میں جو انقلابات اس نے کئے ان میں اہم ترین یہ تھا کہ اس نے مقام سلطنت روما سے بائی زین ٹیم میں منتقل کر دیا جو اس کے نام کی رعایت سے قسطنطنیہ مشہور ہوا۔ اس انقلاب کی اہمیت یہ ہے کہ سلطنت کی تمام گذشتہ روایات شہر روما سے وابستہ تھیں۔ سلطنت کا مرکز وہی تھا اور یہ خیال خام رومیوں کے دماغوں میں جم گیا تھا کہ ان کا شہر حیات ابدی رکھتا ہے اور جب اس کا زوال ہو گا تو دنیا کا خاتمہ ہو گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مقام سلطنت کی تبدیلی سے ایک انقلاب عظیم ہوا مگر یہ تغیر ضروری اور ایک حد تک مفید تھا کیونکہ ایک مدت سے روما صرف برائے نام دار السلطنت تھا۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت میں کوئی شہر اس کا ہمسر نہ تھا مگر جب سے کہ وحشیوں نے شدید حملے شروع کر دیے شہنشاہوں کو بہت کم موقع ملتا تھا کہ وہ روما میں قیام کریں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ڈائیو کلیشن نے اپنا قیام نکومیڈیا میں رکھا تھا اور دوسرا شہنشاہ میلان (شمالی اٹلی) میں

رہتا تھا۔ روما سرحدوں سے جہاں وحشیوں سے ہمیشہ خطرہ رہا کرتا تھا بہت دور تھا۔ مقام سلطنت کے لئے قسطنطنیہ سے بہتر کوئی شہر نہ تھا۔ تجارتی اور فوجی ہر دو اغراض کے لئے اس کا موقع نہایت مناسب تھا کیونکہ وہ ایک ایسی زمین پر واقع ہے جس کے تین طرف عمیق سمندر ہے اور چوتھی یعنی مغربی جانب معمولی فصیلوں سے بخوبی حفاظت ہو سکتی ہے اس کے شمال میں وہ عظیم الشان بندرگاہ ہے جو گولڈن ہارن کے نام سے مشہور ہے اور جس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے بندرگاہوں میں ہے۔ مصر کا غلہ وہاں نہایت آسانی کے ساتھ آسکتا تھا اور بحیرۂ اسود کی تمام تجارت اس کے تابع تھی اس کے علاوہ وہ ان دونوں سرحدات کے ٹھیک وسط میں تھا جہاں وحشیوں کی طرف سے خطرہ تھا۔ قوم گاتھ دریائے ڈینیوب کے سواحل اور کریمیا میں موجود تھی اور مشرق میں ایرانی دریائے فرات کے کنارے دھمکی دے رہے تھے۔ قسطنطنیہ دونوں کے وسط میں ہونے سے ایک مرکزی مقام تھا جہاں سے دونوں اقوام کی سرکوبی ہو سکتی تھی۔ انہیں وجوہ کی بنا پر قسطنطین نے دار السلطنت باسفورس کے کنارے آباد کیا۔ شہر کی بنیاد بڑی دھوم دھام سے پڑی اور مشرق کے مندروں اور دوسری عمارات کو تاخت و تاراج کر کے سنگ مرمر اور اشیاء زیبائش شہر کی آرائش کے لئے لائی گئیں۔

مقام سلطنت کی منتقلی کے وجوہات میں ایک وجہ موجہ کا ذکر باقی ہے۔ کانسٹن ٹائن کا عزم بالجزم تھا کہ سلطنت کے مذہب یا کم از کم مذہبی پالیسی میں ایک زبردست انقلاب کر دے۔ روما میں بت پرستی کا زور تھا اور اس کی گذشتہ روایات نہایت قوی تھیں جن سے اندیشہ تھا کہ کسی تغیر کی سخت مخالفت ہو گی۔ اس کے خلاف کسی نئے شہر میں اس انقلاب کا اجرا نسبتہً آسان تھا ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس کے مذہبی عقائد پختہ نہ تھے بت پرستی کا وہ مربی تھا اور آخر عمر میں جب اس نے اصطباغ لیا تو قدیم کلیسا میں شریک نہیں ہوا بلکہ ایک ایرئین قسیس کے ہاتھ پر ایمان لایا بیان کیا جاتا ہے کہ خود اس کی ماں مذہب مسیحی کی پیرو تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب تسخیر روما کے لئے بڑھ رہا تھا اس کے پھریروں پر مسیحی نشانات تھے اور ۳۱۳ء میں مل ویان پل کی جنگ کے قبل شہر میلان میں اس نے رواداری کا ایک مشہور اعلان شائع کیا جس میں اس نے حکم دیا کہ ایسے شخص کو جو مذہب مسیحی کے اصول کا پابند ہے۔ یا ایسے مذہب کا

پیرو ہے جس کو وہ اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے کسی قانونی حق سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے اس زمانے سے مذہب مسیحی کا وہ پورا مربی ہو گیا اور جدید شہر میں ابتدا ہی سے مسیحیت کی تبلیغ شروع ہو گئی۔ اس کی زندگی میں کبھی بت پرستی کو نیست و نابود کرنے کی کوشش نہیں کی گئی مگر مسیحی ان تمام قیود سے آزاد کر دئیے گئے جن سے اُنکی زندگی تنگ ہو رہی تھی قسیسین مسیحی کو خاص حقوق دئیے گئے اور مسیحیوں کو رسوم بت پرستی کی پابندی سے معاف کر دیا گیا۔ مگر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہنشاہ روما تمام سلطنت اب جس کی مطیع و منقاد تھی خود مذہب مسیحی کا حامی و مربی تھا۔ بت پرستی مذہب مسیحی کے ساتھ ساتھ کچھ دن اور برقرار رہی مگر اب اُس کا دم واپسیں تھا اور زمانہ کی ہوا اس کے خلاف اور مذہب مسیحی کے موافق تھی۔ اس صدی کے قبل مسیحیت تمام سلطنت میں رواج پا چکی تھی اور بت پرستی جس کا ڈائیوکلیشین کے زمانے میں دور تھا سلطنت کے دور دراز اور گمنام گوشوں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

شہنشاہ نے مسیحیت کی حمایت تو کی مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنا دباؤ بھی اس پر رکھا جس سے قسطنطنیہ میں فتوحات اسلامی کے زمانے تک کلیسیا کے معاملات بلکہ عقائد میں بھی شہنشاہوں کو دخل تھا۔ اس موقع پر گو قبل از وقت ہے مگر یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ شہنشاہ کی اس پالیسی سے روما میں متضاد نتائج پیدا ہوئے شہر روما اب سلطنت کا سیاسی مرکز نہ تھا کیونکہ شہنشاہ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا اور ممالک متمدنہ کا نظم و نسق اس کے سیاسی مجالس کے ہاتھوں میں نہ تھا اب وہاں سب سے زبردست شخصیت بشپ اسقف کی تھی جس کی ذات کے ساتھ روما کی عظمت کے بہت سے روایات وابستہ ہو گئے تھے اور اس طرح روما کو مذہبی معاملات میں وہ برتری اور فوقیت حاصل ہو گئی جو دنیاوی معاملات میں اس نے کھو دی تھی۔ اس کے علاوہ سلطنت کے اٹھ جانے سے بشپ روما کی طاقت میں روزافزوں ترقی ہونے لگی اور زمانۂ آئندہ میں کلیسائے مغربی کو پوری آزادی اور خودمختاری حاصل ہو گئی برخلاف اس کے بشپ اسقف یا بطریق قسطنطنیہ ہر بات میں شہنشاہ کا دست نگر تھا۔ اب ہم اس زمانے میں پہنچ گئے ہیں جو تاریخ عالم میں نہایت اہم ہے کیونکہ بلاشک و شبہہ اسی زمانے سے دور قدیم کا خاتمہ ہوتا ہے

اور ازمنۂ وسطیٰ کی ابتدا ہوتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ ان دونوں قرون کی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی۔ یونان اور روما کے عالم بت پرستی کے تمام خصوصیات مفقود ہو گئے تھے۔ شہری سلطنت اور ان کے جمہوری مجالس ناپید ہو چکے تھے ہر جگہ خود مختارانہ حکومت جاری تھی۔ شہریوں کی فوجیں جنھوں نے یونان کو ایران کے پنجۂ ستم سے آزاد کیا تھا اور روما کو سارے زمانہ کا مالک کر دیا تھا اب نظر نہیں آتیں اور ان کی جگہ تنخواہ دار فوجیں تھیں۔ جو شہریت کے نام تک سے ناواقف تھیں، حب وطن کا انھیں بالکل احساس نہ تھا صرف تنخواہ سے کام تھا اور اپنے سرگروہ کا نام لیوا تھیں۔ تمدن میں بھی انقلاب عظیم ہو گیا تھا شہروں اور قوموں اور قبیلوں میں جو امتیاز تھا وہ مفقود ہو گیا تھا جس سے سلطنت کی معاشی حالت بالکل بدل گئی تھی۔ اس کی بنیاد اب بھی غلامی پر تھی مگر غلامی کی نوعیت بدل گئی تھی غلاموں کی حفاظت کے لیے قوانین نافذ تھے اور اس تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے غلام آزاد کاشتکار ہو گئے تھے۔

ان تغیرات میں اہم ترین تغیر بنی نوع انسان کے اعتقادات اور مذاہب کا تغیر تھا مسیحیت کی آخری فتح کے قبل بھی بت پرستوں کے عقائد میں انقلاب عظیم پیدا ہو چکا تھا مسیحیت کی فتح یورپ کے مورخوں کے خیال میں دنیا کا سب سے بڑا مذہبی انقلاب ہے۔ کیونکہ مقامی دیوتاؤں کی پرستش کے بجائے ایک عام مذہب رواج پا گیا تھا اور بجائے ان مذہبی اعتقادات کے جو ہر مقام قوم اور زبان کے لحاظ سے مختلف تھے ایک ایسا مذہب پیدا ہو گیا تھا جس کا دعوے تھا کہ تمام آدمی اس کے معتقد ہو سکتے ہیں خواہ ان کا درجہ قوم یا زبان کی حیثیت سے کچھ بھی ہو۔ عالم بت پرستی کی دیویوں اور دیوتاؤں کی درخشاں مورتوں کے بجائے مسیح کی پرستش کا رواج پا جانا تاریخ عالم میں ایک عظیم الشان اور عجیب ترین انقلاب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایام بت پرستی میں ایک رجحان پیدا ہو گیا تھا جس سے یہ تغیر عظیم ہوا اور اس کے فلسفیوں کا کلیسائے مسیحی خود بہت ممنون ہے گو کلیسہ ان کا احسان نہیں مانتا۔ لیکن باوجود اس کے یورپ کے قدیم مذاہب اور اس جدید مذہب میں جو محبت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا فرق عظیم ہے۔

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انقلاب مذہبی کے ساتھ دنیا میں ایک نئی طاقت اور ایک جدید نظام کا ظہور ہوا جو اس کے قبل مفقود تھا زمانۂ قدیم میں بہت سے مذہب تھے اور بہت سے مندر مگر کوئی کلیسہ نہ تھا اور نہ یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسے اشخاص کی جماعت بھی ہو سکتی ہے جن کے عقائد مذہبی طریقۂ پرستش اور اخلاق ایک ہی ہوں۔ نہ یونان قدیم میں نہ روما میں، نہ بت پرستی کے عقائد یا بعد میں کلیسہ مسیحی کے مماثل کسی چیز کا پتا چلتا ہے جو آیندہ ایک ہزار سال کے لئے تاریخ یورپ کا مرکز بنی۔ سلطنت روما میں ڈائوکلیشین کے زمانے تک حکومت بالکل خود مختار تھی اور ہر بات میں اس کا اصرار تھا کہ رعایا اس کی مطیع ہو اور حکومت ہی منبع قوانین مذہب و اخلاق تھی۔ یہ انقلاب جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں نہایت سرعت کے ساتھ ہوا اور نہایت تعجب خیز ہے کیونکہ حکومت کے دوش بدوش ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی جو بنی نوع انسان کی اطاعت کی مدعی تھی اور رفتہ رفتہ حکومت سے اس کا اقتدار زیادہ ہو گیا اس کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ وحشیوں کے غلبے سے سلطنت ضعیف ہو رہی تھی مگر اصل سبب یہ ہے کہ لوگوں کے خیالات بدل گئے تھے اور جدید اعتقادات پیدا ہو گئے تھے جن کے لوگ شدت سے معتقد تھے۔ تاریخ کو قرون میں تقسیم کرنا ایک حد تک محض خیال ہے مگر اس لحاظ سے کہ اصلی انقلاب بنی نوع انسان کے خیالات میں ہوتے ہیں اس لئے زمانۂ قدیم اور قرون وسطیٰ میں حد فاصل مسیحیت کا غلبہ ہے جب کہ ازمنۂ وسطےٰ کے کلیسہ نے اچھی طرح جڑ پکڑ لی۔ اسی طرح قرون وسطیٰ کا خاتمہ اور زمانۂ حال کا آغاز نظام کلیسہ کے زوال سے ہوتا ہے جب کہ اصلاح مذہبی کے عہد میں یہ مذہبی اتحاد جاتا رہا اور مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔

حصۂ دوم

قرون وسطیٰ

باب اول

سلطنت روما میں دین مسیحی کا غلبہ

شہنشاہ کانس ٹن ٹائن کی زندگی میں اسکے مذہبی اصلاحات کی کوئی زبردست مخالفت نہ ہوئی بت پرست قوم کے سرخیل اور پوجاری اس مذہب کی ترقی خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے اور مخالفت کی جرات نہ کر سکے پھر بھی صنم پرستی کے آئین میں تغیر اس قدر دشوار تھا اور بت پرستی نظام تمدن کی رگ وپے میں اس قدر جذب ہو چکی تھی کہ بغیر کسی مجاہدے کے اس کا اثر زائل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ شہنشاہ کی زندگی کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ جو مذہب اس نے جاری کیا تھا اس کی ذات سے اس کو کچھ تقویت نہیں پہونچ سکتی تھی۔ اس کی فوجی اور سیاسی قابلیت میں کوئی شک نہیں مگر اخلاقی حالت روما کے بدترین بادشاہوں کی سی تھی۔ اس کی زندگی کے آخری ایام میں بلوے اور سازشیں ہوئی ہیں جن میں خود اس کا بیٹا اور بیوی اشتباہ میں قتل کئے گئے۔ ۳۳۷ء میں اس نے انتقال کیا اور اس کے دم توڑتے ہی محلسرا میں ایک ہنگامۂ قتال برپا ہوگیا جس کا سلسلہ ۳۵۰ء تک جاری رہا جب کہ اس کا بیٹا کانسٹین ٹیئس سریر آرائے سلطنت ہوا اس کے دور حکومت کے ابتدائی پانچ سالوں میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ ۳۵۵ء میں جولین جو قسطنطین کا عم زاد بھائی تھا شہنشاہی میں اس کا شریک ہوا جولین کے حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ فن سپہگری میں وہ غیر معمولی قابلیت

رکھتا ہوگا کیونکہ جب وہ دریائے رائن کی فوج کا سردار تھا اس نے جرمنی پر متعدد حملے کئے تھے اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ رومیوں میں نبرد آزمائی کا مادہ ہنوز باقی ہے کانس ٹین شیس نے جولین کے اکثر عزیزوں اور دوستوں کو تہ تیغ کر دیا تھا اس لئے دونوں میں سخت عناد تھا۔ ۳۵۹ء میں جولین کی فوجوں کو شہنشاہ نے حکم دیا کہ وہ دریائے فرات کی سرحد پر منتقل ہو جائیں جہاں ایرانیوں کے حملے کا خوف تھا۔ افواج نے اپنا مقام چھوڑنے سے انکار کر دیا اور علم بغاوت بلند کر کے آخر کار جولین کو شہنشاہ بنا دیا جولین نے منصب شہنشاہی کو قبول کر کے شہنشاہ سے اعلان جنگ کر دیا اور قسطنطینیہ کی طرف کوچ کر گیا مگر قبل اس کے کہ اس کی فوجیں وہاں پہونچیں موت نے کانس ٹین شیس کا خاتمہ کر دیا اور دسمبر ۳۶۱ء میں جولین تمام سلطنت روما کا واحد مالک ہو گیا۔ جولین کے عہد سلطنت کا سب سے دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ بت پرستوں نے دین مسیحی کی برتری اور فوقیت کو زیر وزبر کرنے کی آخری اور جاں گسل کوشش کی بت پرستی کے طاقت کے احیاء کے متعدد اسباب تھے۔ دین مسیحی کی کامیابی سے جو امیدیں وابستہ تھیں کہ امن و امان اور فارغ البالی حاصل ہوگی اور بدکاری معدوم ہو جائے گی اس میں سخت مایوسی ہوئی کیونکہ خود ملک میں خانہ جنگی کا سلسلہ جاری تھا اور پھر بیرونی ممالک سے بھی چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مسیحی شہنشاہ بدکاری اور عیاشی میں بت پرست بادشاہوں سے کم نہ تھے اور اس پر طرہ یہ کہ مسیحی آپس میں بھی لڑ رہے تھے کانس ٹین شیس کی تخت نشینی سے قبل ہی مسیحیوں میں تفرقہ پڑ گیا تھا اور انتظام کلیسہ کے متعلق جو مختلف عقائد اور خیالات تھے ان کے پیرووں میں سخت رقابت پیدا ہو گئی تھی جو آخری کامیابی کے بعد اور بھی تلخ ہو گئی افریقہ میں خصوصاً آتش رقابت نہایت سختی کے ساتھ بھڑک اٹھی تھی جس کا اصلی سبب یہ تھا کہ ڈائیوکلیشین کے زمانے ۳۰۳ء میں چند حکام کلیسہ نے اپنی مذہبی کتابیں ان کے خوف سے جلانے کے لئے دیدی تھیں گو اب یہ اصل وجہ معدوم ہو گئی تھی تاہم مختلف مسیحی فرقے اس وحشیانہ پن کے ساتھ آپس میں لڑ رہے تھے کہ صوبۂ افریقہ کا ایک بڑا حصہ ویران و برباد ہو گیا ان جھگڑوں کے علاوہ جن کے حالات زیادہ معلوم نہیں حضرت عیسٰے کی ذات وصفات کے متعلق ایک سخت بحث چھڑ گئی تھی جو کلیسۂ مسیحی کے ابتدائی زمانے سے اس کے سرداروں کو پریشان

کررہی تھی۔ تیسری صدی مسیحی میں مختلف بدعتی عقائد کا اظہار ہو چکا تھا مگر چوتھی صدی کے آغاز میں یہ مناقشات اور بھی شدید ہو گئے۔ شہر اسکندریہ میں مذہبی مباحث کا بازار بہت گرم تھا۔ یہاں ایک قسیس ایریس نامی تھا جس نے اس عقیدے کی تلقین شروع کی کہ حضرت عیسٰے اور خدا مشابہ عنا صر سے ہیں اور اس کے برخلاف راسخ الاعتقاد مسیحی جن کا سرگروہ اتھاناسیس تھا یہ باور کرتے تھے کہ خدا اور مسیح ایک ہی عنصر سے ہیں۔ علمائے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ امتیاز نہایت خفیف تھا مگر اس لفظی نزاع نے اتنا طول کھینچا کہ کلیسیہ کاتھولکی کی ہستی معرض خطر میں آ گئی تھی۔ ابتدا میں قدیم کلیسیہ اور ایرین فریق کے درمیان رسوم میں زیادہ اختلاف نہ تھا لیکن اگر اس فریق کے عقاید کو فروغ حاصل ہوتا تو قسیسین کو جو فوقیت عوام پر حاصل تھی وہ جاتی رہتی اور پاپائے روما کو وہ قوت میسر نہ ہوتی جو آخر کار اس کو حاصل ہوئی۔

اِن مذہبی اختلافات کو طے کرنے کے لئے بمقام نیقیہ (جنوبی فرانس) ایک کونسل منعقد ہوئی جس نے ایریس کے عقائد کو بدعتی قرار دیا لیکن اس کے معتقدین میں خصوصاً سلطنت کے مشرقی حصے میں کمی واقع نہ ہوئی۔ پاپائے روما نے اس مباحثے میں اتھاناسیس کا پورا ساتھ دیا۔ یہ مباحث پادریوں تک محدود نہ تھے بلکہ اس میں عوام بھی گرم جوشی کے ساتھ شریک تھے۔ دونوں فریقوں میں ایسی شدید منافرت پیدا ہو گئی کہ ان کو یہ بھی خیال نہ رہا کہ ہم دونوں مسیحی ہیں۔ ایریس اور اتھاناسیس کے معتقدین بت پرستوں سے زیادہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تک کہ مسیحیوں کے باہمی جھگڑوں اور نزاعوں سے عاجز آکر اکثر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مسیحیت سے تو بہتر ہے کہ بت پرستی ہی کو پھر زندہ کیا جائے اور تھا بھی یہی کہ بت پرستی میں انقلابات کے باعث یہ صلاحیت پیدا ہو گئی تھی کہ اس کا احیاء بہ آسانی ممکن تھا اور یہ عقاید بالکل مغائر ہو گئے تھے سیزر یا جولیس سیزر کو اگر جولین کے عقاید کا علم ہوتا تو ہرگز اسے اپنے اور اس کے عقاید میں کسی قسم کی مشابہت نظر نہ آتی ہم بیان کر چکے ہیں کہ بت پرستی پر تصوف کا رنگ چڑھتا جارہا تھا اور اس کے پیروؤں کی یہ کوشش تھی کہ اس کا نظام الیسا زبردست کر دیا جائے کہ وہ مسیحی کلیسا کا مقابلہ کر سکے۔ بت پرستوں کے منصوبوں میں جولین کی تخت نشینی سے یک گونہ پختگی آ گئی۔ جولین کی زبان پر مختلف دیوتاؤں کے نام

رہتے تھے مگر بذات خود یکتا موحد تھا اور سورج کے دیوتا مِتھرا اس کی پرستش کرتا تھا جس کو وہ قادر مطلق کی زندہ تصویر خیال کرتا تھا اور یہی رجحان ذی فراست بت پرستوں کا تھا۔ مسیحیت کے ابتدائی زمانے میں بت پرستوں کے اندر اپنے مذہب کا زیادہ پاس نہ تھا مگر اب ایک غالب جماعت میں مذہب کے ساتھ شغف پیدا ہو گیا تھا۔

جولین نے زمانہ قیام ایتھنز یہ عقائد سیکھے تھے۔ ایتھنز اس زمانے میں پھر تعلیم اور جدید بت پرستی کا ایک بڑا مرکز ہو گیا تھا۔ سلطنت کی ملازمت کی وجہ سے اسے ایتھنز کو با دل ناخواستہ چھوڑ دینا پڑا۔ مگر شہنشاہ ہوتے ہی اس نے اپنے اساتذہ کے عقائد کو رواج دینا شروع کیا۔ اس کی حکومت کا زمانہ نہایت مختصر تھا اس لئے یہ اندازہ کرنا دشوار ہے کہ اس کے تدابیر کے نتائج کیا ہوتے۔ مذہبی رواداری کا اس نے عام اعلان کر دیا۔ یہانتک کہ اس نے یہودیوں کے یروشلم میں اپنا معبد بنانے کی اجازت دیدی۔

سلطنت کے کتبوں اور سکّوں سے تمام مسیحی نشانات غائب ہو گئے۔ صنمکدوں میں پھر جوش و خروش سے لوگ جانے لگے اور شہنشاہ کو خوش کرنے کے لئے قربانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نظام مذہبی کی استواری اور پجاریوں کی تعلیم و اخلاقی تہذیب کے ساتھ ساتھ انھیں ایک زنجیر میں جکڑ دینے کا جولین کو خاص خیال تھا۔ مسیحیت کی ہستی کو ان تدابیر سے کچھ خوف نہ تھا لیکن اگر جولین کچھ اور زندہ رہتا تو مسیحیوں سے اس سے ضرور جھگڑا ہو جاتا کیونکہ اس نے مسیحیوں کو تمام تعلیمی عہدوں سے علیحدہ کر دیا تھا اور ملازمت سرکاری میں بت پرستوں کو مسیحیوں پر ترجیح دینے لگا تھا اور مسیحی قسیسین کو ان مالی مراعات سے بھی محروم کر دیا جن سے کانسٹنٹائن نے انکو سرفراز کیا تھا۔

مگر ان مذہبی اصلاحات کا فوجی مشکلات نے خاتمہ کر دیا۔ ایرانی اس زمانے میں اپنے بادشاہ شاپور کی سرکردگی میں سلطنت روما کے خطرناک دشمن ہو گئے تھے اور جولین کو مجبوراً ان پر فوج کشی کرنا پڑی۔ اپنی قابلیت کے سبب سے اس کو ابتدا میں فتوحات حاصل ہوئے۔ اور دریائے دجلہ کو عبور کر کے اس نے ایران کے قلب پر ایک حملہ کرنا چاہا مگر رسد کے نہونے کی وجہ سے اس کو لوٹنا پڑا اور مارا گیا۔

روایت کیجاتی ہے کہ جولین کے آخری الفاظ یہ تھے "کہ مسیح تو نے مجھ پر فتح پائی" اور اس میں شک نہیں کہ اس کی موت کے بعد بت پرستی کی کامیابی کا آخری موقع بھی جاتا

رہا بلکہ یہاں تک ہوا کہ اس مذہب کی ہستی معرض خطر میں آگئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت روما کے کسی بڑے طبقے میں نہ تو قدیم مذہب کی طرف اعتقاد راسخ ہی تھا اور نہ اس کے قائم رکھنے کی پرزور خواہش ہی پائی جاتی تھی۔ خود جولین کو بھی اس امر کی طرف سے سخت مایوسی تھی کہ جس مذہب کے ساتھ اس کو اس قدر شغف تھا اس میں اس کے حاشیہ نشینوں کو صرف سرسری دلچسپی تھی۔ بت پرستی کا بلا کسی جنگ وجدل کے معدوم ہو جانا ہی خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے پیرووں میں نہ جوش تھا اور نہ اعتقاد۔

اس کے علاوہ اور اہم واقعات بھی ہو رہے تھے یعنی وحشی قوموں کے حملے مگر فی الحال ہم صرف مذہبی امور اور خصوصاً مسیحیت کی آخری فتح کا ذکر کرینگے جولین کے بعد کئی شہنشاہوں کی چندروزہ حکومت رہی جن کا صفحات تاریخ میں کوئی کارنامہ مندرج نہیں ہے۔ مگر ۳۷۸ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس تخت نشین ہوا جس کا دور حکومت کئی وجوہ سے اہم ہے آیندہ باب میں تفصیلاً بیان کیا جائے گا کہ سلطنت روما اور وحشیوں کے کیا تعلقات تھے۔ اسی بادشاہ کے عہد حکومت میں قوانین روما کی ترتیب اختتام پر پہونچی اور آیندہ کی نسلوں پر اس کا احسان عظیم ہے اس باب میں ہم صرف اس کی مذہبی پالیسی پر تبصرہ کرینگے۔

تھیوڈوسیس مسیحی تھا اور مسیحی بھی نہایت راسخ الاعتقاد تھا ناسیس کا سرگرم پیرو اس سے پہلے کے شہنشاہ زیادہ تر ایرین تھے۔ اس کی حکومت میں ایرین فرقے کو شکست فاش نصیب ہوئی اور بت پرستی بالکل معدوم ہو گئی بت پرستی کی آخری جدوجہد میں کوئی بات قابل ذکر نہیں کیونکہ اس کا نظام بہت ضعیف تھا اور مسیحیت کی فتح زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوئی۔ بت پرستی کا زبردست مرکز شہر روما میں تھا مگر یہاں بھی اس کا ضعف عیاں تھا کیونکہ ۳۸۲ء میں فتح کی دیوی کی مورت سینٹ کے مکان سے نکال دی گئی دس سال کے بعد شہنشاہ تھیوڈوسیس خود روما میں وارد ہوا۔ روایت کی جاتی ہے کہ اس کی موجودگی میں سینٹ میں مباحثہ ہوا کہ شہر روما کا مربی جوپٹر دیوتا خیال کیا جائے یا حضرت عیسےٰ شہنشاہ کی موجودگی سے بآسانی فیصلہ

ہوگیا۔ سینٹ نے مسیحیت کے حق میں فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کے بموجب متعدد قوانین وضع کئے گئے۔ بت پرستی کی عام قربانیاں موقوف کردی گئیں اور خلاف ورزی کے لئے سزاء موت تجویز کی گئی۔ روما کے قدیم دیوتاؤں کی پرستش قربانی کے بغیر بھی ممنوع کردی گئی۔ دیوتاؤں کے مندر جن میں ایسی عمارتیں بھی تھیں جن سے بہتر بنی نوع انسان نے کبھی نہیں بنائیں مسمار کردی گئیں بعضوں کے مینار اور سنگ مرمر مسیحی کلیساؤں میں منتقل کردیئے گئے اور بعض مندر مثلاً پینتھیان واقع روما اور پارتھینان واقع ایتھنز مسیحی استعمال میں آگئے اور اس وجہ سے وہ محفوظ رہے۔ مسیحیت کی فتح کے ساتھ افسوس ہے کہ فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو اس بیدردی سے تباہ کیا گیا کہ صفحات تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ سلوک نہ صرف سنگ تراشی اور نقاشی کے بہترین نمونوں کے ساتھ کیا گیا بلکہ شعراء، فلسفیوں اور مورخوں کے اُن تصانیف کے ساتھ بھی روا رکھا گیا جن کو بت پرست مسیحیوں کے کتب مقدسہ کا ہم پلہ خیال کرتے تھے۔ اس وجہ سے مسیحیوں نے شاعر ورجل کے کلام کے سوا ان سب کا مطالعہ ممنوع کردیا اور زمانۂ قدیم کے نادر تصانیف اس وقت تک گمنامی اور کس مپرسی میں پڑے رہے جب تک کہ انھیں دوبارہ زندہ کرنے کا وقت نہیں آگیا قرون وسطیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بالکل جہالت کا زمانہ تھا غلط ہے مگر ایک لحاظ سے صحیح بھی ہے علم کی جو شعاعیں یونان سے نکلکر تمام عالم کو منور کئے ہوئے تھیں بالکل معدوم نہ ہوسکتی تھیں مگر دھندلی ضرور پڑ گئی تھیں جس سے بنی نوع انسان مدت تک جہالت میں مبتلا رہے۔

عہد تھیوڈوسیس کے ایک واقعہ پر سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت کی فتح سے دنیا میں ایک نئی قوت کا ظہور ہوگیا تھا آئندہ باب میں ہم بیان کرینگے کہ بادشاہ نے قومؑ گاتھ سے خوشگوار تعلقات قائم کرلئے تھے یعنی سالونیکا (سلانیکہ) کے باشندوں نے وہاں کے گاتھی سپاہیوں اور کچھ افسروں کو قتل کردیا جس سے بادشاہ سخت برافروختہ ہوگیا اور قتل عام کا حکم دیدیا اس میں اس شہر کے ہزاروں باشندے تہ تیغ کردئے گئے اس حکم کی سفاکی میں شک نہیں مگر اس زمانے میں اس قسم کی سفاکیاں اور مظالم

عموماً ہوا کرتے تھے۔ اس واقعے کی اہمیت یہ ہے کہ بادشاہ کے اس فعل کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور اس کو اپنی بیرحمی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایسے مسیحی قیصروں کے درمیان اس وقت سربرآوردہ لوگوں میں سینٹ ایمبروس اسقف میلان تھا جس نے شہنشاہ کی اس سفاکی پر حد درجہ خفگی ظاہر کی اور جب بادشاہ نے میلان کے گرجے میں آنا چاہا تو اسقف نے اس کو نہ صرف گرجا میں آنے اور نماز میں شریک ہونے سے منع کر دیا بلکہ اس کو دین مسیحی میں اس وقت تک پھر نہ داخل کیا جب تک کہ اس نے اپنے افعال پر مجمع عام میں پشیمانی ظاہر نہ کی۔ اس واقعے کی اہمیت میں کلام نہیں۔ غضب ہے کہ جولیس سیزر کے جانشین کی ایک پادری کے ہاتھوں یہ ذلت ہو اور تمام رومی فوجوں کا سردار "دو مصلوب یہودی" (حضرت عیسے بقول مسیحیاں) کے جانشین کے آگے سرنگوں ہو۔ تاریخ عالم میں ایسے انقلاب کم ہوئے ہونگے۔ اس زمانے سے یورپ میں شہنشاہ اور مسیحی کلیسا دو عظیم قوتیں ہیں جن میں صلح شاذ اور مخالفت بیشتر رہتی ہے۔ اس کشمکش کا سلسلہ اس زمانے تک جاری رہا جب تک کہ دونوں کا زور ٹوٹ نہ گیا اور اسی کے ساتھ قرون وسطے کا بھی خاتمہ نہ ہو گیا۔

باب دوم

قوم گاتھ کے فتوحات اور سلطنت روما کا مغرب میں خاتمہ

گذشتہ باب میں ہم تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ مسیحی کلیسا کو اپنے بت پرست مخالفوں پر غلبہ کامل حاصل ہوا۔ مگر اس زمانے میں ایک اور قسم کی کشمکش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سلطنت روما کو وحشیوں کے حملے دفع کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دینا پڑی۔ کلیسائے مسیحی کا غلبہ وحشیوں کی کامیابی میں ممد ہوا کیونکہ حکومت روما اپنی مصروفیت کے سبب سے حملہ آوروں کو اپنے حدود سے نکالنے میں اپنا پورا زور صرف نہ کر سکتی تھی۔

سنہ ۳۵۰ء کے بعد مختلف اقوام جو زیادہ تر جرمنی الاصل تھیں رفتہ رفتہ حدود سلطنت روما میں اپنا قدم جمانے لگیں بلکہ بعضوں نے تو سلطنت روما کو اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔ اِن واقعات کو کبھی وحشیوں کے حملوں کبھی ہجرت اقوام کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی واقعات سلطنت روما کے اسباب زوال خیال کئے جاتے ہیں۔

قبل اس کے ہم تفصیلاً بیان کریں کہ وحشیوں نے سلطنت روما کے مختلف ممالک پر کس طرح قبضہ کر لیا ان کی نقل و حرکت کے عام حالات بیان کرنا ضروری ہیں۔ واضح رہے کہ وحشیوں کا حملہ سیلاب کی طرح نہ تھا اور نہ یہ ہوا تھا کہ یکایک سلطنت روما کی سرحدوں کی حفاظت متزلزل ہو گئی ہو جس سے وحشی سلطنت روما کے حدود میں دفعتاً گھس آئے ہوں بلکہ رومیوں نے وحشیوں پر اپنی فوجی برتری ایک زمانے تک قائم رکھی مگر رومی فتوحات کے باوجود وحشی حدود سلطنت میں برابر گھستے آئے اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سلطنت روما کو شکست دینے کے بجائے وحشی اس میں جذب ہو گئے اور اس طرح رومیوں کو بیدخل کر کے سلطنت روما کے چند نہایت زرخیز خطوں پر

متصرف ہو گئے یہ بھی واضح رہے کہ سلطنت کو تہ و بالا کر دینے اور اس پر قابض ہو جانے کے قبل ان سب وحشیوں کا سلطنت کے حلقہ بگوشوں میں شمار تھا ہم بیان کر چکے ہیں کہ رومیوں کی یہ عادت تھی کہ سرحد پار کے وحشیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیتے تھے جس وجہ سے وہ رومی انضباط اور فوجی قواعد سے واقف ہو گئے تھے اور اپنی قوموں کو بھی وہ طریقے سکھا دئے تھے۔ وحشیوں کا رومیوں پر غالب ہونے کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ان لڑائی کی گھاتوں سے واقف ہو گئے تھے جن سے رومیوں نے انکو مغلوب کیا تھا اس کے علاوہ یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ گو یہ وحشی نہایت دلیر اور جنگجو تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ خود ایک خوفناک دشمن سے جان بچانے کی غرض سے اپنے وطن کو چھوڑ کر سلطنت روما میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوئے تھے ہر چند سلطنت روما کی کمزوری اور اس کی دولت پر قابض ہونے کا لالچ ضرور انکے حملوں کا باعث تھا مگر اصل سبب یہی تھا کہ وہ خود ایک نہایت ہی خطرناک اور بیرحم دشمن سے پریشان ہو کر بھاگ رہے تھے۔

لفظ وحشی (Barbarian) غیر صحیح معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حملہ آور رومیوں سے علوم و تمدن میں بہت پیچھے تھے مگر ان سے علم و ہنر سیکھنے کو تیار تھے۔ روما کی عظمت اور اس کے نظام سلطنت کا ان کے دلوں پر رعب جما ہوا تھا۔ انکی نیت یہ تھی کہ تمدن تباہ کر دیں بلکہ خود بھی اس میں حصہ لیں۔ قوم گاتھ کی حالت خاصکر یہی تھی۔ اس قوم نے سب سے پہلے روما پر فتوحات حاصل کئے۔ رومی دوسرے حملہ آور وحشیوں کو بھی گاتھ کے نام سے یاد کرتے تھے تیسری صدی عیسوی میں سلطنت روما پر حملہ کرنے کے بعد قوم گاتھ وسطی یورپ میں بحیرۂ اسود سے بحیرۂ بالٹک تک آباد ہو گئی اور کریمیا میں اس کا اصل مرکز تھا جس زمانے میں رومیوں سے ان سے پہلے پہل مڈبھیڑ ہوئی اس وقت یہ قوم بت پرست تھی مگر سو سال کے بعد جب انھوں نے سلطنت روما پر حملہ کیا تو وہ دین مسیحی قبول کر چکے تھے اس قوم میں مذہب مسیحی کو مقدس مبلغ الفیلاس (۳۱۱ تا ۳۸۰ء) نے پھیلایا تھا۔ یہ مبلغ فرقہ ایرین سے تعلق رکھتا تھا اور اسی کے عقائد کی اس نے قوم گاتھ میں تبلیغ کی تھی مگر قدیم مسیحیت اور اس فرقہ کے عقائد میں بہت فرق تھا جسکی وجہ سے آیندہ چل کر قوم گاتھ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس مبلغ نے بائبل کا زبان گاتھک میں ترجمہ کیا اور

یہ نیا مذہب نہایت سُرعت کے ساتھ تمام قوم میں بلا کسی مزاحمت کے پھیل گیا چوتھی صدی میں قوم گاتھ مسیحی ہو چکی تھی اور اس کے تمدن پر مذہب مسیحی کو فخر ہو سکتا تھا۔ الفریڈ اعظم کے زمانے سے قبل جو تمدنی حالت انگریزوں کی تھی وہی ان کی بھی تھی اور دوسرے اقوام سے زیادہ ان میں رومی تہذیب کے قبول کرنے کی صلاحیت تھی۔

سنہ ۳۷۲ء کے قریب قوم ہن جو وسط ایشیا کے تاتاری اقوام سے تھی ان کے زاد و بوم پر بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو گئی۔ قوم ہن کے حملے کے وجوہ نامعلوم ہیں۔ قوم گاتھ کو دریائے نیسٹر کے کناروں پر شکست ہوئی اور بھاگ کر ڈینیوب پر پہونچی اور سلطنت کے حدود میں داخل ہونے کی خواستگار ہوئی۔ حدود سلطنت کے اندر قوم گاتھ کی تعداد کثیر تھی اس کے علاوہ جزیرہ نمائے بلقان کا شمالی حصہ مسلسل محاربات کی وجہ سے غیر آباد ہو گیا تھا اور زمینیں بنجر پڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے قوم گاتھ کی درخواست منظور کی گئی اور سنہ ۳۷۶ء سے وہ ڈینیوب کے جنوبی اضلاع میں ٹڈی دل کی طرح آکر آباد ہونے لگے۔ شہنشاہ وقت مسمی والنس (Valens) نے ان کو آباد ہونے کی اجازت دیدی مگر اس کی طبیعت میں بدگمانی اور ضرر رسانی کا مادہ تھا اور اس وجہ سے دونوں قوموں میں جو دوستانہ پیدا ہو گیا تھا اس میں رخنہ پڑ گیا اور آخر کو جنگ شروع ہو گئی اور (بمقام ایڈریانوپل) سنہ ۳۷۸ء میں رومیوں کو شکست فاش ہوئی۔ حملہ رومیوں نے کیا تھا اور قریب تھا کہ فتح انھیں کی ہو مگر اسیوقت گاتھ سواروں کا ایک زبردست رسالہ آگیا جسکی وجہ سے رومیوں کو سخت ہزیمت ہوئی اور پھر اس شکست سے رومی سنبھل نہ سکے کیونکہ ان میں سنبھلنے کا مادہ باقی نہ رہا تھا۔ اس کے بعد بھی کبھی کبھی رومی وحشیوں پر غالب آئے مگر فتح نے ان سے منہ موڑ لیا تھا مگر گاتھ بھی اپنے فتوحات سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکے کیونکہ انکی فوج میں طاعون پھیل گیا اور ان کا سردار مر گیا۔ شہنشاہ تھیوڈوسیس کو ان کے مقابلے میں کچھ کامیابی ہوئی اور آخرکار دونوں فریقوں میں ایک اہم صلحنامہ ہوا جس کی رو سے تھریس اور ایشیائے کوچک کا ایک معتد بہ حصہ ان کو دیدیا گیا اور گاتھوں نے وعدہ کیا کہ وہ چالیس ہزار سپاہی رومی فوجوں میں بھرتی کرنے کے لئے دینگے جن کے افسر بھی گاتھی ہونگے مگر سب شہنشاہ کے زیر حکم ہونگے سلطنت کے دشمنوں کو

اُن کا محافظ بنانا خطرے سے خالی نہ تھا مگر تھیوڈوسیس کی زندگی میں یہ انتظام قائم رہا اور اگر اُس کے جانشین بھی قابل ہوتے تو سلطنت کو اس سے دائمی نفع رہتا تو مگر ۳۹۵ء میں جب اس کا انتقال ہوگیا تو سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا ایک بیٹا آرکیڈیس قسطنطینہ میں سلطنت کرنے لگا اور دوسرا ہونوریس اٹلی میں۔ مگر ہونوریس نے روما کے بجائے شہر راونیا کو (Ravenua) اپنا دارالسلطنت قرار دیا کیونکہ اب روما محفوظ خیال نہیں کیا جاتا تھا راونیا کا موقع نہایت خراب تھا اور دلدلوں سے گھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے بخار کا مرض ہر وقت رہا کرتا تھا مگر یہ شہر روما کے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ تھا۔ رومیوں کی قوت کا انحطاط صرف دارالسلطنت کے منتقل کر دینے سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس امر سے بھی کہ رومی اپنے ملک کی حفاظت کا بار وحشیوں پر ڈال رہے تھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ رومیوں نے گاتھوں کی ایک تعداد کثیر کو فوج میں شریک کر لیا تھا مگر اس کے علاوہ دوسرے اقوام کے وحشی بھی رومی افواج میں ملازم تھے اور نہ صرف سپاہی کی حیثیت سے بلکہ بڑے بڑے جنرل بھی وحشی النسل تھے۔

۳۹۵ء میں جب تھیوڈوسیس کا انتقال ہوا اور اس کے نااہل بیٹے اسکے جانشین ہوئے تو اسی سال الارک جو قوم گاتھ کا گل سرسبد تھا ان کا بادشاہ ہوا اس کا تعلق مغربی گاتھوں سے تھا اور وہ نہایت جنگ جو حوصلہ مند عہد کا پکا اور سچا عیسائی تھا مشرقی سلطنت سے اس سے سخت ان بن تھی اور اس کی یہ پہلی یورش شہر قسطنطینہ پر ہوئی مگر فصیلوں کی مضبوطی کے سبب سے اس کو ناکامی ہوئی اس لئے اُس نے جنوب میں یونان پر دھاوا کیا اور تاخت و تاراج کرتا ہوا بلقان کے شمالی مغربی حصے میں اقامت گزیں ہوا۔ سنہ ۴۰۲ء میں غالباً شہنشاہ آرکیڈیس کی شہ سے جو ایسے خطرناک آدمی کا اپنی حدود سلطنت میں رہنا پسند نہ کرتا تھا الارک نے مغرب کی طرف اٹلی کا رخ کیا مگر وہاں اس کو برابر فتح نصیب نہیں ہوئی شہر ویرونا کے قریب اس ٹی لی چو جو رومی افواج کا وانڈل سردار تھا اس کا مدمقابل ہوا اور اس نے الارک کو شکست فاش دیکر اطالیہ سے نکال دیا اس ٹی لی چو کو فخر تھا کہ اس نے قوم گاتھ کو ہمیشہ کے لئے نابود کر دیا اور اس کے اعزاز و افتخار میں افزائش ہوگئی۔ مگر کچھ ہی

سال کے بعد الارک کو پھر کامیابی کا موقع ملا۔ شہنشاہ اس جری سپاہی سے بدگمان ہو گیا جس کے اثر کی وجہ سے امور سلطنت میں اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا اور انہی کے اشارہ سے ۴۰۸ء میں اسٹی لی چو قتل کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سپاہیوں نے شاہی فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا اور ہزاروں الارک کی فوج میں جا کر شریک ہو گئے اس لئے جب الارک نے ۴۰۸ء میں دوبارہ حملہ کیا تو اس کے مقابلے کے لئے نہ کوئی جنرل تھا اور نہ فوج ہی تھی۔ اطالیہ کا پورا چکر لگاتا ہوا اور راونیا سے گزرتا وہ روما کی دیواروں کے پاس پہونچا۔ اس نے روما کا تین دفعہ محاصرہ کیا اور اگر چاہتا تو قبضہ بھی کر لیتا مگر الارک میں یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ وہ خود رومی تمدن کا دلدادہ تھا اور گو اس نے رومی افواج سے نبرد آزمائی کی تھی مگر اس کی اصلی خواہش یہ تھی کہ سلطنت روما میں اسے کوئی معزز عہدہ ملجائے۔ اسی وجہ سے وہ دو مرتبہ روما کے محاصرہ سے دست بردار ہوا مگر جب اسے مایوسی ہوئی اور اس نے دیکھا کہ شہنشاہ اور رومی اسے دھوکا دے رہے ہیں اس نے ۴۱۰ء میں تیسری مرتبہ پھر روما کا محاصرہ کر لیا ان اہم واقعات کا ہمیں تفصیلی علم نہیں۔ کیونکہ گاتھوں کا کوئی مورخ نہیں اور رومیوں کو اپنی ہزیمت اور شکست کی تصریح ناگوار تھی مگر اتنا ظاہر ہے کہ جب رسد نہ ہونے سے رومی افواج کی حالت ابتر ہو گئی تو الارک نے دھاوا کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور اس کے سپاہیوں نے قتل عام اور لوٹ مار مچا دی مگر پھر بھی الارک نے اپنے سپاہیوں کو ایک حد تک قابو میں رکھا اور بہت جلد روما کو چھوڑ کر جنوبی اطالیہ کی تسخیر کے لئے روانہ ہو گیا اور وہیں کسی مہلک عارضے میں مبتلا ہو کر قضا کر گیا اور دریائے بوسینٹو کے قریب دفن کیا گیا۔ قبر تیار کرنے کے لیے اس کی موج سے اس دریا کے دھارے کا رخ پھیر دیا تھا۔

الارک کی فتح روما سے سلطنت روما کا خاتمہ نہیں ہوا مگر مغربی سلطنت کے انحطاط کے اسباب میں یہ ایک نہایت اہم چیز ہے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مرکز ہونے سے روما کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اہل زمانہ

خیال کرتے تھے کہ اس کی یہ ایک نہایت اہم جز ہے اس سقوط سے تمدن کی بیخ و بنیاد ہل جائے گی۔ عیسائیوں پر یہ تہمت لگائی جانے لگی کہ جب تک روما میں قدیم دیوتاؤں کی پرستش ہوتی رہی ہمیشہ فتح ہی فتح رہی مگر جب سے عیسائیت کا رواج ہوا اقبال نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اگسٹنوس نے جو رہبانوں میں نہایت نامور ہوا ہے اس کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جو "شہر خدا" کے نام سے مشہور ہے الارک کی موت سے رومیوں کی ایک بڑے خطرے سے گلو خلاصی ہوئی کیونکہ اپنے سردار کے مرنے سے گاتھ بے سر کے ہو گئے۔ مگر رومیوں میں سنبھلنے کی صلاحیت بالکل باقی نہیں رہی تھی اور نہ کوئی امید تھی کہ وہ وحشیوں کو اپنے ملک سے نکال سکیں گے الارک اور گاتھیوں کی طرح دوسرے وحشی اقوام نے اطالیہ کو اپنا آماجگاہ بنا لیا اور بحیرۂ ایڈریاٹک کے مغربی کنارے کے اضلاع بالکل وحشیوں کے تصرف میں آ گئے یہاں تک کہ مغربی شہنشاہ کی برائے نام حکومت بھی بالکل معدوم ہو گئی۔ گاتھیوں میں الارک کا جانشین اٹالفس ہوا جس نے گالا پلاسیڈیا دختر شہنشاہ تھیوڈوسیس سے عقد کیا اور اس شہزادی کی منت و سماجت سے اس نے اطالیہ کو خیرباد کہکر جنوبی غالیہ اور شمالی ہسپانیہ میں ایک جدید سلطنت قائم کی جو تین سو سال تک قائم رہنے کے بعد ایک دوسری وحشی قوم کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

اسی زمانے میں افریقہ کا صوبہ جو سلطنت روما کے مقبوضات میں نہایت متمدن تھا رومیوں کے ہاتھ سے نکلکر ایک دوسری وحشی قوم کے قبضہ ۴۲۹ء میں چلا گیا جو وانڈال کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قوم گاتھیوں سے مشابہ تھی اور ابتدا میں خیال کیا جاتا تھا کہ الارک کے سپاہیوں سے یہ لوگ سست ہیں اور ان میں جنگجوئی کا مادہ بھی بہت کم ہے مگر انھیں بھی جنسرک نامی ایک جری سردار مل گیا جسکی سرکردگی میں ملک غالیہ طے کرتے ہوئے وہ ہسپانیہ میں وارد ہوئے اور کئی بڑے بڑے اضلاع پر قابض ہو گئے۔ صوبۂ افریقہ میں وہاں کے صوبہ دار اور سلطنت روما میں کچھ نزاع تھی جس سے ایک فریق قوم وانڈال سے امداد کا طلبگار ہوا انھوں نے تمام صوبے پر نہایت آسانی سے قبضہ کر لیا شہر قرطاجنہ البتہ دس سال کے بعد یعنی ۴۳۹ء میں ان کے قبضے میں آیا قوم وحشی گاتھ کی طرح اس قوم کے خصائل

پسندیدہ نہ تھے یہ لوگ بے رحم لٹیرے اور قزاق تھے افریقہ کا تمدن انھوں نے قریب قریب نیست و نابود کر دیا تھا گو مذہبی نزاعوں سے اس صوبے کی حالت پہلے ہی سے ابتر تھی۔ ان مصائب کے دوران میں راہب اغسطنوس نے کتاب "شہر خدا" مذہب مسیحی کی تائید میں لکھی۔

قوم وانڈال کی تاخت و تاراج کے بعد رومی دنیا میں ایک دوسرے دشمن کا ظہور ہوا جو مذکورۂ بالا دونوں اقوام سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہ قوم ہن تھی جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ دریائے ڈنیسٹر پر فتح پا کر انھوں نے مغرب کا رخ کیا اور سلطنت روما پر حملہ آور ہوئے۔ ان کا سردار اٹیلا بڑا جنگجو اور منتظم تھا جس کا نام اب تک صفحات تاریخ میں یادگار ہے گا تھ تو صرف نام کو وحشی تھے مگر قوم ہن پر لفظ وحشی کا پورا اطلاق ہو سکتا تھا یہ لوگ خانہ بدوش تھے، ایک مقام پر آباد ہو نگی پروا نہ تھی رومی تمدن سے ان کو نفرت تھی اور ان کا انتظام مملکت نہایت ابتدائی حالت میں تھا مگر جب اٹیلا ایسا سردار ان میں پیدا ہو گیا تو یہ درحقیقت اپنے ہمسایہ اقوام کے لئے خطرناک ثابت ہوئے۔ ۴۴۷ء میں مشرقی رومی سلطنت پر اس نے حملہ کیا اور قسطنطنیہ تک تمام ملک ویران و تباہ کرتا ہوا پہونچ گیا۔ وہاں سے پھر لوٹ مار کی غرض سے اس نے شمال کا رخ کیا اور جرمنی کو طے کرتا ہوا ۴۵۱ء میں غالیہ کی سرحد پر آ دھمکا۔ غالیہ کا ایک حصہ اب تک رومیوں کے قبضے میں تھا اور جنوبی حصے پر ویسی گاتھ قابض تھے مگر چونکہ اٹیلا کے حملے سے دونوں کو خطرہ تھا اس لئے دونوں نے ملکر اس کا مقابلہ کیا اور ۴۵۱ء میں دونوں متحدہ فوجیں بسر کردگی اے ٹیس جو رومیوں میں اخیر مشہور جنرل ہے شہر تروائے کے قریب صف آرا ہوئیں گر اس لڑائی کو تاریخ میں خیمہ شالوں کہتے ہیں اٹیلا کو شکست ہوئی جس سے غالیہ اس کے پنجے سے چھوٹ گیا اٹیلا دریائے ڈینوب کی طرف واپس ہوا گر قوم ہن سلطنت روما کے اس صوبے سے نکل کر ایک دوسرے صوبے میں پھر نمودار ہوئی یعنی ۴۵۲ء میں کوہ ایلپس کے مشرقی دروں میں سے گذر کر کئی شہروں کو تباہ کرتا ہوا اٹیلا اٹلی میں پہونچا مگر پوپ لیو کی منت و سماجت اور اس کے معزز عہدے سے خائف و مرعوب ہو کر وہ واپس چلا گیا اور ۴۵۳ء میں مر گیا۔

سلطنت روما کی حالت ایسی ابتر ہو گئی تھی کہ نہ کوئی فتح ہی نہ کسی مخالف کی موت ہی اسے وحشیوں کے پنجے سے بچا سکتی تھی اس زمانے میں رومی شہنشاہ والینٹینین تھا مگر اس کا اثر اس قدر کم تھا کہ اس کے خصائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایٹیس سے جس نے اٹیلا کو نیچا دکھایا اس کو حسد و بدگمانی تھی اور اس کے اغوا سے یہ زبردست جنرل قتل کر دیا گیا۔ اس کے قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر روما پر وحشیوں کا قبضہ ہو گیا۔ قوم وانڈال کا سردار جنسرک اس وقت قرطاجنہ میں تخت سلطنت پر متمکن تھا مگر اسے تاخت و تاراج کی ہوس اب بھی تھی اس کی بحری اور بری فوجیں نہایت زبردست تھیں ۴۵۵ء میں اس قوم کا ایک بیڑہ دریائے ٹائبر میں وارد ہوا اور ان کی فوج نے روما پر دھاوا کر دیا۔ شہر والوں کو تاب مقاومت بالکل نہ تھی۔ پوپ لیو کی منت و سماجت سے جنسرک قتل عام سے باز رہا مگر شہر کو اس نے خوب لوٹا اور روما کے خزانے قرطاجنہ پہونچ گئے۔

مگر روما کے لٹ جانے اور تباہ ہو جانے کے بعد بھی اکیس سال تک شہنشاہی کا نام اطالیہ میں قائم رہا اور راونیا کی دلدلوں میں کوئی نہ کوئی شخص برائے نام شہنشاہی پر فائز رہا ان شہنشاہوں کو کسی قسم کا اختیار نہ تھا اور سلطنت کی باگ وحشی النسل سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ ۴۷۵ء میں ایک سپہ سالار مسمی اورسٹیس نے اپنے بیٹے کو روموس آگسٹولس کے لقب سے شہنشاہ بنا دیا اور اس کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ مگر اصل قوت سپاہیوں کے ہاتھوں میں تھی جو تنخواہ کے کم ہو جانے سے ناراض ہوئے اوڈاکر کی سرکردگی میں انھوں نے علم بغاوت بلند کر کے اورسٹیس کو قتل کر دیا اور اس کے بیٹے کو تخت سے اتار دیا اب تخت و تاج اوڈاکر کے سامنے تھا اگر وہ چاہتا تو خود تخت پر بیٹھ جاتا یا کسی دوسرے کو اس عزت سے سرفراز کرتا مگر یہ دونوں طریقے اسے پسند نہ تھے اس نے تاج شاہی اور اس کے دیگر لوازمات کو شہنشاہ کے پاس قسطنطنیہ اس پیام کے ساتھ بھیجا کہ اطالیہ کو اب کسی شہنشاہ کی ضرورت نہیں اور اپنے لئے صرف ”پیٹریشین“ کے خطاب کا طالب ہوا شرقی شہنشاہ سے جو درخواست اس نے کی تھی اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ شہنشاہ کے اقتدار کو تسلیم کرتا تھا مگر اصل یہ ہے کہ اس کا اقتدار صرف برائے نام تھا

اور تمام اختیارات اوڈاکر ہی کے ہاتھ میں تھے۔

۴۷۶ء کے یہ واقعات گو خود اہم نہیں اور ہمعصروں کی نگاہ میں بھی ان کی زیادہ اہمیت نہ تھی مگر یہ سال مغرب میں سلطنت روما کے اختتام کا سال ہے جہاں اُسکا نشوونما ہوا تھا اور اس کو فروغ وعظمت حاصل ہوئی تھی لیکن واضح رہے کہ یہ سلطنت روما کا خاتمہ نہیں کیونکہ شاہان قسطنطنیہ اپنے آپکو شہنشاہ روما کہتے تھے اور وہاں شہنشاہی اس کے ایک ہزار سال بعد تک قائم رہی شہنشاہان قسطنطنیہ کو یہ حالت سخت ناگوار تھی۔ وانڈال اور وسی گاتھ قوموں اور اوڈاکر کو وہ غاصب خیال کرتے تھے اور بہت جلد انھوں نے مغربی سلطنت پر دوبارہ قبضہ کرنیکی زبردست کوشش کی جس میں انکو نہایت شاندار مگر عارضی کامیابی ہوئی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قومیت۔ زبان اور خصائل کے اختلاف کی وجہ سے اقوام غرب سے شہنشاہان قسطنطنیہ کو وفاشعاری کی امید نہ ہوسکتی تھی اور مغربی یورپ کا مستقبل وحشی اقوام سے وابستہ تھا جنھیں متمدن وشائستہ ہوجانے کے بعد اب وحشی کہنا بجا نہ ہوگا۔

باب سوم

اطالیہ چھٹی صدی عیسوی میں

اوڈاکر کے فتوحات سے اطالیہ بالکل اس کے قبضے میں آگیا۔ مگر اسے بھی چین نصیب نہ ہوا کیونکہ وحشیوں کی دوسری جماعت اس کی بیخ کنی کے لئے تیار ہوگئی۔ اس قوم کا نام اسٹروگاتھ (مشرقی گاتھ) جو قوم وسی گاتھ (مغربی گاتھ) مذکورہ سابق کی ہم نسل تھی۔ قوم ہن نے جبراً ان کو اپنی فوجوں میں شریک کرلیا تھا اٹیلا کی فتح و شکست دونوں میں یہ شریک تھے اور اس وقت دریائے ایڈریاٹک کے مشرقی ساحلوں پر آباد تھے۔ اِن کا سرگروہ تھیوڈورک تھا جس نے قسطنطنیہ کے دس سالہ قیام میں سلطنت روما کے مذہب و تمدن، طریقہ حکمرانی اور اس کی خرابیوں سے پوری واقفیت حاصل کرلی تھی اور اسی کے عادات و خصائل پر وہاں کے قیام کا گہرا اثر پڑا تھا چنانچہ ۴۸۹ء میں شہنشاہ زی نو (Zeno) کے اصرار سے اس نے اطالیہ پر شمالی مشرقی دروں کی طرف سے حملہ کردیا اور مدت دراز کی جنگ و جدل کے بعد اس کو کامیابی ہوئی۔ اوڈاکر کو تین جگہ شکست ہوئی جس کی وجہ سے وہ روانیا آکر قلعہ گزین ہوگیا مگر آخر کار قحط کی وجہ سے ہتھیار ڈال دینا پڑا فاتحین نے اسے بدعہدی سے قتل کردیا اور تمام اطالیہ تھیوڈورک کے قبضے میں آگیا۔

تھیوڈورک نے اطالیہ میں ۴۸۹ء سے ۵۲۶ء تک حکومت کی اور اس کے دور حکومت کے بعض واقعات دلچسپ اور قابل تذکرہ ہیں کیونکہ دوسری صدی سے آٹھویں صدی تک عالم رومی میں زوال اور انحطاط کے سوا سنبھلنے کے آثار کہیں نمایاں نہیں مگر تھیوڈورک کی حکومت ان عیوب سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس نے رومی سلطنت کے آثار پر ایک دیرپا حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی اپنا دارالسلطنت

راونیا کو قرار دیا اور اس کے کلیساؤں اور دیگر عمارتوں میں شاندار اضافہ کیا۔ ان عمارتوں کی تعمیر اور سیاسی معاملات میں اس نے رومی النسل لوگوں کو اپنا مشیر بنایا۔ اس کا وزیر اعظم کیسوڈورس (Cassiodorus) رومی تھا اور اس کا میر منشی (چیف سکرٹری) بوتھیس تھا جس پر لاطینی ادبیات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس نے درباری رسوم اور طریقۂ حکومت اختیار کیا جو مشرقی سلطنت میں رائج تھا۔ اس کا قصد تھا کہ رومیوں کے تمدن اور گاتھوں کی قوت کو یک جا کردے اور اگر اتفاقی حوادث اس کے سدراہ نہ ہوتے تو اس کی قائم کردہ سلطنت دیرپا ثابت ہوتی۔

مذہبی معاملات میں بھی خاص کر اس کا طرز عمل قابل توجہ ہے (His dealings with religionare cespacially note worthy) وہ بذات خود ایرین تھا اور چونکہ یہ مذہب اس کو اور اس کی قوم کو مرغوب طبع تھا۔ اس لئے اس نے کبھی اسے چھوڑنے کا خیال نہ کیا مگر قدیم کلیسیہ کے ساتھ اس نے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کے پیروؤں کو کبھی پریشان نہ کیا۔ استفان مسیحی سے اس سے روابط تھے اور پوپ کو بھی وہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا مذہبی رواداری کی ایسی مثال آیندہ ایک ہزار سال تک نہ ملیگی مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ طرز عمل کامیاب نہ ہوسکا چونکہ یہ تھیوڈورک کلیسیا بلاشرکت غیرے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ اور اطالیہ میں ایک علیحدہ ایرین کلیسا کا وجود اسے ناگوار تھا کیتھولک کلیسا کے پیرو اس سے علیحدہ اور اس کے مخالف رہے۔ اور اس طرح مذہبی عنصر جو قرون وسطی میں (And thus) اکثر اتحاد کا نہایت زبردست ذریعہ تھا نا اتفاقی کا باعث ہو گیا تھیوڈورک کا ایرین ہونا۔ اس کے منصوبوں کے خاک میں ملجانے کا ایک خاص سبب تھا۔

قوم آسٹروگاتھ نے دیہات پر قبضہ کرلیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ملک اطالیہ کا ایک ثلث ان کی آبادی کے لئے دیدیا گیا تھا اور اطالیہ کے قدیم باشندے شہروں میں رہتے تھے۔ تھیوڈورک کے عہد سلطنت کے آخر تک اطالیہ میں پورا امن وامان تھا اور اس کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ ہونے لگا یہاں تک کہ پوپ کو بھی مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ اطالیہ کو آخر کار جنگ وجدال کی بے اطمینانی کے بعد دم لینے کا موقع ملا ہے۔ لوگوں کو امید ہو چلی تھی کہ مسلسل محاربوں اور بیرونی حملوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ تھیوڈرک نہایت منصف مزاج تھا جس کی وجہ سے اسے کامیابی

ہوئی اور اطالیہ اور مغربی یورپ میں اس کا کوئی ہم پلہ بادشاہ نہ تھا۔ تمام نئی وحشی حکومتوں سے اس کا یارا نہ تھا اور سب پر اس کو فوقیت حاصل تھی۔

مگر افسوس ہے کہ آخری زمانے میں اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ قدیم رومی کلیسا والے اس سے متنفر تھے اور اس کے بڑھاپے میں اس کی جانشینی کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو گیا۔ اس کے صرف ایک لڑکی تھی جس کا شوہر مر گیا تھا اور اس کا وارث ایک پانچ سال کا بچہ تھا۔ تھیوڈورک کو عالم سراسیمگی میں یہ وہم ہو گیا کہ اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں جن سے وارفتہ ہو کر اس نے مظالم شروع کر دئے۔ اپنے میر منشی بے تھیس کو اس نے قتل کرا دیا اور جان پاپائے روما کو قید خانے میں اس شبہہ پر بھیج دیا کہ وہ قسطنطینیہ سے سازش کر رہا ہے چنانچہ جان قید ہی میں مر گیا اور اس عالم بے اطمینانی میں وہ خود بھی ۵۲۶ء میں انتقال کر گیا۔

تاریخ اطالیہ کے آئندہ باب کے سمجھنے کے لیے ہمیں قسطنطنیہ پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہیے جہاں انحطاط کے کوئی آثار (No sign) نمایاں نہ تھے سلطنت پھر اپنی اصلی قوت پر آ رہی تھی اور وحشیوں کی طرف سے کوئی خدشہ نہ تھا بادشاہ قسطنطنیہ کے تدریجی موقع سے نفع اٹھا رہا تھا۔ ایشیا کی صدیوں کی دولت فراواں کا وہ مالک تھا شام و مصر سے غلہ اور دوسرے قیمتی اشیاء دست یاب ہوتے تھے گو سلطنت کا مغربی حصہ شہنشاہ کے قبضے سے نکل چکا تھا مگر رقبہ کے کم ہو جانے سے در اصل اس کی قوت دوبالا ہو گئی تھی۔ شہنشاہ جسٹینین ۵۲۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۵۶۵ء تک برسر حکومت تھا شہنشاہی کی تاریخ میں اس کا نام زریں حروف میں لکھا ہوا ہے مگر یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے فتوحات سے سلطنت میں استحکام کے بجائے ضعف آ گیا۔ اس کی بیوی تھیوڈورا ایک زمانے میں کسی تھیٹر میں رقاصہ تھی مگر اس نے اپنے حسن اور دلفریبی سے بادشاہ کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور اس میں غضب کی فراست اور معاملہ فہمی بھی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ کو امور سلطنت کے انصرام میں مدد ملتی تھی۔ بیلے لی ساریس کا نام بھی جسٹینین کے نام کے ساتھ ہمیشہ یادگار زمانہ رہے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا سپاہی تھا گو یہ قول مبالغہ آمیز ہے مگر اس میں شک نہیں کہ چھوٹی چھوٹی

فوجوں کے بل پر اس نے شاندار فتوحات حاصل کیں جس سے اس نے رومیوں کی عظمت کو دوبارہ زندہ کر دیا اور اس کے پیشرووں کے کارنامے ماند پڑ گئے شہنشاہی فوجیں مختلف العناصر تھیں۔ نصف سے زیادہ اس میں وحشی تھے جنمیں سب سے ممتاز ایشیائے کوچک کی اسوری قوم تھی جو اپنی حربی قابلیت کی وجہ سے رومی افواج کی پشت پناہ ہو گئی تھی چھٹی صدی عیسوی کی فوجیں جولیس سیزر اور ٹریجن کے زمانے کی فوجوں سے مختلف تھیں۔ پیدل سپاہیوں کے بجائے جو چھوٹی چھوٹی تلواروں سے مسلح تھے اب تیر انداز سوار فوج میں زیادہ تھے اور اسی عجیب وغریب فوج سے بیلی ساریس نے اپنے فتوحات کیے۔ اسکی فوج کی تعداد بھی قلیل تھی مگر تعجب ہے کہ انھیں کے بدولت اس نے اپنے آقا کے مقبوضات میں اضافۂ کثیر کیا۔ فن حرب میں اس کو کمال حاصل تھا، اس کی فوجیں سرعت کے ساتھ نقل وحرکت کر سکتی تھیں اور جلد جلد دھاوا کر کے دشمن کی بڑی بڑی مگر بے ڈول فوجوں پر غالب آتی تھیں۔

قسطنطنیہ کے باشندے نہایت سرکش تھے اور ان سے جسٹینین کو اپنی حکومت کے ابتدائی زمانے میں پریشانی رہتی تھی اور سب سے پہلے بیلی ساریس نے انھیں لوگوں پر اپنا سکہ جمایا اور جب اس سے فراغت ہوئی اور بادشاہ کو اپنے جنرل اور اس کی فوج کی قوت کا احساس ہو گیا تو اس نے اپنے گم گشتہ مغربی مقبوضات کو دوبارہ فتح کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ سنہ ۵۳۳ء میں بیلی ساریس سواحل افریقہ پر وارد ہوا۔ قوم ونڈال جو یہاں حکمراں تھی اور جس نے اپنے مشہور قائد جنسرک کے زیر کمان سلطنت روما کو تہ وبالا کر دیا تھا اب عیاشی بد نظمی اور فنون سپہ گری سے عاری ہو جانے کے باعث بالکل بے حس ہو گئی تھی غنیم کے مقابلے کی تاب نہ لا سکی دو لڑائیوں میں اس زرخیز صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور وہ پھر شہنشاہی کا ایک جزو بن گیا۔ افریقہ سے صرف ۷۵۰۰ سپاہی لیکر اس بہادر جنرل نے سسلی پر قبضہ کر لیا اور سنہ ۵۳۶ء میں جنوبی اطالیہ میں وارد ہوا۔

اسٹروگاتھ قوم میں بھی ونڈال قوم کی طرح وہ دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ مگر پھر بھی ان کی حالت اس درجہ ابتر نہ تھی۔ اور سنبھلنے کی صلاحیت ان میں اب بھی

موجود تھی۔ ان کے انحطاط کے اسباب کا معلوم کرنا دشوار ہے۔ رومیوں اور کلیسہ کی منافرت کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور اس کے علاوہ فتحیابی کے سبب سے ان کے اتحاد اور قوت میں فرق آ گیا تھا۔ رومی جنرل یکے بعد دیگرے فتوحات حاصل کرتا رہا۔ آسٹروگاتھ کے قائد مدافعت بالکل نہ کر سکے اور نیپلس اور روما دونوں شہر ان کے قبضے سے نکل گئے۔ ان کی فوج ڈیڑھ لاکھ تھی اور بیلیساریس کے ساتھ صرف پانچ ہزار آدمی تھے مگر پھر بھی روما پر وہ دوبارہ قبضہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کی فوج میں بغاوت پھیل گئی اور رسد معدوم ہو گئی جس کے باعث ان کے دار السلطنت راونیا پر بھی بیلی ساریس کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے وہ قسطنطنیہ واپس ہوا جہاں اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ شہنشاہ کی فوج کو جو مسلسل کامیابی ہوئی اس کی وجہ سے تمام یورپ میں اس کا سکہ جم گیا۔ افریقہ اور اطالیہ کے علاوہ اس کی فوج ظفر موج نے ۵۵۴ء میں ہسپانیہ کے جنوبی حصے پر بھی قبضہ کر لیا۔

مگر ان فتوحات کے بعد سے قسمت نے جسٹی نین اور اس کے جنرل کا ساتھ چھوڑ دیا اور سلطنت روما کے استقلال اور استحکام کی جو امید اس کے ابتدائی کارناموں سے پیدا ہوئی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور سخت مالی مشکلات پیدا ہو گئے۔ بادشاہ کو عمارات کا نہایت شوق تھا اور کلیسہ سینٹ صوفیا واقع قسطنطنیہ (مسجد ایا صوفیہ) اور دوسرے مقامات کے گرجے اس کے حسن تعمیر کی اب تک داد دیتے ہیں مگر کثرت تعمیر میں خزانۂ شاہی خالی ہو گیا۔ ایرانیوں کے ساتھ بھی سلسلۂ رزم و پیکار شروع ہو گیا تھا اور گو آخر میں شہنشاہی فوجیں ظفریاب ہوئیں مگر ایرانی سخت جنگ و جدال کے بعد پسپا ہوئے۔ جسٹی نین کے آخری زمانے کی ناکامیابی کا راز اطالیہ کی حالت میں مضمر ہے۔ اطالیوں کو آسٹروگاتھ قوم سے نفرت تھی اور چونکہ شہنشاہ قسطنطنیہ کم از کم برائے نام رومی تھا اس لئے اس کی حکومت پسند کی گئی مگر جنگ سے تمام ملک میں قحط رونما ہو گیا اور مصیبت کو دوبالا کرنے کے لئے طاعون بھی پھیل گیا۔ تھیوڈورک کے زمانے میں اطالیہ میں پھر مرفہ الحالی ہونے لگی تھی مگر اب پھر خانہ ویرانی ہو گئی اور محصولات سرکاری کا

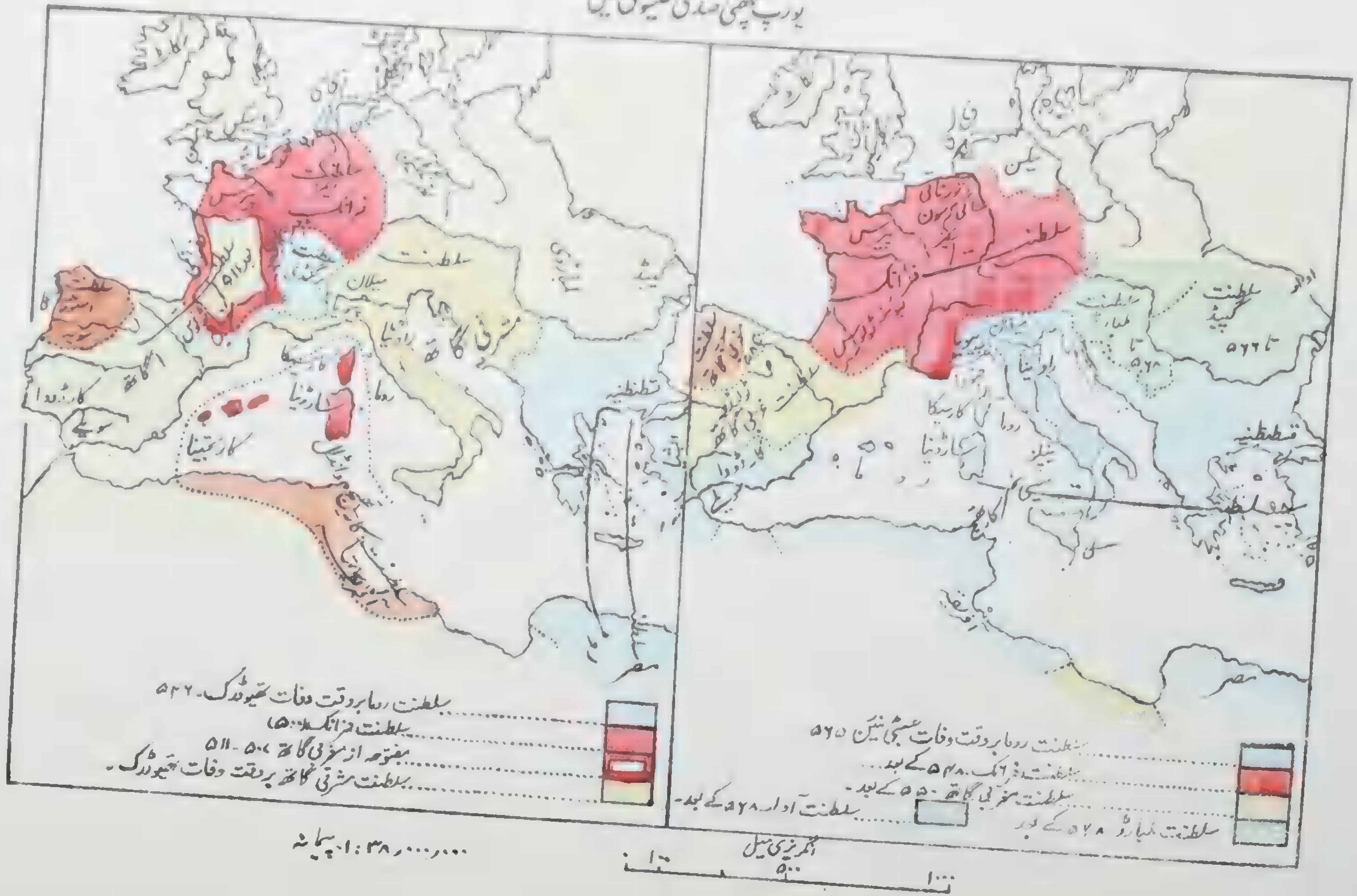
بوجھ بھی اتنا تھا کہ اطالوی اس سے پریشان ہو گئے اور گاتھیوں کی حکومت کو غنیمت سمجھنے لگے۔ اس قوم میں بھی ایک نیا سردار پیدا ہو گیا جس کا نام ٹائیلا تھا اور جس کا شمار اس قوم کے اکابر میں ہوتا ہے۔ ٹائیلا ایک جری اور نبرد آزما سپاہی تھا اور نہایت پکا عیسائی منصف مزاج اور رحمدل تھا۔ اس کے زیر کمان گاتھی فوجیں تمام اطالیہ میں پھیل گئیں اس کے مقابلے کے لئے بلے سارئیس پھر بھیجا گیا مگر اس کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ گاتھیوں کا مقابلہ کر سکے۔ روما پر اس نے دوبارہ قبضہ کر لیا مگر اس کی کامیابی چند روزہ تھی شہنشاہ اس سے ناخوش ہو گیا تھا اس لئے وہ واپس بلا لیا گیا اور روما پر پھر ٹائیلا کا قبضہ ہو گیا۔ تمام ملک اطالیہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ البتہ راوینا فصیلوں اور دلدلوں کے سبب سے محفوظ تھا۔ مگر شہنشاہ کی قوت ابھی اتنی ضعیف نہیں ہوئی تھی کہ وہ اطالیہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر صبر کرتا اس نے ایک زبردست فوج اپنے ایک سن رسیدہ خانگی ملازم نارسیس کے زیر کمان بھیجی جو براہ خشکی اطالیہ پہنچی اور راوینا پہنچ کر اس نے روما کا رخ کیا اور بمقام ٹاگنی اس سے اور ٹائیلا سے مقابلہ ہوا۔ گاتھیوں کو شکست ہوئی اور ٹائیلا اپنے زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ جنگ کا سلسلہ اس کے بعد بھی قائم رہا مگر گاتھیوں کے قدم اکھڑ گئے تھے چنانچہ ۵۵۳ء میں انھوں نے اطالیہ سے چلے جانے کی اجازت چاہی اس کی اجازت ان کو دی گئی اور کوہ الپس کو طے کرتے ہوئے اطالیہ سے نکل گئے اور قوم وسی گاتھ میں شامل ہو کر صفحۂ تاریخ سے ناپید ہو گئے۔ جسٹی نین کی سلطنت کا خاتمہ کامیابی کے ساتھ ہوا۔ ملکہ تھیوڈورا نے ۵۴۸ء میں انتقال کیا اور ۵۶۵ء جسٹی نین اور بلے سی لاریس دونوں مر گئے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جسٹی نین کے فتوحات سے ممکن ہے کہ سلطنت بجائے مستحکم ہونے کے ضعیف ہو گئی ہو اور اس لحاظ سے عظمت شہنشاہی کو برقرار رکھنے کے بجائے اس کی بربادی کا باعث ہوا ہو۔ مگر اس کا ایک کارنامہ ایسا ہے جس کے سبب سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا یعنی اس کے حین حیات میں اور زیادہ تر اسی کی زیر ہدایت ترتیب و تدوین قوانین رومی کا کام ختم ہوا جو کئی صدی



بربریوں کے حملے

یورپ چھٹی صدی عیسوی میں



قبل شروع ہوا تھا اور بڑے لائق رومی مقنن اس کام میں برابر لگے ہوئے تھے یہ عظیم الشان کام اب ختم ہو گیا اور اس طرح تمام قوانین روما نہایت اعلیٰ ترتیب و اختصار کے ساتھ تمام دنیا میں شائع کئے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ قانون روما کا اثر یورپ میں قرون وسطےٰ میں نہایت گہرا تھا۔ اقوام مغرب کچھ زمانے کے بعد اس گراں بہا خزانے سے واقف ہوئے مگر جب ان کو اس کا علم ہوا تو اس کی اہمیت، معقولیت، انصاف پسندی اور انسانیت ان کے دل پر نقش ہو گئی اور اس کو یہ قومیں ایک مصحف آسمانی خیال کرنے لگیں۔

خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا۔ نارسیس کی فتوحات سے نہ ملک میں امن و امان قائم ہوا اور نہ اس کی مرفہ الحالی نے عود کیا۔ محصولات کی بھرمار ہو گئی۔ اور جب شہنشاہی فوجیں واپس گئیں تو ملک کا حفاظت کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ جس کے باعث وحشیوں کو پھر یورش کرنے کا جلد موقع مل گیا۔ نارسیس کی فوج میں ایک جرمن قوم تھی جس کا نام لمبارڈ تھا۔ اس کی ابتدائی تاریخ اور سرگردانیوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اطالیہ کی زرخیز زمینوں کو وہ دیکھ ہی چکے تھے اس وقت وہ چلے گئے مگر پندرہ سال کے بعد ان کا ایک جم غفیر اطالیہ پہنچ گیا مشرق سے کوئی مدد کرنیوالا نہ تھا اور رفتہ رفتہ قوم لمبارڈ کا اطالیہ کے بیشتر حصہ پر قبضہ ہو گیا اور انکا کوئی حریف باقی نہ تھا اس قوم کی دوسری اقوام کی طرح ایک حکومت نہ تھی۔ بادشاہ ان میں ایک برائے نام تھا اور اس کا اثر بہت کم تھا اس لئے ان کے جتھے اطالیہ میں بلا کسی ترتیب سے پھیل گئے شہنشاہان قسطنطنیہ کے قبضے میں چند مستحکم مقامات رہ گئے تھے اور راونیا بھی انکے قبضے میں ۷۲۲ء تک باقی رہا تھا جس سے راونیا اور روما کے درمیان سلسلۂ رسل و رسائل قائم تھا۔ اس کے علاوہ جزائر سسلی، سارڈینیا اور کارسیکا پر بھی انہیں کا قبضہ تھا اور جنوبی اطالیہ میں بھی چند ان کے قلعے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی بحری قوت کا کوئی مد مقابل نہ تھا اور ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان تمام مقامات کے علاوہ تمام ملک پر قوم لمبارڈ کا قبضہ تھا۔ ان کا بادشاہ پے ویا شمالی اطالیہ میں رہتا تھا مگر جنوبی اطالیہ میں جو لمبارڈ رئیس تھے انکی کچھ پروا نہ کرتے تھے لمبارڈ جب اطالیہ میں وارد ہوئے بت پرست تھے مگر رفتہ رفتہ مسیحی ہو گئے اور گو ابتداً یہ لوگ ایرین تھے مگر کچھ روز کے بعد کاتھولک

ہو گئے اور اس وجہ سے اس قوم کو بہت فروغ ہوا۔ ان کے خصائل ویگاتھ اور آسٹروگاتھ اقوام کے مقابلے میں پسندیدہ نہ تھے اور اطالیہ کے باشندے ان سے نفرت کرتے تھے۔ مگر گاتھیوں اور اطالیوں کے درمیان جو مذہبی تنفر تھا وہ لمبارڈ کے ساتھ نہ تھا اور اسی وجہ سے دونوں قومیں دائرۂ مذہب کے تحت میں آکر شیر و شکر ہو گئیں۔ گاتھیوں کا نام اطالیہ سے بالکل غائب ہو گیا ہے مگر اطالیہ کا شمالی میدان ابتک لمبارڈ قوم کے نام کی رعایت سے لمبارڈی کہا جاتا ہے اور جزیرہ نما کی آبادی اور تمدن میں ابتک اُن کا عنصر باقی ہے۔

باب چہارم

قرونِ وسطیٰ کی تعمیری قوتیں۔ پاپائیت، اسلام، فرنگ

گاتھ قوم کے اولوالعزم بادشاہوں نے جس نظام سلطنت کے قیام میں اپنی کوششیں صرف کردی تھیں وہ ناپائدار ثابت ہوا اور چند روز کے بعد مٹ گیا اسیطرح شہنشاہان مشرق نے اطالیہ اور سرزمین مغرب میں اپنا اثر دوبارہ قائم کرنے کے لئے جو سعی بلیغ کی وہ بھی ناکام ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تمدن برباد ہو رہا تھا اور بظاہر اس کرم خوردہ تمدن پر کسی جدید عمارت کی تعمیر کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے مگر تاریخ عالم میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے جس میں ناکامی اور انحطاط کے علاوہ ترقی کی کوئی جھلک نہ ہو اور اگر چھٹی اور ساتویں صدیوں کی تاریخ پر نظر غائر ڈالی جائے تو ایسی قوتیں نمودار ہونگی جن کے باہمی تصادم سے وہ نتائج پیدا ہوئے جن کا قرونِ وسطیٰ کے ممتاز خصوصیات میں شمار ہے۔

قرون وسطےٰ کی ممتاز تر یہ ہے کہ مذہب اور ہا و یانِ مذہب کا اثر عوام میں بیحد بڑھ رہا تھا اس لئے اس موضوع پر ہم سب سے پہلے بحث کرینگے مسیحی کلیسا ابتدائے قیام سے برابر اپنا اثر بڑھاتا جاتا تھا مگر چھٹی صدی میں اسکا نظام اور بھی مضبوط اور استوار ہو گیا اور اس کی قوت پر نگاہیں پڑنے لگیں اس قسم کا اقتدار حاصل کرنے میں اسے "رہبانیت" اور "پاپائیت" دو طریقوں سے بہت مدد ملی۔

رہبانیت دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں کیونکہ عیسائیت کے وجود سے پیشتر بھی یہ رواج تھا کہ اکثر عورتیں اور مرد دنیا سے دست کش ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔ ہندوستان میں سادھوؤں اور تپسیا کرنے والوں کے

متعدد گروہ تھے، روما میں ویسٹل کنواریوں کا طبقہ تھا جو ابعد کے زمانے میں
خانقاہوں کے مشابہ تھا۔ مسیحیت کی اشاعت کے بعد سلطنت کے مشرق میں
رہبانیت کا زور ہوا، زہاد اور عباد کی تعداد کثیر مصر کے صحراؤں میں گوشہ نشین ہوگئی
اور خود اطالیہ میں بہت سے لوگ مذہبی غلو کے باعث تارک الدنیا ہو کر خانقاہوں
میں رہنے لگے۔ مگر ان کے یہ افعال ذاتی تھے اور چونکہ کوئی منضبط نظام نہیں تھا
اس لئے افراط و تفریط ہو گئی۔ اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئیں اور بعض راہب تو پورے پورے
ڈاکو بن گئے۔ سینٹ بی نی ڈکٹ (۴۸۰-۵۴۳ء) نے میں رہبانیت کے لئے قوانین
منضبط کر کے ایسی شکل میں دے دیا جس سے تاریخ یورپ پر اس کا بیحد اثر پڑا ہے۔
مگر واضح رہے کہ سینٹ بی نی ڈکٹ راہبوں کے کسی خاص گروہ کا بانی نہ تھا بلکہ
خانقاہوں کا نظام اس نے درست کیا تھا اور قانون بنائے تھے اور جن خانقاہوں کا
وہ خود نگران تھا ان میں ایسے اصلاحات عمل میں لایا تھا کہ رہبانیت کا رنگ ہی بدل
گیا تھا۔ ان خانقاہوں میں جو لوگ داخل ہوتے تھے ان کو عہد کرنا پڑتا تھا کہ وہ
عمر بھر نکاح نہ کریں گے اور اپنے مرشد کی پوری تابعداری کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کو
اپنی تمام عمر خانقاہ اور کلیسیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دینا پڑتی تھی یہ لوگ
زراعت بھی کرتے تھے جس وجہ سے تعلیم اور زراعت ان کے قبضے میں آگئی تھی۔
سینٹ بی نی ڈکٹ راہبوں کے لئے تنہائی ضروری خیال نہ کرتا تھا بلکہ ناپسند
کرتا تھا اور اس کے مرید ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے تھے اور
ان کا کوئی فعل انفرادی حیثیت سے نہ ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ ایک جماعت کے طور پر۔
یہ بھی واضح رہے کہ ہر ایک خانقاہ اپنے معاملات کا انتظام کسی بیرونی مداخلت کے
بغیر خود کرتی تھی اور پاپائے روما کے سوا کسی بشپ کا اس پر کوئی اثر نہ تھا
سینٹ بی نی ڈکٹ کے مریدوں میں ہر طبقے کے لوگ تھے، رومی اور وحشی
احرار اور غلام اس کے نزدیک سب برابر تھے۔

خانقاہوں کا تمدنی اثر نہایت اہم تھا گو اس کا تجزیہ دشوار ہے۔ صنعت و حرفت
اور زراعت کو فروغ دینے میں ان کے خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے
زنانہ خانقاہوں کے قیام سے جن کا تمام انتظام عورتوں سے متعلق تھا فرقہ اناث کا

وقار بہت بڑھ گیا تھا اور علوم و فنون کی شمعیں بھی انھیں خانقاہوں میں جلتی رہیں حالانکہ اس وقت تمام یورپ پہ جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی؛ مگر خانقاہوں نے سب سے زیادہ خدمت پاپائے روما کی کی جسنے اور اس کا اقتدار قائم رکھا ہے آس پاس کے بشپوں اور حکام خانقاہ سے اکثر مخالفت رہتی تھی مگر پوپ کی فرمانبرداری کی تعلیم ہمیشہ خانقاہوں میں ہوتی تھی۔ پاپائے روما کا اقتدار جب کبھی بڑھا ہے خانقاہوں کے نظام میں کچھ نہ کچھ تغیر ضرور ہوا ہے، یوں سمجھنا چاہیے کہ پوپ کے لیے ہر خانقاہ ایک قلعہ تھی۔

سینٹ بی نی ڈکٹ نے جب یہ کام ختم کر لیا اور اس کا انتقال ہو گیا اس کے کچھ ہی روز بعد روما کی مسند پاپائی پر گریگوری اعظم (سنہ ۵۹۰ تا ۶۰۴ء) میں متمکن ہوا اس کے وجود سے نظام کلیسیہ کو نہایت تقویت پہنچی اور کلیسیہ روما کی قوت تمام مسیحی ممالک میں مسلم ہو گئی اسی پوپ نے انگلستان کو مبلغ بھیجے جن کے مساعی سے اس جزیرے کے جنوبی حصے میں مسیحیت کو پھر فروغ ہوا گو اس کے شمالی اور مغربی حصوں میں اب بھی اس مذہب کے آثار باقی تھے اور اسی کی کوشش سے قوم لمبارڈ کلیسیہ روما میں آہستہ آہستہ داخل ہوئی۔ اس قوم کا بادشاہ نہایت بیدار مغز اولوالعزم تھا اور اکثر پوپ سے سیاسی اور ملکی معاملات میں برسرِ پرخاش رہا کرتا تھا مگر اس کی بیوی نہایت راسخ الاعتقاد کاتھولک تھی اور اس کے اثر سے بادشاہ آگیلوف اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ اس کے بڑے بیٹے کو کلیسیہ رومی میں اصطباغ دیا جائے اور اس طرح تمام قوم لمبارڈ کلیسیہ رومی کی پیرو ہو گئی۔

پوپ کی قوت اسباب ذیل سے بہت بڑھتی جاتی تھی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ پوپ کا اقتدار اٹلی میں دیگر حکام سے زیادہ تھا۔ شہنشاہ جسٹی نین نے عدالتی اور ملکی معاملات میں اس کو بہت کچھ اقتدار دیدیا تھا۔ اطالیہ میں مختلف حکام کے باہمی نزاعات سے ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ مشرقی شہنشاہی کا ایک نائب راوینا میں رہا کرتا تھا مگر اس سے لمبارڈ بادشاہ اور ڈیوکوں سے کشمکش ان بن رہتی تھی۔

قوم فرنیک نے شمالی اضلاع پر قبضہ کر لیا تھا۔ شمال مشرق میں ایک جدید تورانی قوم آوار نامی، جو قوم ہن کی ہم نسل تھی یلغار کر رہی تھی۔ شہنشاہان مشرق کی قوت رو بہ انحطاط تھی اور لمبارڈی رؤساء ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ اس عالم ابتری میں پوپ کے سوا رعایا کا ملجا و ماوا اور کون ہو سکتا تھا۔ کلیسہ کی دولت اور قوت انضباط ضعف ہو رہی تھی۔ اور مقبوضات بڑھ رہے تھے جن کے انتظام میں پوپ کا زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ پوپ گرگوری نے کلیسے کے رسوم عبادات اور موسیقی میں بہت کچھ اصلاح کی جس سے غیر مسیحیوں پر اس کا زیادہ اثر پڑنے لگا پوپ گریگوری علاوہ ان کارہائے نمایاں کے بذات خود نہایت برگزیدہ آدمی تھا اور مرنے کے بعد اس کا شمار مسیحیوں کے اولیاء اللہ میں ہونے لگا جو اصلاحیں کہ اس نے کلیسہ کے انتظام میں کیں ان کا اثر ابتک باقی ہے۔

سرزمین یورپ میں جب ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، علوم وفنون کی کساد بازاری تھی، مذہبی نزاعوں سے خلقت پریشان اور مبتلائے توہمات تھی، وحدانیت کا آفتاب ریگستان عرب میں طلوع ہوا اور اس کی درخشاں شعاعوں سے تمام عالم دیکھتے ہی دیکھتے منور ہو گیا۔ حضرت محمد صلعم گریگوری اعظم کے ہمعصر تھے مگر قبل اس کے کہ حضرت آوازۂ تعلیم و تلقین بلند فرمائیں، اس کا انتقال ہو گیا اور اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ دنیا میں کیسی زبردست قوت پیدا ہوئی ہے۔ اسلام کی اشاعت جس سرعت کے ساتھ ہوئی اور اس کے تابعین کو دیگر اقوام کے مقابلے میں جو حیرتناک کامیابی ہوئی وہ غیر اقوام کے مورخوں کو ششدر کر دیتی ہے کیونکہ یہ فتوحات امداد غیبی سے ایسے دشمنوں پر حاصل ہوئے تھے جو طاقتور تھے اور مقابلے کے لئے ہر طرح تیار تھے۔ سنہ ۶۱۰ء میں شہنشاہ ہرقل قسطنطنیہ میں تخت نشین ہوا اور اپنے کارناموں سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ بھی شاہان روما کا ایک لائق جانشین ہے۔ ایرانیوں نے فلسطین اور شام پر حملہ کر دیا تھا مگر نہایت مستعدی کے ساتھ اس نے ان کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا بلکہ خود نینوا تک ان کا تعاقب کیا اور شاہ ایران کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا مگر ان شاندار فتوحات کے چند ہی روز بعد جب شہنشاہی فوجیں مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں تو نہ تو ان کا

وہ دم خم باقی تھا نہ اثر۔

مذہب اسلام کی نشو ونما عرب کی گمنام سرزمین میں ہوئی جس کو رومیوں نے کبھی اس لائق نہ خیال کیا تھا کہ شمال کے چھوٹے سے ٹکڑے کے سوا اس کے کسی اور حصّے پر قبضہ کریں۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش تھے اور متمدن قومیں ان سے بہت کم واقف تھیں مگر اسی خطّے میں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ اہل عرب پر اس زمانے کی مذہبی تحریکوں کا اثر ضرور رہا تھا۔ ان میں یہودی بھی تھے مسیحی بھی تھے مگر بیشتر افراد توہمات میں مبتلا تھے۔ خود مکۂ معظمہ میں بت پرستی کا رواج تھا اور اسی مقام پر حضرت محمد رسول اللہ صلعم ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور وحدت الٰہی اور اخوت انسانی کی تلقین فرما کر اہل عرب میں وہ روح اور ایسا جذبۂ غیرت اور ہمت پھونک دیا جس سے اس قوم نے چند سال میں نظام عالم زیر و زبر کر دیا اور ایک صدی تک دنیا میں کوئی قوت ایسی نہ تھی جو اس کا مقابلہ کر سکتی۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد خلفائے راشدینؓ نے تبلیغ اسلام کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت عمرؓ نے شام پر فوج کشی کی جس میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہرقل کے عہد حکومت میں سلطنت روم کی حالت بہت اچھی تھی مگر مذہبی نزاعوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ مذہبی مباحث کا بہ نسبت مغرب کے مشرق میں بہت زور تھا۔ مشرقی مسیحیوں میں وحدانیت الٰہی کا عقیدہ عموماً پھیلا ہوا تھا اور الوہیت مسیح سے بھی انھیں انکار تھا۔ مگر پاپائے روما ان عقائد کا سخت مخالف تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان عقائد کے پیرووں نے اسلام کی خالص وحدانیت کو کلیسیائے روما کے پیچیدہ عقائد پر ترجیح دی۔ ۶۳۴ء میں شہنشاہ ہرقل کی جان گسل کوششوں کے باوجود صوبۂ شام مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور ۶۳۷ء میں انھوں نے بیت المقدس بھی لے لیا اور سلطنت ایران کو بھی پسپا کر دیا۔ نیز ۶۴۰ء میں مسلمانوں نے مصر بھی فتح کر لیا۔ ہرقل نے سال بھر بعد میں انتقال کیا اور اس نے اپنی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھ لیا کہ اس کے ابتدائی فتوحات کے نتائج کو اس نئی اور پر اسرار قوت نے کیونکر پراگندہ کر دیا۔ فتح مصر کے بعد نصف صدی تک مسلمانوں کے فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا مگر غالباً اس کا یہ سبب تھا کہ مصر کے مغرب میں لق و دق ریگستان واقع ہے۔ اس کے بعد

پھر یہ سلسلہ شروع ہوا اور سنہ ۶۹۵ء میں مسلمانوں نے (قرطاجنہ) لے لیا اور شہنشاہی فوجیں مقابلہ نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کی فوج ظفر موج برابر مغرب کی طرف بڑھتی گئی اور ان کا مشہور قاید طارق، اس تنگ آبنائے کو عبور کر کے جو یورپ و افریقہ کے درمیان حائل ہے اس مقام پر لنگر انداز ہوا جو اس کے نام کی مناسبت سے اب جبل الطارق کہلایا جاتا ہے۔ دو سال کے قلیل زمانے میں عساکر اسلامی نے تمام جزیرہ نمائے ہسپانیہ پر اپنا دخل کر لیا اور پیرینیز کے سلسلۂ کوہ تک پہونچکر اس کو طے کرنے کی فکر کرنے لگے۔ اب سوال یہ تھا کہ ممالک مشرق اور جنوب کی طرح وسطی اور شمالی یورپ کے باشندے بھی بادیہ نشینان عرب کے آگے سر تسلیم خم کرینگے یا کوئی نئی قوت ایسی پیدا ہو گی جو ان کی پیش قدمی میں حائل ہو گی۔ یہ کام فرینک قوم نے انجام دیا جو قرون وسطیٰ کی تیسری تعمیری قوت ہے۔

فرینک ایک جرمنی قوم تھی جس کی ہستی سے رومی تیسری صدی تک واقف نہ تھے اور اس کی ابتدا غالباً یہ تھی کہ مختلف قبائل نے متحد ہو کر "فرینک" کا نام اختیار کر لیا۔ ان کی ابتدائی تاریخ اور یورشوں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان کی اصلی تاریخ شاہ کلوڈوس (۴۸۱ء) کی تخت نشینی سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے میں یہ قوم دو [illegible] دریائے رائن کے نشیبی علاقہ پر آباد تھی۔ ان میں سے جو سمندر کے کنارے پر آباد تھے وہ سیلین کے نام سے مشہور تھے اور جو دریائے رائن کے کنارے شہر کولون کے قریب رہتے تھے رپوائرین کہے جاتے تھے۔ غالیہ (فرانس) میں اس زمانے میں متعدد ریاستیں قائم تھیں۔ دریائے سین کی وادی میں اس کے دونوں کناروں پر ایک رومی [illegible] حکمران تھا اور اب فرانس میں صرف یہی ایک خطہ تھا جہاں رومیوں کا نام قائم تھا۔ دریائے لوار کے جنوب میں قوم وسی گاتھ کی سلطنت تھی اور دریائے رون کی وادی اور مشرقی اضلاع پر برگنڈی والوں کی حکومت تھی اور اس کے شمالی اضلاع پر قوم المانی قابض تھی۔ مگر شاہ کلوڈوس نے اپنے انتقال سے قبل تمام اضلاع مذکور پر قبضہ کر لیا اس کے فتوحات کا تفصیلی تذکرہ نہایت طویل ہو گا مگر قوم المانی کی جنگ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے کلوڈوس کی بیوی جو ایک برگنڈی کی شہزادی تھی مذہباً عیسائی تھی اور بیوی کی ترغیب سے

غالباً کلودس نے منت مانی کہ اگر اس کو اس جنگ میں فتح ہو جائے تو وہ عیسائی ہو جائے گا۔ جنگ میں اسے فتح ہوئی اور وہ اپنے وعدے پر قائم رہا چنانچہ سنہ ۴۹۶ء میں وہ کلیسیہ مسیحی میں داخل ہو گیا اس کی رعایا یعنی قوم فرینک نے بھی اس کی تقلید کی یہ واقعہ نہایت اہم تھا۔ گو مسیحی ہو جانے سے اس کے طرز زندگی میں کوئی فرق نہ آیا کیونکہ اس کا نامۂ اعمال جرائم اور معاصی سے مملو تھا مگر اس کے مسیحی ہو جانے کی اہمیت یہ ہے کہ کیتھولک کلیسا کے زبردست نظام سے اس کے خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ گاتھی اقوام ایرین تھیں اور یہی ان نکبت و بربادی کا باعث ہوا مگر کلودس کے کلیسیا کاتھولک میں داخل ہو جانے سے اس کو کلیسیا سے زبردست امداد ملی جس کی وجہ سے وہ خود اور اس کے جانشین اپنے منصوبوں میں کامیاب ہوتے رہے۔

سنہ ۵۱۱ء میں کلودس نے پیرس کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا مگر یہ ساعت کچھ ایسی نحس تھی کہ اسی سال اس کا انتقال ہو گیا اور قوم فرینک میں زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ قریب ایک سو سال تک خانہ جنگی اور حد درجہ کی ابتری رہی گبن کے بقول ،،تاریخ عالم میں کوئی عہد ایسا کم ملیگا جس میں معاصی کا زور اس سے زیادہ،، اور محاسن اس سے کم ہو گئے،، کلودس کی اولاد جو خاندان میروونجین کے نام سے مشہور ہوئی ان میں اس کی قابلیت کا شمہ بھی نہ تھا اور رفتہ رفتہ ان کا اقتدار برائے نام رہ گیا اور عنانِ حکومت ،،داروغۂ محلسرا،، کے ہاتھوں میں آگئی۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ عہدہ دار ابتدا میں بادشاہ کے خانگی ملازم تھے مگر رفتہ رفتہ امور مملکت میں ان کا دخل بڑھتا گیا یہانتک کہ بادشاہ کے نام سے حکومت کرنے لگے اور عہدۂ داروغگی خاندانی و موروثی ہو گیا اس خاندان میں پہلا سربرآوردہ شخص پیپن ہے جس نے سنہ ۶۸۷ء میں شمالی فرینک قوم کو پھر ایک قوم بنا دیا۔ سنہ ۷۱۴ء میں اس نے انتقال کیا اور اس کا بیٹا چارلس مارٹل اس کا جانشین ہوا۔

چارلس مارٹل ایک زبردست خاندان کا بانی ہوا جس نے مغربی یورپ میں اپنی قوت مستحکم کر لی اور رفتہ رفتہ منصب شہنشاہی کا مدعی ہو گیا اس کے عظیم الشان

کارنامے سرزمین فرانس سے وابستہ ہیں مگر واضح رہے کہ یہ بادشاہ خالص جرمن نسل سے تھا۔ اور اس کی مادری زبان جرمن تھی قوم فرانسیسی سے اسے کوئی تعلق نہ تھا زندگی بھر تمام ملک فرانس اس کے قبضے میں رہا گو اس وقت بھی خاندان کلووس کا کوئی نہ کوئی بادشاہ برائے نام باقی تھا جس کی نیابت میں چارلس مارٹل حکومت کرتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ اس نے بادشاہ کے اقتدار کو بیحد بڑھا دیا تھا قرون وسطیٰ کے دوسرے زبردست حکمرانوں کی طرح اس کی زندگی کا بیشتر حصہ امرا کی سرکشی کو توڑنے اور ان کو مطیع بنانے میں صرف ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی زندگی ہی میں ادارۂ مجلس کو جو نائب السلطنت تھا ملک میں سب سے زیادہ صاحب قوت بنا دیا۔ ملک فرانس کی سرحدوں کو بھی اس نے بہت وسیع کیا اور مشرق میں رائن ندی کے ادھر سیکسنی اور باویریا کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا یہ فتوحات دیرپا نہ تھے مگر اس کے جانشینوں کے فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے نہ صرف اسے بلکہ اس کے تمام خاندان کو پاپائے روم کے ساتھ بیحد عقیدت تھی اور کلیسیۂ روما کا وہ ملک فرانس اور دیگر ممالک میں ہمیشہ ممد رہا تبلیغ مسیحیت کا کام بھی اس کے زمانے میں سرگرمی سے جاری رہا اکثر مبلغ انگلستان کے باشندے تھے جنھوں نے جرمنی کے مختلف حصوں میں مسیحیت کو پھیلایا قوم فرینک کے اکابر ان مبلغوں کے مربی تھے اس لئے مبلغوں نے بھی ان کی عزت و توقیر بڑھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور پاپائے روما اور سلاطین فرانس میں باہمی امداد کا تعلق پیدا ہو گیا۔

قبل اس کے ہم اس باب کو ختم کریں مناسب ہو گا کہ تاریخ اسلام پر بھی ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ اسی زمانے میں اسلام کی ترقی مشرق و مغرب دونوں ممالک میں رک گئی ۷۱۷ء میں مسلمانوں کی ایک فوج جرار نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ شہر مذکور ان کے قبضے میں آجائے مگر شہنشاہ لیو نے نہایت جرأت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور چونکہ مسلمان اپنے ممالک سے بہت دور تھے اور ان کو بر وقت امداد و رسد نہیں پہونچ سکتی تھی اس لئے ان کو بادل ناخواستہ قسطنطنیہ سے بے نیل مرام واپس ہونا پڑا۔ مغرب میں ہسپانیہ کلیتہً ان کے قبضے میں آچکا تھا۔ کوہ پیرینیز کے سلسلۂ کوہ ہی کو طے کر کے جنوبی فرانس کے رومی شہروں پر

بھی وہ قابض ہو چکے تھے اور ان کے مسلسل فتوحات سے تمدن مسیحی سخت خطرے میں تھا کیونکہ ممکن تھا کہ وہ وسطی فرانس کی طرف رخ کرتے یا کوہ آلپس طے کر کے اطالیہ پر دھاوا کر دیتے اور شہر روما کا محاصرہ کر لیتے مگر اس کے برخلاف انھوں نے صوبۂ اے کوی ٹین پر حملہ کر دیا اور جو لوازندی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس ضلع کے ڈیوک کو اسلامی قائد عبدالرحمٰن نے پہلے ہی مقابلے میں شکست دی اور اسلامی فوجیں بلا کسی مزاحمت کے شمال کی طرف بڑھتی گئیں ایک وی ٹین کے ڈیوس اور چارلس مارٹل میں صفائی نہ تھی مگر مجبوراً اس نے چارلس سے امداد کی درخواست کی اور سنہ ۷۳۲ء میں چارلس اقوام فرینک کی فوجیں لیکر اس کی امداد کو پہونچا مسلمان یلغار کرتے ہوئے اپنے حدود سے دور چلے آئے تھے اور ممالک مسیحی کی متحدہ فوجوں کے مقابلے کے لئے تیار نہ تھے دونوں فوجوں میں بمقام پوائٹیرز مڈبھیڑ ہوئی مگر یہ لڑائی جنگ ٹورس (۷۳۲ء) کے نام سے مشہور ہے۔ مسلمانوں نے خوب داد شجاعت دی مگر ان کی تعداد کم تھی۔ شام تک جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا اور چارلس تیار تھا کہ پھر دوسرے روز جنگ شروع کرے مگر مسلمانوں کی فوج اول تو مختصر تھی اور دوسرے اس کا ایک بڑا حصّہ کام آچکا تھا اس لئے انھوں نے مراجعت ہی کو مناسب خیال کیا اور جن مقامات پر ان کا چند روزہ قبضہ ہو گیا تھا وہ سب ان کے قبضے سے نکل گئے۔ اس طرح گویا مشرق میں بحیرۂ باسفورس اور مغرب میں کوہ پیرینیز یہ دونوں مقام مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک زمانہ کے لئے حدّ فاصل ہو گئے۔ سنہ ۷۴۱ء میں چارلس مارٹل نے انتقال کیا اور اس کی سلطنت اس کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی جس سے اندیشہ تھا کہ کہیں ملک فرانس ہمیشہ کے لئے دو ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جائے مگر حسن اتفاق سے اس کا ایک بیٹا دنیا سے بیزار ہو کر ایک خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گیا اور دوسرا پیپن سنہ ۷۴۷ء سے بلا شرکت غیرے حکمراں ہو گیا۔

باب پنجم

شارلیمین اور جدید شاہنشاہی

قوم فرنیک کی ازدیاد قوت کا راز (جس کے سبب سے اس کے بادشاہوں نے شہنشاہی کا لقب اختیار کیا تھا) اس کے اور پاپائے روما کے باہمی جذبۂ امداد و اتفاق میں مضمر ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم قوم فرنیک کی اولوالعزمیوں کا تذکرہ کریں مناسب ہوگا کہ اطالیہ کی تاریخ پر ایک نظر غائر ڈالی جائے اور بتایا جائے کہ پاپائے روما کی وہاں کیا حالت تھی۔

مذہبی نقطۂ نظر سے پاپائے روما کی قوت برابر بڑھتی جاتی تھی کیونکہ خانقاہوں کے راہب اور مبلغ ہر جگہ عوام میں یہ تلقین کرتے پھرتے تھے کہ معاملات کلیسیہ میں پوپ کے احکام آخری اور قطعی ہیں مگر خود روما اور اطالیہ میں ان کی حالت نازک اور خطرہ سے خالی نہ تھی۔ شہر روما کی شوریدہ پشت رعایا اور سرکش امراء پوپ کو بالکل خیال میں نہ لاتے تھے اور روما سے باہر قوم لمبارڈ کے رؤسا ان سے برسرپرخاش تھے۔ قوم لمبارڈ میں اتفاق اور یکجہتی نہ تھی اور ان کے جنوبی رؤسا قریب قریب خود مختار تھے مگر باوجود اس کے جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اطالیہ میں ان کا طالع اقبال عروج پر تھا ان کا بادشاہ لیوٹ پرانڈ نہایت ذکی اور طباع حکمران تھا جس کے مساعی سے شہنشاہان قسطنطنیہ کی حکومت کا نام سرزمین اطالیہ سے مٹ گیا اور شہر راونیا بھی مفتوح ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ان اضلاع پر بھی قابض ہو گیا جن پر پوپ بحیثیت نائب شہنشاہ حکومت کرتا تھا پوپ کو یہ امر سخت ناگوار تھا۔

اور اسی لئے اس نے تمام قوم لمبارڈ کو قابل گردن زدنی قرار دیا۔ واضح رہے کہ یہ مخالفت اختلاف مذہب کے باعث نہ تھی بلکہ اس کا باعث محض رقابت تھی کیونکہ لمبارڈ کلیسیہ روما میں داخل ہو چکے تھے مگر باوجود اس کے پوپ نے اعلان کر دیا یہ قوم "مبروص" ہے بنی نوع انسان کی دشمن ہے اور دوزخ میں داخل ہوگی۔

اس سے ظاہر ہے کہ لمبارڈوں کے حملوں سے محفوظ رہنے اور اطالیہ کے کسی خطے پر بلا مداخلت غیر سے حکومت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ پوپ کسی بیرونی طاقت سے امداد کا خواستگار ہو اور اس معاملے میں اسے شہنشاہان قسطنطنیہ سے کوئی امید نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ شہنشاہ لیو نے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی جرأت اور بہادری کا کافی ثبوت دیا تھا مگر مذہبی نزاعوں کے سبب سے پوپ شہنشاہ سے امداد کا طالب نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قسطنطنیہ میں حال ہی میں ایک جدید مذہبی تحریک پیدا ہو گئی تھی جو "بت شکنی" کے نام سے موسوم ہے اور جو زمانہ مابعد کی پراٹسٹنٹ تحریک سے مشابہ تھی اس کے دو وجوہ ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ لوگوں میں مشرقی کلیسیہ کی اوہام پرستی اور رہبانیت سے بددلی پیدا ہو گئی تھی اور دوسری وجہ مذہب اسلام کا اثر تھا اور اس کی کامیابی اس نئی تحریک کے پیرو بتوں کی پرستش کو سخت ناپسند کرتے تھے جو مشرقی کلیسیے کے مذہبی رسوم میں جاری تھی اور حضرت مریم کی پرستش بھی ان کو ناگوار تھی۔ پادریوں کی مناکحت پر بھی یہ لوگ زور دیتے تھے مشرقی سلطنت میں یہ تحریک آناً فاناً پھیل گئی مگر کلیسیہ روما کے عقائد کے بالکل متضاد تھی ہر چند شہنشاہ لیو خود ان عقائد پر ایمان لے آیا تھا مگر ۷۳۱ء میں ایک کونسل روما میں منعقد ہوئی جس نے ان عقائد کو سخت بدعت قرار دیا اور شہنشاہ و دیگر معتقدین کو کلیسیے سے خارج کر دیا۔ ۷۴۱ء میں لیو کا انتقال ہو گیا مگر بت شکنی کی تحریک اس کے جانشین قسطنطین کے زمانے تک برابر زور پکڑتی گئی اور روما سے اختلافات کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ ۷۸۰ء میں راسخ الاعتقاد ملکہ ایرین تخت شاہی پر قتل کے ذریعے سے متمکن ہوئی اس نے بت پرستی کو دوبارہ جاری کیا مگر پوپ اور دربار قسطنطنیہ کے تعلقات حسب سابق کشیدہ رہے جس کی وجہ سے پوپ ایسے خاندان سے امداد کا خواستگار نہ ہو سکتا تھا جس کا

ہر رکن اسے کفر و الحاد اور معاصی کا پتلا نظر آتا تھا۔

مشرقی سلطنت سے چونکہ پوپ کے تعلقات نہایت کشیدہ تھے
اس لئے مجبوراً ان کو حکام فرانس سے جن کے وہ پہلے ہی سے مرہون منت تھے
یہ درخواست کرنا پڑی کہ انہیں قوم لمبارڈ کے پنجۂ ستم سے رہائی دلائیں۔ پپن دس
سال سے فرانس پر حکمراں تھا مگر اس کی حیثیت اب بھی داروغۂ محلسرا کی تھی حالانکہ
تخت فرانس اس وقت خالی تھا۔ کچھ روز کے لئے پھر ایک بادشاہ برائے نام
تخت پر بٹھا دیا گیا مگر ظاہر ہے کہ بلا اقتدار بادشاہ کا وجود محض بے سود ہے
پپن کی قوت اس قدر زبردست ہوگئی تھی کہ وہ خود خطاب شاہی کا مدعی تھا وہ خود
برسر حکومت تھا اس لئے تاج شاہی اپنے سر پر رکھ لینا اس کے لئے چنداں
دشوار نہ تھا۔ مگر زمانہ ماضی کے زبردست بادشاہوں کے روایات کا اثر
اب بھی باقی تھا جس کی وجہ سے پپن ایک زمانے تک سریر آرائے سلطنت ہونے
سے پس و پیش کرتا رہا۔ آخر کار پوپ کی امداد سے یہ عقدہ حل ہو گیا کیونکہ جب
یہ معاملہ پوپ ذکریا کے پاس تصفیے کے لئے پہونچا تو اس نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ
جس شخص کے ہاتھ میں اقتدار شاہی ہے وہی بادشاہ کہلانے کا مجاز ہے۔ پوپ کے
اس تصفیے سے پپن کو کوئی پس و پیش باقی نہ رہا اور برائے نام بادشاہ کو تخت سے
اتار کر خانقاہ میں داخل کر دیا گیا۔ پپن کو امرائے فرانس نے اپنے کاندھوں پر
لے کر اس کی بادشاہی کا اعلان کیا اور انگریزی مبلغ بانی فیس نے رسوم تخت نشینی
ادا کئے۔ دو سال کے ذکریا جانشین پوپ اسٹیفن خود کوہ آلپس طے کر کے
فرانس میں آیا اور تاج شاہی اپنے ہاتھ سے پپن کے سر پر رکھا جس کی وجہ سے
اس کا خاندان بلا غل و غش فرانس پر حکومت کرنے لگا۔ اس خاندان کو سابق
خاندان کے نام کے وزن پر اور پپن کے بیٹے چارلس اعظم یا شارلیمین کے نام کی
رعایت سے کارولنگین (کارلوسی) کہتے ہیں۔

پوپ کے احسانات کے اعتراف میں پپن نے ان کی ایک عظیم خدمت کی
ہم بیان کر چکے ہیں کہ پوپ قوم لمبارڈ سے سخت نالاں تھا اس لئے اس کی
امداد کے لئے سنہ ...ء میں ایک فرانسیسی فوج اطالیہ میں پہونچی۔ قوم لمبارڈ کے

بادشاہ کو شکست ہوئی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے مگر فاتحین نے اس کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے سے احتراز کیا اور صرف اس شرط پر اکتفا کی وہ اپنی سلطنت کا ایک ثلث پوپ اسٹیفن کے حوالے کر دے یعنی وہ خطہ ملک راوینا اور روما کے درمیان واقع تھا اور پوپ کا قبضہ ان ممالک پر بحیثیت خودمختار رئیس کے نہ تھا بلکہ شاہ فرانس کے نائب کی حیثیت سے وہ اس جگہ حاکم تھا۔ ۷۵۵ء کے چودہ سال بعد پپن بقید حیات رہا اور اپنی فراست اور حسن تدبیر سے اس نے اپنے مقبوضات کو بہت کچھ وسعت دی ۷۶۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور قوم فرینک کے رسوم کے مطابق اس کی سلطنت اس کے دونوں بیٹوں چارلس اور کارلومن کے درمیان تقسیم ہو گئی جس سے سلطنت میں ضعف کا احتمال ہو گیا۔ مگر کارلومن کا دو سال کے بعد کسی عارضہ میں انتقال ہو گیا اور چارلس تمام فرانس کا بادشاہ ہو گیا۔ اس بادشاہ کا نام چارلس یا کارل تھا مگر زمانہ مابعد میں شارلیمین یا چارلس اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ نسلاً یہ بادشاہ خالص جرمن تھا اور عادات و خصائل میں چارلس مارٹل اور پپن سے بھی زیادہ جرمن تھا۔ اس کا دارالسلطنت دریائے رائن کے قریب بمقام آئی لاشاپیل یا آکین تھا مگر نہ صرف جرمن بلکہ اہل فرانس بھی اس کو اپنے اکابر قوم میں شمار کرتے ہیں جس کی حکومت اور پالیسی سے ان کی تاریخ میں ایک نہایت اہم دور شروع ہوتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں اس بادشاہ سے زیادہ سربرآوردہ کوئی حکمران نہیں گزرا ہے قوم فرینک کے مقبوضات کو اس نے جرمنی کے قلب تک پہنچا دیا اور اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کی جرمنی سلطنت کا یہی بانی تھا۔ اطالیہ اور ہسپانیہ بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے اور ہر دو ممالک میں اس کا اثر مدت تک قائم رہا۔ اس کے عہد سلطنت نے علوم و فنون میں ایک نئی روح پھونک دی تھی جس سے پردۂ تاریکی ایک حد تک اُٹھ گیا تھا اور ترقی کی تحریک اس کے دورِ حکومت میں کبھی کمزور نہیں ہوئی۔ اس کی قوت مغربی یورپ میں اس قدر بڑھ گئی اور کلیسیہ روما کے اس نے ایسے شاندار خدمات انجام دیئے کہ اعزاز کے طور پر اسے شہنشاہ کا اعزازی خطاب دیا گیا اور گو اس زمانے میں یہ منصب جلیلہ محض رسمی خیال کیا جاتا تھا مگر مرور ایام کے بعد اس کی اہمیت واضح ہونے لگی۔ اس شہنشاہ کی ذات قرون وسطیٰ کے

تمام تعمیری اثرات کی جامع تھی، قدیم رومی اثرات کا طولانی انحطاط اسی کے عہد میں ختم ہوا، اور زمانۂ حال کے تمدن کی ابتدا اسی کے عہد سلطنت سے ہوئی ہے۔

شارلیمن کے معتمد ایگن ہارڈ نے اس کے سوانح لکھے ہیں جس سے اس کے ذاتی اخلاق اور کارنامے معلوم ہوتے ہیں۔ شارلیمن بلند و بالا، قوی اور پھرتیلا آدمی تھا کسرت کا شوق تھا، اور اپنے دارالسلطنت کے حماموں میں تیرا کرتا تھا۔ اس زمانے کے معیار کے مطابق کھانے پینے میں محتاط تھا اور اس کی ذات سے اس کے وحشی جرمنی امراء کے عادات و خصائل میں بھی بہت کچھ اصلاح ہوئی۔ علوم و فنون کے فروغ و اشاعت سے اسے خاص دلچسپی تھی اور اس غرض سے اس نے ایک مشہور انگریز الکوئن ساکن یارک کو اپنے دربار میں نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ بلوایا تھا اور اپنے امراء کے بچوں کی تعلیم کی خدمت اس کے متعلق کی تھی متعدد السنہ سے واقف تھا یہاں تک کہ زبان یونانی بھی جانتا تھا سینٹ آگسٹین کی کتاب "مدینۃ اللہ" کے پڑھنے کا اسے خاص شوق تھا مگر ایک عجیب بات ہے جو اس زمانے میں عام تھی یعنی اس علم و فضل اور دماغی قوت کے باوجود یہ بادشاہ کبھی تحریر پر قادر نہ ہوا۔ اس کے خصائل میں بلند ہمتی، خدا ترسی، اور خدمت ملک کے جوہر خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں اور گو اس کی خانگی زندگی عیوب سے خالی نہیں ہے اور بعض مظالم کا بھی اس پر الزام ہے مگر پھر بھی اس زمانے کے امرا اور بادشاہوں سے اس کے اخلاق بہتر تھے۔

مورخین اس کا شمار فاتحین عظام میں کرتے ہیں مگر غالباً فن سپہگری میں اسے زیادہ دخل نہ تھا کیونکہ فوج کی کمان وہ زیادہ تر دوسروں ہی کے سپرد کر دیتا تھا اور خود صرف ہدایات دیا کرتا تھا۔ اب ہم اس کے فتوحات کو یکے بعد دیگرے بلحاظ تاریخ بیان کرینگے سب سے پہلے اس نے حاکم ایکوی ٹین کو بالکلیہ اپنا مطیع کر لیا اس کے بعد مسلمانان ہسپانیہ کا اس نے کامیابی کیساتھ مقابلہ کیا باہمی نزاع اور منافقتوں کی وجہ سے مسلمان آپس ہی میں کٹ مر رہے تھے اور اس موقع کو چارلز نے غنیمت جانا کوہ پیرینیز کو اس نے ایک دفعہ سے زیادہ طے کیا اور ۷۹۰ء میں شہر بارسیلونا پر قبضہ کر کے پیرینیز کے جنوب میں ایک خطۂ زمین پر قبضہ کر لیا جو ہمیشہ قائم رہا گر یہ قبضہ نہایت

شکل سے ہوا اور پرینیز کے طے کرنے میں شارلمین کا ایک جانباز جنرل رولینڈ مارا گیا۔ اسکے مارے جانے کے حالات تاریخی روایات کے مشہور ترین واقعات میں سے ہیں مسیحیوں کی یہ فتح نہایت اہم ہے کیونکہ اسی مقام سے مسیحیوں کے فتوحات کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع ہوتا گیا۔ یہانتک کہ چند صدیوں کے بعد تمام ہسپانیہ پھر انکے قبضہ میں آگیا۔ ان محاربات سے زیادہ اہم شارلمین کی فتح سیکسنی کی لڑائیاں ہیں۔ واضح رہے کہ جس ملک سیکسنی کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اس ملک سے بالکل مختلف تھا جو اب ہم نقشوں میں دیکھتے ہیں۔ شارلمین کے زمانے میں اس ملک میں ایمس، ویزر اور ایلب ندیوں کی نشیبی وادیاں شامل تھیں جن میں شروع سے آخر تک جنگل ہی جنگل تھے اور سڑکوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ باشندے بالکل جنگلی اور بت پرست تھے۔ اور مسیحی مبلغوں کے مواعظ پر بالکل دھیان نہ دیتے تھے اور نہ ان مبلغوں کی مددگار فوجوں ہی سے مرعوب ہوتے تھے۔ شارلمین اس قوم سے مدت تک لڑتا رہا اور ایک آدھ مرتبہ اسکی فوجوں کو ہزیمت بھی ہوئی کیونکہ ۷۸۲ء میں ان وحشیوں نے اسکی ایک فوج کو گھیر کر بالکل فنا کردیا۔ مگر آخر کار قوم سیکسن تاب مقاومت نہ لاسکی اور انکے سرگروہ نے ہتھیار ڈالدئے اور دین مسیحی قبول کرلیا۔ اسکے بعد ایک بغاوت بھی ہوئی مگر اس میں ناکامیابی ہوئی اور اس قوم کے چار ہزار افراد سخت بیرحمی کے ساتھ تہ تیغ کردیئے گئے۔ اس ملک میں دین مسیحی کی اشاعت نہایت سختی اور بیرحمی سے ہوئی مگر دیرپا ثابت ہوئی مذہب مسیحی اور سلطنت فرانس دونوں کے ایسے قدم جم گئے کہ زمانہ مابعد میں جب شارلمین کے ورثا ضعیف ہوگئے تو قوم سیکسن نے جرمنی فتوحات کا سلسلہ جاری کردیا۔

باویریا کے خلاف بھی فوج کشی ہوئی اور اس صوبے کو بھی مقبوضات فرانس میں شامل کرلیا گیا اور یہ ملک جرمنی کا ایک نہایت ترقی کن خطہ ہوگیا۔ مگر جرمنی کی حکومت سے شارلمین کی ہوس ملک گیری پوری نہیں ہوئی اور دریائے ایلب عبور کرکے بوہیمیا میں پہنچا اور قوم چک کو مغلوب کیا۔ اسکے علاوہ قوم آوار سے بھی مصروف رزم و پیکار رہا۔ یہ قوم ان ممالک میں آباد تھی جنکو اس زمانے میں آسٹریا ہنگری کہتے ہیں اور مشہور تھا کہ قوم ہن کے سرگروہ اٹیلا کا جمع کیا ہوا خزانہ

ان کے قلعوں میں موجود ہے۔ یہ قوم نہایت طاقتور تھی اور اس کے وجود سے جرمنی کے متمدن اقوام کو ہمیشہ خطرہ رہا کرتا تھا۔ شارلیمن نے متواتر لڑائیوں کے بعد ان کے قلعوں کو مسمار کردیا اور ان کے خزانے پر قبضہ کر کے تقسیم کردیا۔ قوم آوار کا بادشاہ بھی اپنی فوج کی ہزیمت کے بعد دین مسیحی قبول کرنے پر مجبور ہوگیا۔

اب ہم بلالحاظ سلسلۂ تاریخی قوم لمبارڈ کے مغلوب کئے جانے کا حال بیان کرینگے کیونکہ اسی سے چارلس کے اعزاز و افتخار میں افزائش ہوئی۔ اس کے باپ پپن کے فتوحات سے قوم لمبارڈ اور پوپ کے تعلقات استوار نہیں ہوئے تھے قوم لمبارڈ کے بادشاہ سے چارلس خود برسرِ پرخاش تھا۔ کیونکہ اس نے بادشاہ مذکور کی بہن سے نکاح کرلیا تھا اور پھر اس کو طلاق بھی دیدی تھی۔ ۷۷۳ء میں پوپ ہیڈرین کے اصرار سے چارلس نے لمبارڈی پر اپنی زرہ پوش فوج کے ساتھ دھاوا کیا۔ وہاں کا بادشاہ شہر پویا میں محصور ہوگیا اور آخر کار اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہوگیا چارلس نے اس کے تمام ممالک پر قبضہ کرلیا اور شاہ اقوام لمبارڈ و فرنیک و سردار روما کا لقب ۷۷۴ء میں اختیار کیا اور ۲۵ سال تک اسی لقب پر قانع رہا۔ پوپ کے اقتدار اور مقبوضات میں بھی اس نے بہت کچھ اضافہ کیا۔

مگر قوم لمبارڈ کی نکبت و بربادی سے پوپ کو چین نہیں ملا کیونکہ امراے روما اس کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے تھے اور اسے سخت پریشان کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ جدید پوپ لیو اور سابق پوپ ہیڈرین کے عزیزوں کے درمیان سخت مخالفت پیدا ہوگئی تھی اور پوپ کے دشمنوں نے شہر روما کے حدود کے باہر اس پر حملہ کر کے اس کو قریب قریب اندھا کر کے قید کرلیا تھا مگر وہ بچ نکلا اور کوہ آلپس طے کر کے ۷۹۹ء میں چارلس کے پاس پناہ لی اور اس سے عرض کیا کہ باوجود اس کے کہ میں نائب مسیح ہوں مگر میرے دشمنوں نے میری آبروریزی اور تخریب میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بادشاہ نے اس کی شکایتوں سے متاثر ہو کر ۸۰۰ء میں پھر اطالیہ کا رخ کیا اور روما پہنچا جہاں اس کا کوئی مزاحم نہ ہوا۔ پوپ لیو اس کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنے دشمنوں کے اتہامات کا جواب دیا۔ چارلس نے اس کے عذر قبول کئے اور اسے مسندِ پاپائی پر بحال کیا جس سے پوپ پھر شاہ فرانس کا مرہونِ منت ہوا

اور اسکے احسانات کے صلے میں اسکو شہنشاہ کا لقب دیا۔

سنہ ۸۰۰ء میں کرسمس (ولادت حضرت عیسیٰ) کے روز شارلمین سینٹ پیٹر کے گرجا میں مصروف عبادت ہوا۔ رسوم مذہبی ختم ہوجانے کے بعد پوپ اپنی جگہ سے اٹھا اور تاج شہنشاہی شارلمین کے سر پر رکھ کر آداب بجالایا۔ یہ واقعہ ذرا پُراسرار ہے کیونکہ شارلمین نے خود ہی بیان کیا ہے کہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ ہوگا تو وہ گرجا میں ہرگز نہ جاتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ شارلمین کو خود لقب شہنشاہی کی ہوس تھی اور پوپ نے غالباً جو کچھ کیا وہ سمجھوتے ہی کی بنا پر کیا ہوگا۔ سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۶ء تک مغربی یورپ میں چند وقفوں کے سوا کوئی نہ کوئی بادشاہ ایسا ضرور گزرا ہے جسے شہنشاہ روما ہونے کا دعویٰ تھا۔

ابتدا میں یہ تغیر زیادہ مہتم بالشان نہ تھا کیونکہ لقب شہنشاہی اختیار کرنے سے شارلمین کی قوت میں ایک شمہ بھی اضافہ نہ ہوا۔ مگر صفحات تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لقب کا اختیار کرنا محض رسمی نہ تھا بلکہ تاریخ یورپ میں یہ واقعہ نہایت اہم ہے شارلمین کے جانشین اس خطاب کو ایک خالی خولی عزت افزائی نہ خیال کرتے تھے اور گو اسکا حیطۂ اقتدار زیادہ وسیع نہ تھا مگر اس کی وجہ سے ان کو مغربی یورپ میں دوسری طاقتوں پر حقیقی برتری حاصل تھی عہدۂ شہنشاہی اگر اس طرح برقرار نہ کیا گیا ہوتا تو قرون وسطیٰ کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ زیر تذکرہ شہنشاہی کو قدیم رومی شہنشاہی سے کوئی تعلق نہ تھا کیونکہ شارلمین اور روما کے قدیم شہنشاہوں میں کوئی تعلق نہ تھا ان کی زبان لاطینی تھی قوانین روما کے وہ پابند تھے اور جرمنوں کو اپنا دشمن جانی خیال کرتے تھے مگر شہنشاہان مابعد اپنے کو نہ صرف شارلمین بلکہ جولیس سیزر و کانسٹن ٹائن کا جانشین خیال کرتے تھے اور ان کے اس تیقن کا اثر ان کے افعال و حرکات اور رفتار زمانہ پر پڑتا تھا۔

شارلمین کا کمال تدبر نہ صرف ملک گیری بلکہ اقطاع مفتوحہ کے نظم و نسق سے ظاہر تھا کیونکہ جدید مفتوحہ وسیع علاقوں کا نظم و نسق درست رکھنا نہایت دشوار امر ہے اور اس کے علاوہ ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ مقامی حکام کہیں مرکزی حکومت کو تہ و بالا نہ کردیں۔ یہ دائمی خطرہ رفع کرنے کے لئے اس نے خاص حکام بہ نفس نفیس مقرر کئے تھے جو تمام سلطنت کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ اپنے آقا کے احکام کو مقامی حکام تک پہنچاتے تھے اور دیکھتے رہتے تھے کہ ان احکام کی بجا تعمیل ہوتی ہے یا نہیں۔ سال میں دو مرتبہ موسم بہار

وموسم خزاں میں تمام عساکر شاہی جمع ہوتے تھے اور یہ قومی اجتماع "مے فیلڈ" کے نام سے مشہور تھے۔ عام سپاہیوں کی موجودگی سے ان مجالس میں جمہوری عنصر غالب پایا جاتا تھا مگر در اصل مباحث میں صرف امرا اور کلیسہ کے بڑے بڑے پادری شریک رہتے تھے مجالس امرا سے زیادہ رعایا کے آرام و آسایش کا خیال بادشاہ کو تھا۔ اس نے بیحد کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح قدیم روسا کا اقتدار و اثر مٹادے اور انتظام مملکت کے لئے اس نے "کاونٹ" مقرر کئے تھے جن کا منصب اس زمانے میں موروثی نہ تھا بلکہ اس خدمت پر وہ انھیں لوگوں کو مقرر کرتا تھا جن پر اس کو اعتبار ہوتا۔ بعض لوگ نظام جاگیری کی ابتدا شارلمین کی ذات سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ خلاف واقعہ ہے کیونکہ وہ خود بڑے بڑے زمینداروں کی قوت توڑنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ جاگیریت کا اصل اصول یہ ہے کہ مقامی زمیندار بالکل خود مختار ہو اور شارلمین کی ہر جگہ یہ کوشش تھی کہ مرکزی حکومت کا اقتدار سب پر چھایا رہے۔ شارلمین کے صدہا قواعد و قوانین موجود ہیں جن سے ظاہر ہے اسے اشاعت علم حفاظت و نگہداشت کتب اور قیام امن و امان کا خاص خیال رہتا تھا۔ سلطنت روما کے انحطاط کے بعد مغربی یورپ میں کسی حکومت کا یہ نصب العین نہ رہا تھا۔ قرون وسطیٰ کے گھپ اندھیرے میں قیام امن و امان اور اشاعت علوم میں اس نے جو کوشش کی وہ قابل تعریف ہے۔

۸۱۴ء میں اس کا انتقال ہوا اس کے جانشین سرتاپا نالائق تھے جنھوں نے اس کے کارناموں کو بالکل چوپٹ کردیا مگر اس نکبت و بربادی کی وجہ سے اس کا نام اور اس کے کمالات اور بھی چمک گئے۔ مرنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق افسانے مشہور ہوگئے اور اس کے کارناموں کی ستایش میں متعدد رزمیہ نظمیں لکھی گئیں جس میں تاریخی واقعات کو نظر انداز کرکے اسے دیوتا کے رتبہ پر پہنچا دیا گیا یہاں تک کہ مختلف روایات میں بیان کیا گیا کہ وہ محاربات صلیبی میں شریک تھا اور پیرس کو اس نے مسلمانان ہسپانیہ کے حملہ سے محفوظ رکھا تھا۔ یہ واقعات بالکل غلط ہیں مگر اس سے ظاہر ہے کہ اس کی عظمت کا اس کے ہمعصروں پر نہایت گہرا اثر تھا۔

باب ششم

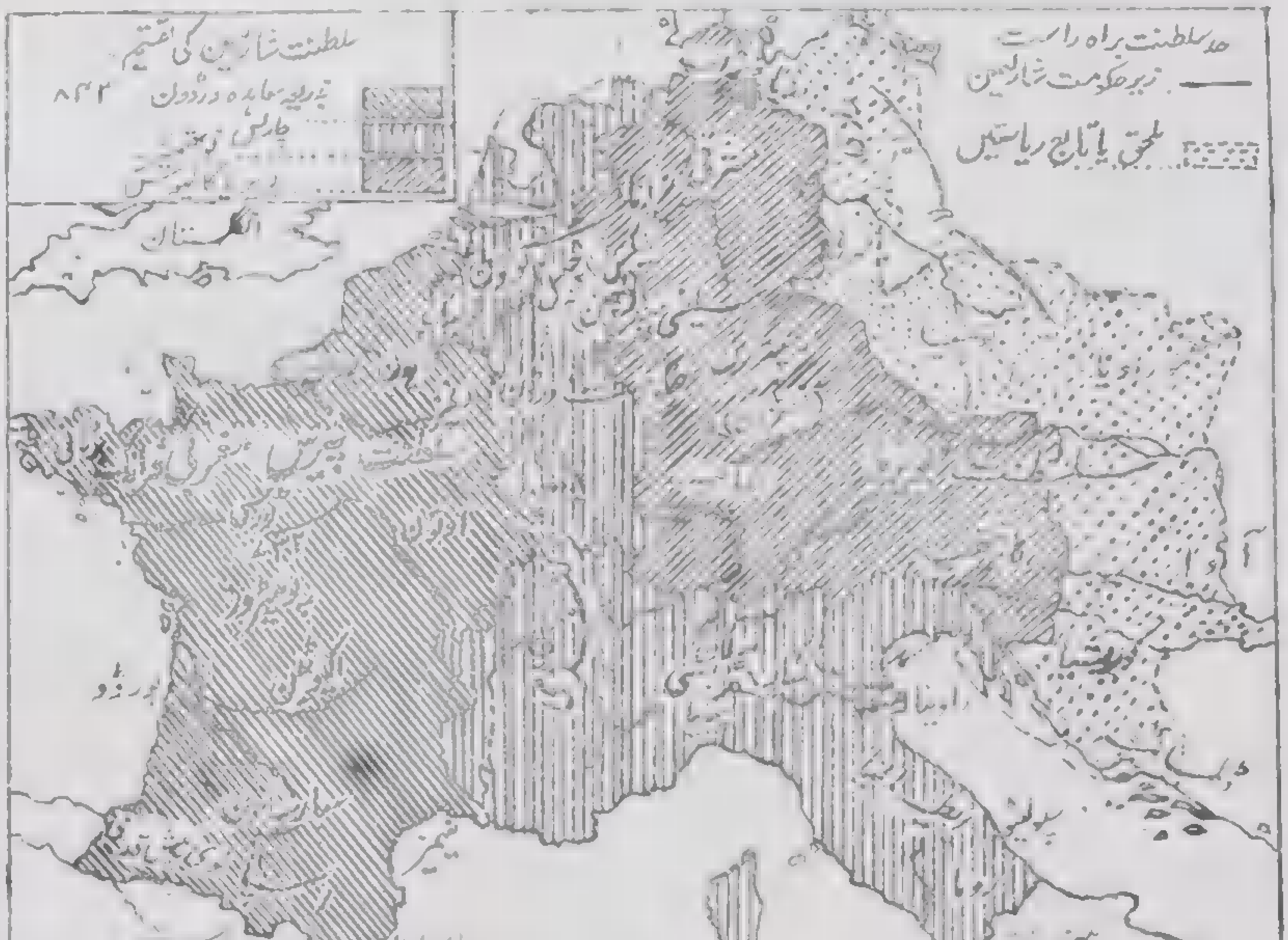
شارلمین کی سلطنت کی بربادی

شارلمین کی سلطنت بلحاظ رقبہ اس قدر وسیع تھی کہ اس کے انتظام کے لئے انتہا درجے کی لیاقت اور سرگرمی کی ضرورت تھی اور اس کے جانشینوں میں اس کا مادّہ بالکل نہ تھا۔ اس کا جانشین اس کا اکلوتا بیٹا لوئی پارسا ہوا مگر اس کی قوت ارادی بالکل معطل تھی اور محض ناکارہ تھا پادریوں کا اسے بہت پاس تھا اور بالکل کٹھ پتلی کی طرح ان کے ہاتھوں میں تھا جس سے تمام سلطنت میں ابتری پھیل گئی۔ خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہر چند اس کے زمانۂ حیات میں اس کی سلطنت کا کوئی ٹکڑا اس کے قبضہ سے نہیں نکلا مگر نظام سلطنت چونکہ بالکل ضعیف ہو گیا تھا اس لئے اس کی موت کے بعد سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے۔ اس کے تین بیٹے تھے جن میں اس کی موت کے بعد فرینک قوم کے قوانین کے مطابق سلطنت تقسیم ہو گئی مگر خطاب شہنشاہی کا وارث صرف ایک ہی ہو سکتا تھا تقسیم مملکت کے بارے میں آپس میں ایک مدت تک سخت کشیدگی رہی مگر آخر کار ۸۴۳ء میں بروئے صلحنامہ وردن کچھ روز کے لئے صلح ہو گئی۔ اس صلحنامے کے لحاظ سے لوتھر کو جسے لقب شہنشاہی ملا تھا سلطنت کا وسطی حصہ ملا یعنی وہ ممالک جو رائن ندی کے کنارے واقع ہیں سوئٹزرلینڈ اور شمالی اطالیہ بھی اسی کے حصے میں آئے۔ لوئی کو مشرقی ممالک ملے اور چارلس کو مغربی۔ مگر اس صلحنامے سے کوئی دوامی فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ واقعات آئندہ کی بنیاد اس کے اوپر ہے۔ جرمنی اور فرانس کی ہستی بحیثیت مختلف ممالک کے اسی صلحنامہ کے بعد سے پیدا ہوئی ہے اور دونوں ممالک کے درمیان جو اضلاع میں

ان کے متعلق ان دونوں ملکوں میں سخت نزاع رہی۔

شارلمین کی سلطنت کے حصے بخرے ہو جانا کوئی امر اتفاقی نہ تھا جو اس کے پوتوں کی باہمی رقابت پر مبنی ہو کیونکہ ایسے زبردست اثرات پیدا ہو گئے تھے کہ شارلمین کے ایسے لائق حکمراں کے لئے بھی سلطنت کی ہستی کا قائم رکھنا دشوار کر دیتے اولاً یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سلطنت کا رقبہ اس قدر وسیع تھا اور اس کے مختلف القوم باشندوں کے خصائل اور ضروریات اس قدر متضاد تھے کہ خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ ذرائع آمد و رفت دشوار اور ناپید ہوں ایک واحد حکمراں کا ایسی سلطنت پر حکومت کرنا بہر صورت دشوار تھا۔ ثانیاً اسی زمانے میں سلطنت پر وحشیوں کا ایک ٹڈی دل پھر ٹوٹ پڑا جو چوتھی اور پانچویں صدی کے وحشیوں سے زیادہ خطرناک تھا مسلمانوں کی فاتحانہ اولوالعزمیوں کو جنگ ٹورس میں روک دیا گیا تھا مگر ان کا وجود اب بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور جنوبی اطالیہ پر ان کی یورشیں برابر ہوتی رہیں یہاںتک کہ سنہ ۸۴۶ء میں انھوں نے شہر روما کے کلیسیہ سینٹ پیٹر پر قبضہ کر لیا اور گو وہاں سے وہ ہٹا دئے گئے مگر مدت تک وسطی اطالیہ ان کی دار و گیر سے محفوظ نہ تھا۔ مشرق میں قوم مگیار (زمانہ حال کے قوم ہنگرین کے مورث) آسٹریا۔ اور ہنگری سے جرمنی کے متصلہ اضلاع کو تاخت و تاراج کر رہے تھے۔ ان کی دست برد سے زیادہ اندیشہ ناک قوم ڈین یا نارمن کے حملے تھے۔ یہ قوم ناروے سویڈن ڈنمارک اور بحیرۂ بالٹک کے سواحل پر آباد تھی اور وہاں سے تاخت و تاراج کے لالچ میں ممالک مغرب پر بلائے بے درماں کی طرح آ پڑی۔ مگر ان لٹیروں کے حملے تاریخ یورپ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ روس کی تاریخ کی ابتدا بھی اسی ایک قوم کے ایک اولوالعزم سردار مسمی ریورک کے حملوں سے ہوتی ہے جس نے اس ملک پر سنہ ۸۶۲ء میں یورش کی۔ انگلستان پر بھی اسی قوم کے ایک بادشاہ ولیم فاتح نے گیارھویں صدی میں قبضہ کر لیا انگلستان کے علاوہ نارمنڈی نیپلز اور سسلی میں ان کی محکم اور استوار سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ آئس لینڈ کا دور دراز جزیرہ بھی ان کی ہوس ملک گیری سے محفوظ نہ رہ سکا بلکہ قیاس غالب ہے کہ کولمبس سے کئی صدیوں قبل یہ قوم امریکہ کے شمالی سواحل تک پہنچ گئی تھی مگر یہ واقعات زمانۂ مابعد کے ہیں ابتدا میں صرف قتل اور غارت گری ان کا مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی بڑی ندی دیکھتے اس میں اپنی کشتیوں کو بے تحاشا چھوڑ دیتے اور جہاں کہیں موقع مناسب ملتا خشکی پر اتر کر لوٹ مار کرتے۔ انگلینڈ فرانس اور جرمنی کے ساحلی اضلاع ایک مدت تک

سلطنت شارلیمن



سلطنت شارلیمن اور اسکی تقسیم معاہدہ ورڈن کے وقت

ان کے ظلم وستم کے تختۂ مشق رہے ۸۴۱ء میں انھوں نے روئن پر قبضہ کرلیا
اور ۸۴۸ء میں بورڈو پر اور اس وقت سے بڑے بڑے دریاؤں کی طرح فرانس کے
پیچھے پڑ گئے۔ اضلاع جرمنی پر ان کی تباہ کن یورشیں ۸۸۱ء سے شروع ہوئیں
جبکہ رائن ندی کے ذریعے سے جرمنی میں داخل ہوئے اور لیج کالون اے لاشپایل
اور متعدد بڑے بڑے شہروں کو نیست ونابود کردیا مگر دس سال کے بعد ۸۹۱ء میں
جرمن پھر سنبھلے اور آرنلف کے زیر کمان ایک زبردست فوج جمع ہوئی جس نے
ان لٹیروں کی کافی گوشمالی کی اور پھر مدت تک جرمنی پر حملہ کرنے کی انھیں ہمت
نہ ہوئی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس پر ان کی یورشیں جلد جلد ہونے لگیں شارلیمین
کی سلطنت عظیم کی بنا اس کے اور اس کے پیش روؤں کے فتوحات پر قائم ہوئی تھی
مگر ان وحشی لٹیروں کے حملوں اور اس کے جانشینوں کے ضعف کے سبب
جب سلطنت کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی اور اس کا قیام دشوار ہوگیا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کے
حصے بخرے شروع ہو گئے۔ صلح نامۂ ورڈن کی رو سے تین سلطنتیں
قائم ہوئی تھیں مگر تقسیم کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا اور اٹلی، برگنڈی اور جنوبی فرانس میں
خودمختار سلطنتوں کی بنیاد پڑ گئی۔ ان اہم انقلابات کے علاوہ اس زمانے میں ایک
نئی قوت وجود میں آرہی تھی جس پر ایک مدت تک یورپ کے تمدن اور سیاسیات کا
دارومدار تھا یہ نظام جاگیری تھا اس نظام تمدن کی بنیاد زمانۂ قدیم ہی میں پڑ چکی تھی اور
اس کی تشکیل کے متعلق ہم آیندہ چلکر بحث کرینگے۔ اس وقت صرف اتنا ہی بیان کردینا
کافی ہے کہ جاگیریت میں نظام سلطنت اور تمدنی تعلقات کا دارومدار ملکیت زمین پر تھا
مالک زمین نہ صرف اس علاقے کا مالک بلکہ حاکم، جج اور قائد فوج، بھی ہوتا تھا اور
مالگزاری بھی وصول کرتا تھا۔ اپنے علاقہ میں اس کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور گو وہ بادشاہ
اور شہنشاہ کی حکومت کو تسلیم کرتا تھا، بعض عدالتی معاملات میں ان کا دست نگر تھا اور
زمانۂ جنگ میں ان کی امداد پر مجبور تھا مگر اپنے علاقے میں یا اپنے کاشتکاروں کے
ساتھ کسی کی مداخلت کو جائز نہ رکھتا تھا جاگیریت کے اصول مختلف ممالک اور
مختلف زمانوں میں متغائر رہے ہیں۔ اس کا نشوونما شارلیمین کی سلطنت کی نکبت
وبربادی کے بعد ضروریات زمانہ کی وجہ سے ہوا۔ وحشیوں کے حملوں سے رعایا

نالاں تھی شہنشاہ کی حکومت صرف برائے نام باقی رہ گئی تھی اس لئے رعایا مجبور تھی کہ حفاظت کے لئے قوی ترین مقامی قوت کے گرد جمع ہو اور ظاہر ہے کہ زمیندار کے سوا اطراف میں کوئی زبردست نہ تھا۔ اس نظام تمدن کی اشاعت نہایت سرعت کے ساتھ ہوئی اور گو اس کی جڑیں شہنشاہی کے ضعف سے مضبوط ہوئی تھیں مگر اسکی وجہ سے سلطنتوں کے روز بروز حصے بخرے ہوتے گئے۔

سنہ ۸۴۴ء کے بعد بھی کچھ روز تک شہنشاہی شارلیمین کے خاندان میں باقی رہی مگر شہنشاہ کا وجود بطور تجاور کے تھا اور خطاب شہنشاہی کے سوا اور کوئی اثاثہ اس کے نالائق جانشینوں کے پاس نہ تھا۔ سنہ ۸۸۸ء تک کوئی نہ کوئی فرد اس خاندان کا موجود تھا مگر اس سال خطاب شہنشاہی اس خاندان کی شاخ آرنل فنگ میں چلا گیا جن کا مورث ولد الحرام تھا مگر اس کے افراد بھی مر کھپ گئے اور دسویں صدی عیسوی میں خاندان شارلیمین کا کوئی نام لیوا تک باقی نہ رہا اور خطاب شاہی کے دعویدار قوم سیکسن کے رئیس ہوئے جن کو شارلیمین نے کئی زبردست معرکوں میں زیر کیا تھا۔

کلیسۂ مسیحی کا اثر تمدن یورپ پر حسب سابق نہایت قوی تھا مگر نویں صدی کے آخر میں اس کا ستارۂ اقبال بھی گردش میں آرہا تھا۔ ہم کسی گذشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں کہ کلیسیہ مشرقی (قسطنطنیہ) و کلیسیہ مغربی (روما) میں باہمی اختلافات تھے اور انھیں اختلافات کے باعث شارلیمین درجۂ شہنشاہی تک پہنچ گیا تھا۔ عقائد مذہبی میں اختلاف کے علاوہ جن کی وجہ سے اتحاد دشوار تھا روما اور قسطنطنیہ کے اسقفوں میں باہمی رقابت بھی موجود تھی۔ سنہ ۸۶۹ء میں قسطنطنیہ میں قسیسوں کا ایک بڑا اجتماع ہوا جس میں عقائد مذہبی کے متعلق چند ایسے امور طے ہوئے جن سے دونوں کلیساؤں میں دوامی منافرت پیدا ہو گئی۔ قسطنطنیہ کے قسیس پادریوں کے تجرد کے سخت مخالف تھے اور بقول ان کے یہ طریقۂ معاشرت "شیطان کا جال تھا"۔ انھوں نے مغربی مذہب کے اس اصول کی سخت مخالفت کی کہ "مقدس روح" "باپ اور بیٹے" سے نکلتی ہے۔ تثلیث میں سے وہ لفظ "بیٹے" کو بالکل خارج کر دینے پر زور دیتے تھے کیونکہ ان کی رائے میں یہ عقیدہ بدعت سے مملو ہے اور "ایک ہزار لعنتوں کے موجب ہے"۔ اس کے

علاوہ انھوں نے عید "ایسٹر" کی تاریخ بھی کلیسیہ روما کی تاریخ سے مختلف کر دی ان اختلافات کو رفع کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہیں مگر سب بے سود ثابت ہوئیں اور دونوں کلیسیہ اس وقت تک جدا جدا ہیں۔

پاپائے روما کو خود شہر روما اور اطالیہ کے شوریدہ سر افراد پریشان کئے ہوئے تھے مسلمان اطالیہ کو تاخت و تاراج کر رہے تھے امرائے روما خود پوپ پر اپنا اقتدار جتلا رہے تھے اور اکثر یہ بھی ہوتا کہ ان کی کوئی جماعت پوپ پر واقعی اپنا اقتدار جمالیتی اور اپنے اغراض کی تکمیل اس کے ذریعہ سے کراتی۔ اپنے عہدے اور منصب جلیل کے تقدس کے باوجود اکثر پوپوں کی خانگی زندگی اور انکے دربار کی حالت نہایت شرمناک تھی اور شہر روما میں پوپ کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ مگر باوجود ان مقامی مشکلات اور کلیسیہ مشرقی کیساتھ کے آئے دن کے تفضیوں کے اس زمانہ میں پوپ نے نہ صرف مذہبی تفوق بلکہ دنیاوی اقتدار کے متعلق اپنے دعاوی کو وسعت دینی شروع کی اور اپنے دعاوی کی تقویت کے لئے چند تحریریں روما میں ۸۶۰ء میں شائع کرائیں جو "اسوڈورین ڈکرٹیلس" (Isidoran Decretals) کے نام سے مشہور ہیں اور جو بظاہر ابتدائی زمانے کے پوپوں اور کونسلوں کی مقولات ہیں۔ ان جملہ تحریروں کا مدعا یہ تھا کہ پوپ کو کلیسیہ کے معاملات میں بلا شرکت غیرے کامل اختیارات حاصل ہیں اور ممالک غرب میں حکمرانی کا حق بھی اس کو حاصل ہے۔ زمانۂ حال کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ یہ سب تحریریں جعلی تھیں اور ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ تاریخ کے صحیح واقعات سے کسقدر ناآشنا تھے اسی زمانے کی ایک اور جعلی تحریر "عطیۂ کانس ٹن ٹائن" کے نام سے مشہور ہے اس عجیب غریب کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ شہنشاہ کانس ٹن ٹائن وفادار و رحمدل، قادر و نیک نفس شاہ اقوام المانی، دسرمانی، جرانی و برطانونی، وہونی بارساد خوش نصیب فاتح و غازی و ذی شان مرض جذام میں مبتلا تھا اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہائے بغیر اسے صحت نہیں ہو سکتی مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اسے صحت حاصل ہوئی اور صحت یابی کے شکریئے میں اس نے حکم دیا کہ کلیسیہ روما کا قسیس اعلیٰ تمام دنیا کے

قیسیوں کا سردار ہوگا اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات واقع روما اور خود شہر روما اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب پر قابض رہے گا۔ ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے اسی تحریر پر پوپوں کی دنیاوی حکومت کا دعویٰ مبنی تھا اور پندرھویں صدی تک جب کہ یورپ میں پھر علوم وفنون کا دور دورہ ہوا کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے یا اس کی صحت میں شک لائے۔

یورپ کی نویں صدی کی تاریخ کا تبصرہ ختم کرنے کے قبل ہمیں دنیائے اسلام پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی اتحاد باقی نہ رہا تھا۔ دنیا اسلام میں تین سلطنتیں قائم تھیں خلافت بغداد، خلافت مصر، اور امارت قرطبہ۔ مسلمان اس وقت معراج کمال پر پہنچ رہے تھے، ہسپانیہ میں ان کے تہذیب وتمدن کا بہترین زمانہ تھا مذہبی رواداری کی انھوں نے ایسی بے نظیر مثال قائم کی تھی جس کی تقلید عیسائی ریاستوں میں نہایت مفید ہوئی۔

طلب علم مسلمانوں کا واحد مشغلہ تھا۔ علوم ریاضی، ہئیت اور کیمیا کو انھوں نے وہ ترقی اور جلا دی جس کے یہ علوم ابتک احسانمند ہیں۔ مگر باوجود ان علمی اور تمدنی ترقیوں کے دنیائے اسلام میں وہ اثرات پیدا ہو گئے تھے جو اس کے ضعف کا باعث ہوئے۔ نظام جاگیری مغربی یورپ کی طرح دنیائے اسلام میں بھی قائم ہو چلا تھا اور اس کے علاوہ وراثت کے جھگڑوں، مذہبی نزاعوں اور فوجوں کی خودرائی اور مطلق العنانی کے سبب سے اکثر اسلامی سلطنتیں کمزور ہو چلی تھیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کی طرف سے عالم مسیحی کو جو خطرہ تھا وہ بظاہر رفع ہو رہا تھا مگر دو صدیوں ہی کے بعد دین اسلام اور اس کے ساتھ مسلمانوں کے جوش نے پھر زور پکڑا اور مسیحیت کو اپنے زبردست مخالف کے مقابلے میں اپنی مجموعی قوتیں صرف کر دینی پڑیں۔

بابِ ہفتم

جرمنی کے سیکسن بادشاہ اور سلطنتِ مقدس روما کا قیام

دسویں صدی کی ابتدا میں شارلیمین کی حسنِ تدبیر کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اس کی عظیم الشان سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ تہذیب و تمدن کے جو تخم اس نے بوئے تھے وہ ناپید ہو چکے تھے، وحشی اقوام کے حملوں کی شدت بڑھ رہی تھی گویا یورپ کی پھر وہی حالت ہو گئی تھی جو چوتھی اور پانچویں صدی میں تھی مگر فرق صرف اتنا تھا کہ سلطنتِ روما کی طرح موجودہ سلطنتوں میں ان دشمنوں کے مقابلے کی تاب نہ تھی۔ مگر یہ واقعات صرف سطحی ہیں شارلیمین کے عظیم الشان کارناموں کی یاد اس کی قوم کے دلوں سے فراموش نہیں ہوئی تھی اور اس کے کارہائے نمایاں کی تقلید تمدن و امن و امان کے دوبارہ قائم ہونے کا باعث ہوئی۔ تعجب ہے کہ اس کے جانشین نہ اس کے خاندان سے تھے نہ نسل فرینک کے جرمن بلکہ قوم سیکسن اس کے تخت و تاج پر قابض ہو گئی جو اس کی سخت ترین دشمن تھی اور جس کے مقابلے میں وہ مدت تک معرکہ آرائی میں مصروف رہا۔

اس زمانے میں جرمنی کی مشرقی حد ایلب ندی تھی اور اس کے شرق میں سلاوی اقوام آباد تھیں جن کو نسلاً جرمنوں سے کوئی تعلق نہ تھا ملک جرمنی چھ ریاستوں میں منقسم تھا جنمیں سے ہر ایک میں ایک حد تک قومی احساس موجود تھا یہ چھ ریاستیں سیکسنی، فرینکونیا، تھورنجیا، سوابیا، باویریا، اور لارین کے ناموں سے موسوم تھیں۔

ان میں سے ہر ایک عملاً خود مختار تھی گو عہد نامہ ورڈن کے رو سے شاہ جرمنی کی سیادت تسلیم کرتے تھے مگر اپنے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت جائز نہ رکھتے ۹۱۸ء میں جرمنی کا تاج و تخت خالی تھا اور اس کا کوئی دعویدار بھی نہ تھا۔ وراثت پدری کا طریقہ جاری ہو چکا تھا مگر جرمنی بادشاہی کے متعلق ابھی تک اس طریقۂ جانشینی کا عمل نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی دوسرا طریقۂ عمل تسلیم کیا جاتا تھا۔ لہذا ۹۱۹ء میں باشندگان سیکسنی و فرانکونیا کی ایک مجلس شوریٰ ہوئی جس میں ہنری رئیس سیکسنی کا جرمنی بادشاہی کے لئے انتخاب کیا گیا۔ دوسرے رئیسوں نے بھی بہت جلد اس کا انتخاب منظور کر لیا۔

ظاہر ہے کہ خود مختار رئیسوں کا ساختہ و پرداختہ بادشاہ بن جانا فی نفسہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی تاریخی اہمیت ہو سکتی ہے۔ مگر حالت موجودہ میں اس کا اثر کچھ اور ہی ہوا کیونکہ ایک قابل آدمی کی سیادت تسلیم کر لی گئی تھی جو ایک زبردست اور پُرعزم قوم کا سردار تھا اور اس زمانے سے تین سو برس سے کچھ زیادہ تک جرمنی میں بلحاظ اتحاد و فلاح قومی و قوت مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ ہنری کے دور حکومت میں کوئی خاص بات قابل بیان نہیں بالفاظ دیگر اس کی حکومت اس کے بیٹے اور جانشین کی حکومت کا پیش خیمہ ہے۔

اس نے اپنی تمام قوت اپنے ملک کی سرحدوں کے استحکام میں صرف کر دی قوم نارمن کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا مگر ایلب ندی کے شرق میں جو غیر جرمن اقوام آباد تھے وہ دیسی اقوام کو دبا رہے تھے اس خطرے کو دفع کرنے کیلئے اس نے ایلب ندی کے سواحل پر جرمنی نو آبادیوں کے قیام کے لئے راستہ کھول دیا اور متعدد سلاوی اقوام کو محکوم کر کے شارلیمین کے کام کی تکمیل کی ہنری نے اس خطۂ ملک کو بھی اپنا تابع فرمان کیا جو زمانہ مابعد میں برنیڈنبرگ کے نام سے مشہور ہوا اسی خطہ ملک میں ہوہن زولرن کے خاندان شاہی کا نشو و نما ہوا جسکے افراد ۱۷۰۱ء میں شاہان پرشیا اور ۱۸۷۱ء میں شہنشاہ جرمنی ہوئے اور جنھوں نے جرمنی کی متحدہ قوت کو ایسی ترقی دی جو ہنری کے زبردست خاندان سے ممکن نہ ہو سکی تھی۔ ڈنمارک کے جنوبی حصے پر بھی اس نے قبضہ کر لیا اور دین مسیحی کی وہاں اشاعت کی۔ مگر سب سے زیادہ وقت

اس کو قوم مگیار کے زیر کرنے میں ہوئی جن کے قبضے میں اس وقت ڈینیوب ندی کے وسطی اضلاع تھے اور ان کے جوق کے جوق نہ صرف مشرقی جرمنی بلکہ ملک کے وسط تک تاخت و تاراج کرتے چلے آتے تھے۔ ان کا قلع قمع کرنے کے لئے ہنری نے دو طریقے اختیار کئے ایک تو جن راستوں سے وہ حملہ کرتے تھے ان پر مستحکم قلعہ پوش شہر بسا دیئے اڑبانیا سواروں کے دستے ان لٹیروں کے تعاقب کے لئے مقرر کئے ۹۳۳ء میں اس کی طویل تیاریاں بار آور ہوئیں اور قوم مگیار کو شکست فاش ہوئی۔ جرمنی کے اندرونی معاملات میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش تھی کہ دوسرے رئیسوں کو ہموار رکھے تاکہ وہ اس کی سیادت کو تسلیم کرتے رہیں۔ اس لئے وہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا کہ گویا وہ خود مختار بادشاہ ہیں اس طرح ملک جرمنی بجائے ایک متحد ریاست کے متعدد ریاستوں کا اتحاد تھا۔ ۹۳۶ء میں اس نے انتقال کیا مگر اپنے دور حکومت میں بہت کچھ کر گیا۔

اس کا جانشین اس کا بیٹا آٹو اول (یا آٹو اعظم) تخت جرمنی کا مالک ہوا اور اپنے باپ کے اصول پر چلتا رہا۔ اس نے ملک جرمنی کی حفاظت اور تنظیم میں سعی بلیغ کی۔ بادشاہی کی قوت کو بہت بڑھایا اور پھر شارلیمین کی تقلید میں تاج شہنشاہی کا دعویدار ہوا۔ جرمن آبادکاروں اور افواج کو وہ ایلب ندی کے شرق میں بڑھاتا گیا میگڈیبرگ کی بشپ رک اسی نے قائم کی جو اضلاع مفتوحہ کا نہ صرف مذہبی مرکز تھا بلکہ ایلب ندی کے راستہ کی حفاظت بھی اس کے قیام سے مقصود تھی۔ سرحدی اضلاع میں اس نے خاص قسم کی حکومتیں قائم کیں جو مغرب میں پلاٹینیٹ کے نام سے موسوم تھیں اور مشرق میں "مارک" کے نام سے۔ شرق میں اس نے شمالی مارک اور مشرقی مارک قائم کئے اور جنوب میں باویریا کا "مشرقی مارک" جو بعد میں آسٹریا کے نام سے مشہور ہوا۔ اطالیہ میں سے ویرونا کا مارک قائم کیا۔ ان سرحدی صوبہ جات میں حکام کو زیادہ اقتدار اور اختیارات دیئے گئے تھے جو ان کے ہم درجہ حکام کو جرمنی کے متمدنہ حصّہ میں حاصل نہ تھے۔ قوم مگیار سے اس سے بھی جنگ کا سلسلہ قائم رہا۔ ۹۴۹ء میں مگیار ڈینیوب کو عبور کرکے جرمنی میں حملہ آور ہوئے مگر آٹو نے ان کے ٹڈی دل کو بمقام لیخ فیلڈ (قریب آگسبرگ) روکا اور ان کو ایسی شکست فاش دی کہ آئندہ

سے وسطی یورپ ان کے حملوں کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔ اس شکست کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم گمیار لوٹ مار کرنے کے بجائے ڈینوب کے وسطی حصے کی زمینوں پر آباد ہو گئی ان کی سلطنت ملک ہنگری کے نام سے مشہور ہوئی۔

آٹو کو بہ مقابلہ اپنے باپ کے جرمنی کے رئیسوں کے ساتھ زیادہ مشکلات کا سابقہ ہوا اس کو ایک حد تک اس کوشش میں کامیابی ہوئی کہ اپنے اعزہ کو ان کے مقبوضات پر قابض کرادے یا اپنی خاندان کی شاہزادیوں کا ان سے نکاح کر دے مگر ان تدابیر کے باوجود یہ امرا اپنی وفاداری پر قائم نہ رہے اور آٹو کو ان کی سرکوبی کے لئے ان پر کئی مرتبہ لشکر کشی کی ضرورت ہوئی کیونکہ امراء اپنے آپ کو خود مختار بادشاہ تصور کرتے تھے اور آٹو اپنی سلطنت کے حکام سے زیادہ ان کی وقعت نہ کرتا تھا آٹو ان کی گوشمالی برابر کرتا رہا مگر اُن کی ہمتیں پست نہیں ہوئیں اور قرون وسطیٰ میں بادشاہوں اور امراء کے قضیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

امرائے عظام کی شورہ پشتی سے تنگ آکر آٹو پادریوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو اپنا معتمد علیہ بنایا کیونکہ جرمنی میں یہی ایک تعلیم یافتہ طبقہ تھا اور چونکہ پادری تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے اس لئے ان سے یہ خوف نہ تھا کہ اپنے خاندانوں کے بقا کے لئے امراء کی طرح بغاوت پر آمادہ ہو نگے۔ یورپ کی حالت اس زمانے میں نہایت نازک اور مخدوش تھی اس لئے بادشاہ کو اختیار تھا کہ جس کو چاہے بشپ یا کلیسیہ کا اعلیٰ عہدہ دار کر دے۔ جتنا جتنا اس کا زمانہ گزرتا گیا وہ اعلیٰ درجے کے پادریوں کو ملکی خدمات پر مقرر کرتا گیا اور اس زمانے سے جرمنی کے بشپ مذہبی فرائض ادا کرنے کے بجائے مالگزاری وصول کرنے، مقدمات طے کرنے، فوج کی تنظیم و ترتیب اور دیگر انتظامی معاملات میں مصروف ہو گئے کلیسیہ اور جرمانیہ بادشاہت کے ان مضبوط تعلقات سے آٹو اطالیہ کی پاپائیت کی طرف متوجہ ہوا اور اب ہم کو بھی اس ملک سے متوجہ ہونا چاہئے۔

اطالیہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی وہاں صرف امن و امان کے قیام کی ضرورت تھی اور یہ اگر ہوتا تو اطالیہ یورپ کا سب سے زیادہ مرفہ الحال اور ترقی یافتہ ملک ہوتا۔ مگر امن و امان عنقا تھا اور صدیوں تک اطالیہ کی یہی حالت رہی شمال میں ایک برائے نام شاہ اطالیہ تھا جو شاہ لیمین کی جنوبی سلطنت کا وارث تھا مگر تمام ملک اسکے زیر حکومت نہ تھا شمالی حصۂ ملک میں قوم گمیار کی

لوٹ مار سے آئے دن مصیبت رہتی تھی۔ وسطی حصّے پر اس صدی کی ابتدا میں تیس سال تک مسلمانوں کا مستقل قبضہ رہا اور یوں بھی مسلمان لوٹ مار کرتے رہتے تھے شہنشاہان قسطنطنیہ کے قبضے میں چند محفوظ مقامات تھے مگر تمام ملک مسلمان بحری حملہ آوروں کی دست برد سے ابتری کی حالت میں تھا۔ اطالیہ میں اس کے قبل بھی طوائف الملوکی کا زور رہا ہے مگر اس کا نعم البدل پاپائے روما کی قوت کے استحکام اور رعایا کی خیر اندیشی سے ہوجاتا تھا مگر دسویں صدی کی ابتدا میں پوپ کے دربار میں نہ صرف یہی ایک طوفان بدتمیزی کا عالم تھا بلکہ ان کی تاریخ کا یہ نہایت تاریک دور تھا شہر روما مختلف جماعتوں کی رقابتوں کا شکار ہو رہا تھا اور ہر جماعت پوپ کے ذریعے سے اپنا کام نکالنا چاہتی تھی اس زمانے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ روما کے سیاسی اور مذہبی معاملات میں چند عالی مرتبت خواتین کو خاص دخل حاصل ہوگیا تھا اس کی وجہ سے ایک ناقابل یقین روایت مشہور ہوگئی ہے کہ پاپائی کے منصب جلیلہ پر ایک عورت بھی سرفراز ہو چکی ہے۔

پاپائے روما کے دربار کی ان لغویتوں سے آٹو کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ چونکہ اس نے اپنی سلطنت کے انتظام کا بیشتر حصہ پادریوں کے سپرد کر دیا تھا کلیسیہ ہی کے مرکز میں ان خرابیوں کا پیدا ہو جانا اُس کے مفاد کے منافی تھا اور نہ وہ کلیسیہ میں کسی ایسے شخص کی حکمرانی پسند کر سکتا تھا جو صاحب قوت ہونے کے ساتھ جرمنی کا مخالف ہو اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر روما میں اس کا رسوخ۔ اقتدار قائم ہو جائے تو اس کے ملک کے پادری ہمیشہ کے لئے اس سے دبے رہیں گے اور مینز کے آرچ بشپ کی طرح کبھی اس کی مخالفت پر آمادہ نہ رہیں گے۔ ان وجوہ سے جرمنی بادشاہوں نے اطالیہ کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا جس سے زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ میں چند نہایت دلچسپ ابواب کا اضافہ ہوا۔ مگر آٹو جب پہلی مرتبہ اطالیہ پر حملہ آور ہوا تو پاپائے روما سے اسے کوئی سروکار نہ تھا اطالیہ کے آخری بادشاہ لوتھیر کی ایک بیوہ ایڈیلیڈ تھی اور اس کی جانشین بریینگر کی خواہش تھی کہ اس بیوہ کا اپنے بیٹے سے نکاح کر دے۔ مگر ایڈیلیڈ کو یہ تعلق ناگوار تھا اور اس سے بچنے کے لئے اس نے آٹو سے امداد کی درخواست کی۔ آٹو اطالیہ پر حملہ کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا اس نے ایڈیلیڈ کی درخواست کو منظور کر لیا اور کسی دشواری کے

بغیر اطالیہ کے تاج و تخت پر قابض ہو گیا شاہ برنیگر کے ساتھ اس نے زیادہ سختی نہیں کی بلکہ اپنا نائب بنالیا اور خود بمقام اطالیہ تاج شاہی اپنے سر پر رکھکر ایڈیلیڈ کو اپنی زوجیت میں لے آیا مگر اطالیہ کا تاجدار ہو جانے سے وہ پوپ کا ہمسایہ ہو گیا اور شہر روما کے معاملات میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

سنہ ۹۶۲ء میں اسے روما کے معاملات میں بھی دخل دینے کا موقع مل گیا پاپ جان دوازدہم سے بیرنگار سے سخت بگاڑ تھا اور شہر روما کی مختلف پارٹیاں اسے یوں بھی پریشان کئے ہوئے تھیں پوپ پر بھی بد اعمالی اور عیاشی کا الزام تھا مگر اس نے آٹو سے اپنے دشمنوں سے بچانے کے لئے امداد کی درخواست کی اور آٹو نے اس کے حسب الحکم آکر روما پر بلا کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا اور پوپ کا اقتدار دوبارہ قائم کرادیا۔ ناظرین اب آٹو شاہ جرمنی اور شارلیمین کی حالت کا مقابلہ کریں۔ دونوں اپنے زمانے کے قوی ترین بادشاہ تھے اور دونوں نے یورپ کے غیر مسیحی دشمنوں کے خلاف کامیابی حاصل کی تھی اور دونوں نے کلیسہ کی ترقی اور اس کی قوت کے استحکام میں سعی بلیغ کی تھی اس لئے آٹو کو بھی بارگارہ پاپائی سے وہی صلہ ملا جو شارلیمین کو ۱۶۲ سال قبل ملا تھا۔ ۲ فروری سنہ ۹۶۲ء کو تاج شہنشاہی آٹو کے سر پر رکھا گیا جس سے گویا شارلیمین کی شہنشاہی یورپ میں دوبارہ قائم ہو گئی۔ دونوں شہنشاہوں کی حالت ایک حد تک مشابہ تھی مگر ایک نمایاں فرق بھی تھا۔ شارلیمین کی سلطنت متفرق اجزا پر مشتمل تھی۔ وہ خود تو جرمن تھا مگر اس کی حکومت فرانس، برگنڈی، ہسپانیہ اور اطالیہ پر تھی۔ برخلاف اس کے آٹو اطالیہ پر حملہ آور ہونے کے قبل صرف جرمنی کا بادشاہ تھا اور اس کی رعایا خالص جرمنی تھی۔ ان وجوہ سے تاج شہنشاہی کا وہ اس قدر مستحق نہ تھا جتنا کہ شارلیمین اور اس کے اس فعل سے اس کے جانشینوں کے لئے خطرناک نتائج مترتب ہوئے۔ اگر اس خاندان کے بادشاہ اپنی حکومت جرمنی تک محدود رکھتے تو اغلباً ان کی حکومت قوی اور مستحکم ہوتی مگر اطالیہ کے تعلقات اور منصب جلیلہ شہنشاہی کے گوناگوں مشاغل سے اطالیہ اور پاپائیت کے آئے دن کے جھگڑوں میں منہمک رہنا پڑا جس سے وہ اپنے اصلی کام یعنی سلطنت جرمنی کے استحکام کی طرف متوجہ نہ ہو سکے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک جرمنی کو متحد نہ رکھ سکے اور شہنشاہی بھی کچھ روز کے بعد برائے نام رہ گئی۔

مگر جن خطرات کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کا تعلق مستقبل بعید سے ہے تاجپوشی کے بعد ہی اطالیہ میں مشکلات پیدا ہونے لگے خود پوپ جس پر آٹو کے احسانات کا بار گراں تھا یہ احسانات بھول گیا اور اس کی مخالفت کرنے لگا۔ مگر آٹو نے اس کو تخت پاپائی سے اتار دیا اور دوسرا شخص مقرر کیا گیا۔ اہل روما سے آٹو نے احتیاطاً یہ قسم لے لی کہ وہ کسی ایسے پوپ کو تسلیم نہ کرینگے جس کا تقرر شہنشاہ کے ایماء سے نہوا ہو۔ مگر عہد شکنی رومیوں کی خمیر میں ملی ہوئی تھی اور آٹو کو بدقت بسیار یہ معلوم ہوا کہ روما اور اطالیہ کی حکومت اسے آئے دن کے جھگڑوں میں مبتلا رکھے گی۔ آٹو نے ۹۷۳ء میں جرمنی میں انتقال کیا۔

اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا آٹو ثانی اور اس کا پوتا آٹو ثالث اس کے جانشین ہوئے مگر ان کے عہد سلطنت میں کوئی خاص امر قابل تحریر نہیں لیکن وہ خطرات جو شہنشاہت کے لئے مہلک ثابت ہوئے پیدا ہو چلے تھے آٹو ثانی کے دور حکومت میں اطالیہ کے تعلق سے جو نقصان تھا وہ بھی ظاہر ہونے لگا تھا مسلمانوں نے جنوبی اطالیہ پر حملہ کیا۔ آٹو ثانی نے ابتداءً کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا مگر آخر میں سخت ناکامی ہوئی اور اس اثناء میں جب کہ وہ ایک غیر ملک کی محافظت میں مصروف تھا خود اس کے ملک پر مشرق کے بت پرست وحشیوں نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ اس کے جانشین آٹو ثالث کے دور حکومت میں بھی اطالیہ کا اثر غالب تھا۔ یہ شہنشاہ عجیب خواص کا انسان تھا۔ اس کی ماں قسطنطنیہ کے خاندان شاہی سے تعلق رکھتی تھی اور اسی سے غالباً اس نے حکمرانی کے وہ طریقے سیکھ کر جاری کئے جو جرمن طبائع کے لئے باعث تنفر تھے آٹو پر ایک پادری کی تعلیم کا بھی بہت اثر پڑا تھا جو بعد میں سلوسٹر ثانی کے نام سے سریر پاپائی پر متمکن ہوا اس پادری اور اپنی ماں کی تعلیم سے آٹو کو ایک زبردست مرکزی حکومت کی قسطنطنیہ کے طرز پر قائم کرنے کا حوصلہ ہوا جو جرمن طرز حکومت کے بالکل متضاد تھی۔ ان تجاویز کو بروئے کار لانے کے لئے وہ شہر روما میں ایک عالیشان محل میں اقامت گزیں ہوا اور مشرقی درباروں کے آداب و طریق کی سختی کے ساتھ پابندی کرنے لگا۔

مگر اس کے طرز عمل سے نہ جرمنی خوش ہوئے اور نہ رومی اور آخر کار رعایا کی بغاوت سے وہ روما سے بے سروپا بھاگ کھڑا ہوا اگر وہ زندہ رہتا تو اسکو مزید ناکامیوں کا خوگر ہونا پڑتا مگر دست اجل نے سنہ ۱۰۰۲ء میں اس کا خاتمہ کردیا اس جگہ یہ ذکر کردینا مناسب ہوگا کہ جرمنی کی شرقی سرحد پر دو زبردست ریاستیں قائم ہوگئیں تھیں جو زمانۂ مابعد میں ملک جرمنی سے اکثر برسرپرخاش تھیں ایک تو سلطنت پولینڈ تھی جس کا خودمختارانہ قیام پوپ کی امداد سے عمل میں آیا تھا اور اس کے جنوب میں قوم مگیار نے مذہب مسیحی قبول کر کے ملک ہنگری میں مستقل حکومت قائم کرلی اس طرح جرمنی کو اب سرحد شرقی پر وحشیوں کی لوٹ مار کرنے والی جماعتوں سے سابقہ نہ تھا بلکہ دو سلطنتوں سے جن کی اہمیت اور قوت روزافزوں ترقی پر تھی اس زمانہ کے لوگوں اور خود شہنشاہ کی اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی کی ایک مثال قابل اندراج ہے۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں عموماً جاگزیں ہوگیا تھا کہ سنہ ۱۰۰۰ء میں یا تو دنیا کا خاتمہ ہوجائے گا یا اُس کی صورت بالکل مسخ ہوجائے گی اس سال کے شروع ہونے کے قبل ہی سے تعمیر امکنہ بالکل مسدود ہوگئی، کھیتوں کی کاشت بند ہوگئی گویا دنیا کا تمام کاروبار رک گیا مگر جب قیامت نہ آئی تو پھر گرجوں کی تعمیر شروع ہوگئی اور عالم مسیحی میں پھر عقل سلیم کے مطابق لوگ عمل کرنے لگے۔

باب ہشتم

شہنشاہی اور پاپائیت کے معرکہ کا آغاز

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت تک پوپ اور شہنشاہ ایک دوسرے کے ممد و معاون تھے مگر اب ان اختلافات کا سلسلہ شروع ہونے کو ہے جن سے اطالیہ و جرمنی ہر دو ممالک میں ابتری پیدا ہوئی۔ ان دونوں قوتوں کی باہمی رقابت کا سلسلہ ہم کو زمانۂ وسطےٰ کی ساری تاریخ سے واقف کر دے گا اب ہم بیان کرینگے کہ اس معرکۂ عظیم کے قبل دونوں ممالک کی سیاسی حالت کیا تھی۔

جن وجوہات سے شاہانِ جرمنی نے اطالیہ کے حصۂ کثیر کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا اور جس بنا پر انھوں نے تاج شہنشاہی کا دعوےٰ کیا تھا اس کا مفصل تذکرہ آچکا ہے ان کے اس فعل کو حرص جہاں بانی یا بلندحوصلگی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ روما میں اپنا اقتدار قائم کرنے سے انھوں نے ایک گونہ پاپائیت اور جرمنی دونوں کی خدمت کی تھی مگر اطالیہ اور جرمنی کا تعلق ابتدا ہی سے مشکلات سے خالی نہ تھا اور مرور زمانہ سے اُن مشکلات کا حل اور بھی دشوار ہوتا گیا کیونکہ ان دونوں ممالک کے قدیم تاریخی روایات اور موجودہ تمدنی حالات میں بُعدِ عظیم تھا۔ جرمنی میں رومی حکومت کا قیام نہایت قلیل زمانہ تک رہا اور اس کے طرز حکومت و نظام حکومت سے قدیم روما کے اثرات بالکل مٹ گئے تھے جاگیریت کی جڑیں جرمنی میں نہایت مضبوط ہو گئی تھیں اور اسی پر اُس کے سارے تمدن و سیاست کی بنیاد تھی۔

برخلاف اس کے ملک اطالیہ قرون اولیٰ سے رومی تہذیب و حکومت کا مرکز تھا اس ملک کی زبان اور اس کا تمدن سب روما کے مرہون منت تھے۔ اطالیہ کے تمدن کے ہر شعبے پر قدیم روما کا اثر باقی تھا خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں جن کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور ان کے باشندے خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگے تھے۔ اطالیہ میں بھی جاگیریت کا اثر پیدا ہو چلا تھا مگر اس شدت کے ساتھ نہیں جیسے کہ جرمنی میں جرمنی کے حکام بادشاہوں یا شہنشاہ طبعاً کلیسیئے سے مل کر کام کرنے کے عادی تھے۔ برخلاف اس کے اطالیہ میں گو ان بادشاہوں نے پاپائیت کی آڑے وقتوں میں دستگیری کی تھی مگر اس کے ساتھ دوستانہ اور مفید تعلقات پیدا کرنا دشوار تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلیسیۂ کاتھولک کے سردار ہونے کے علاوہ پاپائے روما کی اطاعت میں سلطنت بھی تھی اور پوپوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دینی اور دنیاوی ہر دو امور میں شہنشاہی کے اثر اور دباؤ سے آزاد رہیں۔ مرور زمانہ کے ساتھ یہ کشیدگی بھی بڑھتی چلی گئی اور پوپ جب اپنے نظام حکومت یا قوت میں استحکام پیدا کرنا چاہتے تو شہنشاہی کا مقابلہ لازمی ہو جاتا مزید برآں اہل اطالیہ کو جرمنوں کی محکومی ناگوار تھی۔ یہ صحیح ہے کہ گیارھویں صدی میں قومی احساس پیدا نہیں ہوا تھا اور اس زمانے کے نظام تمدن میں بین الاقوامیت اس قدر رہی کہ زمانہ حال میں ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ گو اس زمانے میں نہ کوئی خاص اطالی قوم تھی نہ جرمنی قوم مگر باوجود اس کے اطالیوں کو اپنے درمیان میں غیر ملکی حکام اور سپاہیوں کا قیام ناگوار تھا جن کی زبان جن کے طبائع اور جن کا تمدن ان سے مختلف اور متضاد تھا۔ مخالفت کے یہی تخم تھے جن سے شہنشاہوں اور پوپوں کے درمیان ایک معرکۂ عظیم پیدا ہو گیا جو دو صدیوں تک یورپ کی تاریخ میں پیش نظر رہیگا۔

آٹو ثالث کی موت کے بعد سلطنت جرمنی اور شہنشاہی مقدس روما ہر دو کی عنان حکومت یکے بعد دیگرے ہنری ثانی کانراڈ ثانی اور ہنری ثالث کے ہاتھوں میں رہی۔ جرمنی میں خاموشی تھی۔ امرائے عظام کے ساتھ چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی اور بادشاہ ان کو دبانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کا مفصل ذکر غیر ضروری ہے۔ ان سے زیادہ اہم یہ واقعہ ہے کہ ۱۰۰۶ء میں ملک برگنڈی شہنشاہی قبضہ میں آ گیا اور ہنری ثانی کے جانشینوں نے اس کا انتظام اس طرح کیا کہ ایلپس کے سلسلۂ کوہ کے مغربی درے ان کے قبضے میں رہیں تاکہ

اطالیہ میں ان کی افواج کے داخل ہونے میں کوئی زحمت نہ ہو۔ ان بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی اطالیہ میں مشکلات کا سلسلہ جاری تھا۔ ان بادشاہوں کا فرض تھا کہ ملک جرمنی کو متحد رکھیں اور اس کی قوت کو استحکام بخشیں مگر یہ مفید اور ضروری کام چھوڑ کر ان کو بار بار اطالیہ کے لاطائل معاملات میں دخل دینا پڑتا تھا جن کے حل کرنے سے وہ مجبور تھے ان کی حکومت کا تذکرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر روما کی مختلف جماعتوں کے باہمی نزاعات میں وہ بار بار دخل دیتے تھے اور جنوبی اطالیہ کی مختلف العناصر آبادی پر اپنا سکہ جمانے کے لئے فوج کشی کرتے رہے۔ مگر یہ سب معاملات گویا آنے والے معرکۂ عظیم کے پیش خیمے تھے اور اس لئے ان کا تفصیل سے بیان کرنا غیر ضروری ہے۔

اس اثناء میں اطالیہ میں جدید سیاسی عناصر وجود میں آرہے تھے۔ اطالیہ کے بلدیات کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ یعنی شہروں کی اپنی آزادانہ حکومت کی ابتدا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ بلدیات مذکور کو دوسری اور تیسری صدیوں کی عالیشان شہری بستیوں سے براہ راست کوئی تعلق تھا یا نہیں کیونکہ اطالیہ کے شہروں کا نظام بلدی صوبوں کی ابتری اور طوائف الملوکی کی وجہ سے ضعیف ہو گیا تھا اور ان میں جو جدید روح پیدا ہو گئی تھی وہ ان کے باشندوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بلدیات مذکور میں سے مائیلن، لوڈینا، ویرونا، فلارنس، پیسا اور جینوا نے خاص سیاسی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ یہ شہر جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر شمال میں تھے۔ اطالیہ کے وسط میں پاپایان روما کی روز افزوں قوت اور ان کی مخالفت سے بلدیات کو فروغ حاصل ہونا دشوار تھا۔ علیٰ ہذا جنوب میں بھی بلدیات کو اہل نارمن کے طاقت پکڑ لینے سے زیادہ فروغ نہیں ہوا۔ قوم مذکور کے اطالیہ میں وارد ہونے سے قبل ہی جنوبی اطالیہ میں مختلف اقوام آباد تھے اور ہر ایک اپنی سیادت قائم کرنے کی فکر میں تھا۔ شاہان قسطنطنیہ کا اب بھی چند بڑے بڑے ساحلی مقامات پر قبضہ باقی تھا اور ان کے یونانی سپہ سالار اکثر اپنی فوجوں کے ساتھ اس خطۂ ملک میں وارد ہوا کرتے تھے قوم لامبارڈ کی اسپولیٹو اور بینوونٹو میں دو زبردست ریاستیں تھیں، مسلمان سسلی پر قابض تھے اور سرزمین اطالیہ پر نہ صرف اکثر یورشیں کرتے رہتے بلکہ تعداد کثیر میں آباد بھی ہو گئے تھے۔ مگر باشندوں کی تعداد غالب اطالوی تھی اور چونکہ بار بار وہ تبدیل حکومت سے پریشان تھے اس لئے وہ تیار تھے کہ جو قوت امن وامان کی ضامن ہو سکے اس کی امداد کو بسر و چشم ۱۰۱۶ء

میں قوم نارمن کے افراد سرزمین اطالیہ میں بار اول وارد ہوئے اس زمانے میں فرانس میں
بسین ندی کے سواحل پر آباد ہو کر انھوں نے نارمنڈی کی زبردست سلطنت قائم کر دی تھی
پچاس سال کے بعد وہ انگلستان پر حکمراں ہو گئے اور اس زمانے میں ان کے گروہ کے گروہ
ممالک بحر روم میں فلسطین کے مقامات مقدسہ کی زیارت اور لوٹ مار کی غرض سے وارد ہو رہے
تھے اطالیہ میں جو نارمن ۱۰۱۶ء میں آئے وہ بیت المقدس کو زیارت کی غرض سے گئے تھے
مگر جنگ وجدال ان کے خمیر میں تھی لہذا انھوں نے جنوبی اطالیہ کے مناقشات میں نہایت
شوق سے حصہ لیا۔ ان کی امداد غنیمت خیال کی گئی اور ان کی فوجوں کو اول اول فتح نصیب
ہوئی گو یہ دائمی نہ تھی مگر فتح اور شکست ان کے لئے دونوں برابر تھیں، اطالیہ کی دولت و
ثروت اور لوٹ مار کے بیشمار مواقع کی خبریں نارمنڈی پہنچ چکی تھیں اور وہاں سے نارمنوں
کے گروہ کے گروہ اپنے اہل ملک کی امداد اور اپنی ذاتی منفعت کے لئے آنے لگے ۱۰۴۶ء میں
رابرٹ گوسکارڈ ابن ٹانکریڈ اطالیہ میں وارد ہوا جس کا قوم نارمن کی تاریخ میں ولیم فاتح
انگلستان کے بعد درجہ ہے۔ کچھ روز تک تو تفرقہ پر اس کا دار و مدار رہا، کبھی ایک فریق کی
حمایت میں لڑتا، کبھی دوسرے کی۔ مگر اس کی قوم کی دست درازیوں سے آخر کار مقامی باشندے
تنگ آگئے اور جملہ فریق ان کے اخراج پر آمادہ ہو گئے۔ پوپ لیو نہم کی فوجیں یونانیوں
اور اہل لمبارڈ کی امداد کے لئے پہونچ گئیں اور قریب تھا کہ نارمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔
مگر ان کی قسمت نے یاوری کی اہل ملک کی ایک جماعت کو ان کے ساتھ ہمدردی تھی۔
ان کے دشمن کو اپنی قوت پر غرہ تھا اور ان کی جرأت اور بہادری میں کوئی کلام نہ تھا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کیویٹاٹے (Civitate) میں ان کے دشمنوں کو شکست فاش
ہوئی اور کچھ روز کے بعد خود پوپ ان کا اسیر ہو گیا۔ مگر اس جنگ کا نتیجہ عجیب و غریب
اور بعید از قیاس ہوا اہل نارمن مذہب کے پابند تھے اور پوپ کے ساتھ انھیں خاص
عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنے اسیر پوپ لیو کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور چونکہ ان
کو مسیحی کلیسا کے ساتھ خاص عقیدت تھی لہذا پوپ نے ان سے معقول شرائط پر صلح
کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے سے تیرھویں صدی تک اہل نارمن کا شمار پوپ کے
حلیفوں میں تھا۔ ۱۰۵۹ء میں پوپ نے رابرٹ گوسکارڈ کو اپنے زیر عاطفت اپولیا اور
کالابریا کا ڈیوک مقرر کر دیا اور جزیرہ سسلی بھی اس کو اس شرط پر بخش دیا کہ جزیرہ کو

کو مسلمانوں کے قبضے سے نکال لے۔ ۱۰۶۲ء میں سسلی بھی متعدد معرکہ آرائیوں کے بعد ان کے قبضے میں آ گیا۔ کیونکہ اس خطۂ ملک میں مسلمانوں کی فوجی قوت روبہ انحطاط تھی نارمنوں کو سسلی پر قبضہ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ سسلی اور جنوبی اطالیہ میں انھوں نے ایک مضبوط اور استوار حکومت قائم کر لی صدیوں کی ویرانی اور بربادی کے بعد اس ملک کو سرسبزی اور خوشحالی نصیب ہوئی۔ علوم و فنون کو فروغ ہوا، خوشنما عمارتوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ مگر چونکہ ان کی حکومت شخصی تھی اس لئے ان کے زیر سایہ بلدیات کے فروغ کا بہت کم موقع تھا۔

اس ملک کے شمال میں ریاست ٹسکنی تھی۔ اس کا رقبہ نہایت وسیع تھا اور اسلئے اطالیہ کے سیاسیات میں اس کی خاص اہمیت تھی۔ اس ریاست کا کاؤنٹ بانی فینس شہنشاہ کے معاونین میں سے تھا اور اسی کی عنایت سے بانی فیس کو کئی بڑے بڑے شہر مثلاً مینٹوا، فیرارا، برشیا اور موڈینا مل گئے تھے۔ مقبوضات مذکور کی وجہ سے وسطی اطالیہ میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ اس کے انتقال کے بعد (۱۰۶۹ء) میں اسکی بیٹی مٹلڈا ارئیسہ ٹسکنی اس کی وارث ہوئی جس کی شادی گاڈ فری رئیس لارین سے ہوئی مگر یہ دونوں لاولد تھے اور کلیسہ اور پوپ کے معتقدین خاص میں تھے اس وجہ سے جب پوپوں اور شہنشاہوں میں نزاع ہوئی تو ان دونوں نے افواج و زر ومال سے پوپ کی امداد کی۔

اب ہم پوپوں کی حالت پر ایک نظر ڈالیں گے قیام شہنشاہی سے روما کے اندرونی معاملات میں ایک حد تک اصلاح ہو چکی تھی مگر اب بھی مزید اصلاحات کی ضرورت باقی تھی۔ شمالی اطالیہ میں پوپ کا اقتدار تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ کائیلین اور راوینا کے (اسقف) بھی پوپ کے مساوی ہونے کا دعوی رکھتے تھے۔ خود روما میں آئے دن شر منا جھگڑے ہوا کرتے۔ پوپوں کو شہر روما کے حکام کے ساتھ کبھی قابل اطمینان تعلقات قائم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی کیونکہ حکام مقامی گو اس بات کو خوب جانتے تھے کہ شہر روما کو جو کچھ اہمیت ہے وہ پوپ کے قیام سے ہے مگر پوپ کی حکومت انکو ناگوار تھی۔ اس وجہ سے حکام بلدی و حکام کلیسہ میں ہمیشہ ناچاقی رہتی جس کا دفعیہ مشکل تھا۔ پوپوں کے انتخاب کا بھی کوئی معین طریقہ نہ تھا۔ شہنشاہ اور پادریوں کے علاوہ امراء و عوام شہر روما دعویدار تھے کہ ان کو

انتخاب کا حق ہونا چاہئے مگر ہر ایک کا کس قدر حصہ انتخاب میں ہونا چاہئے اس کا کبھی تصفیہ نہیں ہوا
عہد زیر تذکرہ کے پوپوں کے متعلق بہت سے ناقابل اعتبار روایات مشہور ہو گئے ہیں مگر جن
روایات کی تحقیق ہو چکی ہے وہ بھی عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً بینی ڈکٹ نہم بارہ سال کی عمر میں
پوپ منتخب ہوا، اس کی اخلاقی حالت نہایت شرمناک تھی اور آخر کار سالانہ وظیفے کی شرط پر وہ
اس منصب مقدس سے علٰحدہ ہو گیا۔ شہنشاہ ہنری ثالث کو تین دعویداروں کے حقوق کے
تصفیے کے لئے مداخلت کرنی پڑی۔ اس نے حکمت عملی سے ان تینوں دعویداروں کو بالائے
طاق کر دیا اور ایک جرمن کلیمنٹ ثانی کو پوپ منتخب کرا دیا جس سے کچھ اصلاح ہوئی۔
اس کے بعد دوسرے جرمن پوپ بھی ہوئے اور یہ عہدہ شرمناک بدنامیوں سے بچا رہا۔ مگر
جب تک خدمت پاپائی کے انتخاب کا مسئلہ غیر تصفیہ شدہ تھا کلیسیہ کے اندرونی انتظامات
کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں کلیسیۂ کاتولیک بہ حیثیت
مجموعی ترقی کن حالت میں تھا، اس کا نظام قوت پکڑتا جا رہا تھا اور یورپ میں اس کی
وقعت بڑھتی جاتی تھی۔ روما میں مختلف جماعتوں کی باہمی حسد و منافرت سے سخت ابتری
تھی۔ روما کی حالات دیکھ کر حقیقی اصلاح کی بہت کم امید ہو سکتی تھی مگر اس موقع پر بھی جیسے
کہ دیگر مواقع پر ہوا تھا رہبانیت نے کلیسیۂ مسیحی کی آبرو رکھ لی۔

راہبان مسیحی کی جماعت میں ایک جدید تحریک اسی زمانے میں پیدا ہوئی تھی۔
جس کا مرکز مقام کلونی واقع برگنڈی تھا سینٹ بی نی ڈکٹ نے جن مقاصد سے رہبانیت
کو رواج دیا تھا وہ پس پشت پڑتے جاتے تھے اور راہبوں کو زہد و تقوے کی زندگی گراں
گزرنے لگی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ خانقاہ نشین راہبوں کی حالت اس زمانے میں
افسوسناک ہو گئی تھی رہبانیت کی تاریخ میں ایسے دور اکثر گزرے ہیں۔ یعنی انحطاط
کے آثار کے بعد اس کے اصلی مقاصد کا احیاء اکثر ہوا ہے۔ کلونی سے جو تحریک شروع ہوئی
اس کا مقصود بھی رہبانیت کے اصول و مقاصد کا احیاء تھا اور سینٹ بینی ڈکٹ کے قائم کردہ
اصول سے سرِ مو اختلاف نہیں کیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس تحریک کی وجہ سے رہبانیت
میں ایک جدید روح اور سرگرمی پیدا ہو گئی اور اس کا اندرونی انتظام بھی کچھ متغیر ہو گیا
تھا اس سے خانقاہوں کو اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی اور دوسری خانقاہوں سے کوئی
تعلق نہ تھا۔ مگر برخلاف اس کے جن خانقاہوں کا تعلق کلونی سے تھا ان کے تعلقات

ایک دوسرے سے مستحکم تھے۔ ہر خانقاہ کا صدر ایک پر اثر تھا جس کا تقرر کلونی کا ایبٹ (سجادہ نشین) کرتا۔ اس طرح یہ امید تھی کہ ایک خانقاہ کی غفلت کا دفعیہ دوسری خانقاہ کی سرگرمی سے ہو جائے گا۔ تحریک مذکور میں شاہی حکومت کے آثار موجود تھے جن کا اثر بہت جلد نظامِ کلیسیہ میں بھی نمودار ہونے لگا۔ اس تحریک کی شہرت اور اثر کا اصل بانی ایک راہب مسمی ہلڈیبرانڈ ہے جو کچھ روز کے بعد بنام گیریگوری ہفتم مسندِ پاپائی پر متمکن ہوا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی مذہبی تاریخ میں اس سے زیادہ سربرآوردہ کوئی شخص نہیں ہے۔ روما میں اولاً وہ پوپ لیو نہم کے معتمد کی حیثیت سے وارد ہوا اور اسی زمانہ سے ۱۰۸۵ء تک مذہبی معاملات میں اس کا اثر غالب تھا۔ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلیسیہ کی آزادی کو تسلیم کرا دے۔ مقصد مذکور کے حصول میں دو موانع تھے اولاً یعنی دنیاوی حکومت کو پادریوں کے تقرر اور ان کی افعال کی نگرانی کا اختیار تھا ثانیاً پادریوں کی اخلاقی حالت قابلِ اعتراض تھی، ان میں سے اکثر تجرد کے پابند نہ تھے اور علانیہ اس کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ ہلڈیبرانڈ اور دیگر اہلِ کلونی مصر تھے کہ پادریوں پر تجرد نہ صرف اخلاقاً فرض ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ مجرد رہنے سے وہ دنیا و اہلِ دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہ سکتے ہیں تاکہ دنیاوی قوتیں ان کے مذہبی مشاغل میں مخل نہ ہو سکیں۔ مسندِ پاپائی پر متمکن ہونے سے قبل ہی وہ ایک اہم اصلاح کو عمل میں لانے میں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ ۱۰۵۹ء میں پاپائیت کے انتخاب کے طریقہ کا تعین ہو گیا۔ امراء اور عوام روما کا انتخاب میں کوئی دخل باقی نہ رہا اور شہنشاہ کو انتخاب کی توثیق کا جو حق تھا اس کو بھی صراحتاً تسلیم نہ کیا گیا بلکہ انتخاب کی پوری ذمہ داری کارڈنل[1] پادریوں پر چھوڑ دی گئی۔ اس طور پر کلیسیہ کے مرکز یعنی روما میں اس کی آزادی مسلم ہو گئی اور گو زمانۂ مابعد میں بھی انتخابات میں جھگڑے پیدا ہوئے اور بعض پوپوں کے اندرونی حالات نہایت شرمناک تھے مگر ہلڈی برانڈ نے جو نظام قائم کیا تھا وہ عملاً مفید ثابت ہوا اور کبھی اس سے انحراف نہیں کیا گیا۔ واضح رہے کہ جس کونسل نے نظام مذکورۂ بالا طے ہوا تھا اسی کونسل میں یہ بھی طے کیا گیا کہ یوکرسٹ کی عید میں جو روٹی اور شراب استعمال میں آئیں وہ علی الترتیب حضرت عیسیٰ کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہلڈی برانڈ

[1] کلیسیۂ رومن کیتھولک کے منتظمِ اعلیٰ پادری جو پوپ کی کونسل کے رکن بھی ہوتے ہیں۔

کے اطالیہ میں بہت سے سرگرم معاون تھے مگر اس کے مخالف بھی تھے مثلاً مائیلن کا بشپ مسمی آرہبرٹ اس شہر کے کلیسیہ اور پادریوں کی آزادی کا دعویدار تھا جو ہلڈی براںڈ کی خواہش کے بالکل خلاف تھا۔ ۱۰۷۳ء میں وہ پوپ منتخب ہوا۔ اور چونکہ عوام اور پادریوں ہر دو میں ہر دلعزیز تھا اس لیئے قبل اس کے کہ اس کا انتخاب حسب ضابطہ نہ کورۂ بالا ہو عوام نے خوشی کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ میں یہ شخص نہایت سربرآوردہ اور پاپائیت کا بہترین نمونہ ہے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے ہلڈی براںڈ نہ بلند قامت نہ وجیہہ تھا مگر اس کی قوت ارادی نہایت مضبوط اور کلیسیہ کے دعاوی کے برحق ہونے کا اسے یقین کامل تھا کلیسیہ کو وہ دنیا کی اعلیٰ ترین قوت خیال کرتا جسے اقتدار ذات باری تعالیٰ سے براہ راست عطا ہوا تھا اور جس کے بادشاہ اور شہزادے دست نگر تھے۔ گیریگوری ہفتم یعنی ہلڈی براںڈ کی مدت العمر یہی کوشش رہی کہ پاپائیت کے اقتدارات کو عملاً تسلیم کرائے جیساکہ اصولاً اس کو یقین تھا۔ اس کے خیالات ومقاصد کے متعلق قیاس کرنے کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ وہ بالکل واضح ہیں۔ اسی زمانے کی ایک تحریر سے ہم چند جملے نقل کرتے ہیں جو غالباً اس کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ ”پاپائے روما کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں اسی کو بشپوں (اسقفوں) کے عزل ونصب کا اختیار ہے، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسیہ روما کو نہ کبھی دھوکا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے۔ انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی ہے خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی ہے، پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے“ ناممکن تھا کہ جس شخص کے خیالات ایسے ہوں جو وسیع اقتدارات رکھتا ہو اور اس کے معاونین کی بھی زبردست تعداد ہو وہ ان مقاصد کے حصول میں سرزمین یورپ کو زیروزبر نہ کر دے۔

باب نہم

شہنشاہیت اور پاپائیت کا پہلا مقابلہ

شہنشاہ ہنری چہارم چھ سال کی عمر میں ۱۰۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور اس وجہ سے عنان حکومت کئی سال تک دوسروں کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے عہد حکومت کے ابتدائی زمانے میں امراء سے آئے دن کے جھگڑے رہتے جس سے اندیشہ تھا کہ شہنشاہی کا پوپ کی مخالفت کے بغیر ہی خاتمہ ہو جائے گا۔ اہل سیکسنی بغاوت پر آمادہ ہو گئے کیونکہ انکو ایک ایسے شہنشاہ کی اطاعت شاق تھی جو ان کی قوم سے نہ تھا۔ نزاعات مذکور کے دوران میں اسے کئی دفعہ شکست ہوئی جس سے وہ اپنے مخالفین کے مطالبات قبول کر لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر ۱۰۷۵ء کے اختتام تک وہ ان مشکلات پر غالب آ گیا اور پوپ کے مقابلے پر آمادہ ہو گیا۔

پوپ گریگوری ہفتم اور شہنشاہ ہنری چہارم کے درمیان جو نزاع تھی اس کو گویا ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کا "نقطۂ انقلاب" خیال کرنا چاہیے اس لئے اس کی اہمیت ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ دونوں اشخاص میں کسی قسم کا ذاتی عناد نہ تھا۔ شہنشاہ راسخ الاعتقاد کیتھولک تھا اور پوپ کو شہنشاہ کا کماحقہ اعزاز کرنے میں کوئی عذر نہ تھا مگر غیر متعلق وجوہ کے سبب سے دونوں میں سخت ناچاقی پیدا ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہوں اور پوپوں کے باہمی تعلقات کچھ ایسے نازک تھے کہ ان کی دقتوں کو سمجھنا دشوار تھا اور ان کے تصفیے کی تا حال کوئی کوشش نہ ہوئی تھی شہنشاہ ممالک متمدنہ کے دنیاوی سردار ہونے کا دعویدار تھا اور

اس کے برخلاف پوپ کلیسہ کا سردار ہونے کا دعوے رکھتا تھا۔ بظاہر دونوں میں مخالفت کی کوئی وجہ نہ تھی مگر عملاً دعاوی مذکورۂ بالا سے دقتیں پیدا ہوئی تھیں۔ شہنشاہ بعض اقتدارات کا دعویدار تھا جن کا پوپ کو بھی دعویٰ تھا اور جب دونوں کو اس اختلاف کا احساس ہوا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان میں سے کون اقتدارات مذکورہ سے دست کش ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر دو کے اقتدارات کی بیّن تفریق نہیں ہوئی تھی یعنی کن امور کا شہنشاہ سے تعلق تھا اور کن کا پوپ سے۔ اہل مذہب اور اہل سیاست کے جھگڑے دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں خواہ وہ کسی نام سے ہوں۔

اصل امر مابہ النزاع یہ تھا کہ جرمنی اور دیگر کیتھولک ممالک میں بشپوں کے تعلقات پوپ سے اور مختلف دنیاوی حکمرانوں سے کس قسم کے ہونا چاہئیں۔ گریگوری ہفتم کو اپنے عہدے کے فرائض کا خاص خیال تھا اور اسے ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ کلیسہ کی طاقت بڑھائے مگر اس نے دیکھا کہ تمام یورپ اور خصوصاً جرمنی میں بشپ جو کلیسہ کے اعلےٰ عہدہ دار تھے ان کا تقرر بادشاہوں کے اقتدار میں تھا یا شہنشاہ کا اختیاری تھا اور بشپ اپنے مذہبی فرائض کو انجام دینے کے بجائے بادشاہوں کے وزیر بنکے معمولی انتظامی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ بشپوں کے انتظامی امور میں مشغول رہنے کے اسباب کو ہم بیان کر چکے ہیں مگر گریگوری کو سخت ناگوار تھا کہ جن لوگوں (بشپوں) کو کلیسہ کی محافظت اور خدمت میں سرگرم رہنا چاہیئے تھا وہ کلیسہ کے زبردست رقیب (شہنشاہ) کے تابع فرمان تھے۔ اس لئے ۱۰۷۵ء میں اس نے ایک فرمان پاپائی جاری کیا جس کا منشا یہ تھا کہ دنیاوی حکام خواہ شہنشاہ ہوں یا بادشاہ وغیرہ وہ ہرگز مجاز نہیں ہیں کہ عہدداران کلیسہ کا تقرر عمل میں لائیں اور عصا و انگشتری سے اس کو سرفراز کریں۔ گریگوری ہفتم نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر کوئی شہنشاہ، بادشاہ، ڈیوک وغیرہ مذہبی خدمات کے تقررات میں دخل دینے کی جرأت کرے گا تو وہ کافر و مرتد ہے۔" اس طور پر امر متنازع فیہ کا اظہار توضیح کے ساتھ ہو گیا کیونکہ اس اعلان سے گویا پوپ نے شہنشاہ کو ان حکام (بشپ) کے خدمات سے محروم کر دیا جن پر اس کی حکومت کا دارومدار تھا آتش جنگ کے مشتعل ہو جانے کے لیئے یہ وجہ کافی و وافی تھی۔

پوپ کی احتجاجی مراسلت کا جو جواب ہنری چہارم نے دیا اس کی عبارت ہے

ظاہر تھا کہ وہ پوپ کو معزول کرانا چاہتا ہے۔ عبارت حسب ذیل تھی۔ "از شاہ ہنری جو غاصب نہیں ہے بلکہ بفضل الٰہی حکمراں ہے بنام ہلڈی براںڈ (گریگوری ہفتم) جو بظاہر پوپ ہے مگر دراصل ایک بد اعمال راہب ہے ...... مسند مقدس جس کو تو نے غصب کر لیا اس پر سے اتر جا اور چھوڑ دے۔ مقدس پیٹر کی مسند پر کسی ایسے شخص کو بیٹھنے دے جو مذہب کی آڑ میں فساد برپا نہ کرے گا بلکہ پیٹر کے صحیح عقائد کی تعلیم و تلقین کرے گا۔ میں ہنری شہنشاہ بفضل الٰہی تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ مسند پاپائی سے دست کش ہو اور تمام زمانے میں مردود و ملعون ہو" پوپ کے جواب میں اسقدر درشتی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک دردناک ہے "اے مقدس پیٹر، حواریوں کے سردار، اپنے مقدس کانوں سے میری آہ و زاری سن، تو نے مجھے بچپن سے پرورش کیا ہے اور آج کے دن تک تو نے مجھ کو بدکردار لوگوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھا ہے جو مجھ سے اس لیے نفرت رکھتے ہیں کہ میں تیرا سچا خادم ہوں" خط کے آخر میں معزولی کا حکم ہے "میں تمام مسیحیوں کو ہنری چہارم کی فرماں برداری سے بری کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص اس کو بادشاہ تسلیم نہ کرے چوں کہ اس نے عیسائی ہو کر فرمانبرداری سے منھ موڑا ہے اور خدا سے منحرف ہو گیا ہے لہٰذا میں اس کو ملعون قرار دیتا ہوں"۔

پوپ کے لئے یہ حکم صادر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ شہنشاہ اور اس کی قوت کے مقابلے میں پوپ کی کوئی ہستی نہ تھی۔ ابتدا میں گو دونوں کی حالت غیر مساوی معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ بات نہ تھی۔ اولاً تو واضح رہے کہ یہ راسخ الاعتقادی کا زمانہ تھا۔ اہل زمانہ کلیسیہ کے سردار کے اقتدار کو بلا چون و چرا تسلیم کرتے اور کافر و مرتد قرار دئے جاتے یا کلیسیہ سے علیحدہ کئے جانے کے خیال سے کانپ اٹھتے تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ شہنشاہ جرمن تھا اس لئے تمام اہل اطالیہ پوپ کے ہمنوا ہو گئے۔ قوم نارمن بھی پوپ کی امداد پر کھڑی ہو گئی اور میٹلڈا رئیسہ ٹسکنی تو اس کے خاص معتقدین میں سے تھی۔ شمالی کے بڑے بڑے شہروں کے باشندوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ جرمنوں کی حکومت سے اگر انھیں کوئی بچا سکتا ہے تو وہ پوپ ہی ہے۔ مزید برآں شہنشاہ تمام اہل جرمنی کی امداد کی امید نہ رکھ سکتا تھا کیونکہ امراء پھر برسر پرخاش ہو گئے تھے اور خود اس کے اہل خاندان بلکہ اس کے بیٹے بھی آتش فساد مشتعل کرنے پر مستعد تھے۔ شہنشاہ نے جب دیکھا کہ جرمنی کے

جو لوگ اس کے مخالف تھے وہ پوپ سے ساز و باز کر رہے ہیں تو اس کو مجبوراً ۱۰۷۶ء میں
یہ تسلیم ختم کر دینا پڑا۔ ہنری اپنے امرا سے بمقام ٹری بور شہنشاہی کونسل میں بحث و
مباحثہ میں مشغول تھا جس میں انھوں نے اپنی مخالفت کا علانیہ اظہار کیا اور یہ بھی تصفیہ کیا
کہ بمقام آگسں برگ چند روز کے بعد ایک دوسری کونسل منعقد ہوگی جس میں پوپ بہ نفس
نفیس آکر ہنری کو معزول کر دے۔ شہنشاہ کے مخالفین کی تعداد اب بہت زیادہ ہو گئی تھی
اس کو اندیشہ ہو گیا کہ خاندان میرو دنجی کے آخری تاجدار کی طرح وہ بھی معزول نہ کر دیا
جائے گا اور پوپ کی امداد سے اسی کے امرا میں سے کوئی اس کا جانشین منتخب کر لیا
جائے گا۔ اس لیئے ہنری نے یہی مناسب خیال کیا کہ بہ عجز و الحاح پوپ سے معافی کا
خواستگار ہو جو اس وقت ہیلڈا رئیسہ ٹسکنی کے ساتھ قلعۂ کنوسا واقع کوہ ایپی نائن
میں مقیم تھا۔ جاڑے کا زمانہ تھا مگر ہنری وہاں گیا اور کنوسا کے قریب پہونچکر
پوپ سے شرف باریابی اور معافی کا خواستگار ہوا۔ مگر شہنشاہ کو ذلیل و خوار کرنے کے
لیئے گریگوری نے للکار دیا۔ اس کا بیان ہے کہ تین روز تک برابر شہنشاہ برہنہ پا قلعے کے
یخ بستہ دروازوں پر حاضر ہوتا اور وہاں سے جھڑک کر نکال دیا جاتا آخر کار ملکہ ہیلڈا
کی سفارش پر پوپ نے اس کو شرف باریابی بخشا۔ شہنشاہ نے اپنے آپ کو پوپ کے
قدموں پر ڈال دیا اور پوپ نے اس کو اٹھا کر معاف کر دیا۔ اس طور پر کلیسیہ اور شہنشاہ کے
حکام اعلیٰ میں مصالحت ہو گئی۔ پوپ گریگوری ہفتم کا خود بیان ہے کہ اس کے اظہار
پشیمانی اور منت و زاری سے متاثر ہو کر ہم نے کلیسیہ میں داخل کر لیا اور اپنی بد دعا واپس

لے لی۔

یہ مشہور واقعہ یعنے شہنشاہ کا پوپ سے معافی کا خواستگار ہونا اب تک اہل دنیا کے دلوں
پر نقش ہے۔ پوپ کا اقتدار اس وقت نصف النہار پر تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور مثال
کسی شہنشاہ کی پوپ کے قدموں پر اپنا سر رکھنے کی نہیں ہے۔ مگر اس کے نتائج کچھ اور
ہی ہوئے۔ ہنری چہارم نے اس برمحل چال سے بہت فائدہ اٹھایا کیونکہ اس کی اطاعت
قبول کر لینے سے گریگوری نہ تو آگسں برگ کی مجلس میں شریک ہوا اور نہ اسے ہنری کو
معزول کرنے میں امرائے جرمنی کی معاونت کا موقع ملا۔
اصل واقعہ یہ ہے کہ اطاعت قبول کر لینے سے اسے دم لینے اور آئندہ جنگ

کے لئے تیار ہونے کا موقع مل گیا جو بہت جلد زور وشور کے ساتھ شروع ہو گئی۔ گریگوری نے پھر شہنشاہ کی معزولی کا حکم دیا بلکہ دوسرا شہنشاہ بھی مقرر کر دیا۔ ہنری چہارم نے بھی اعلان کر دیا کہ گریگوری پوپ نہیں ہے اور ایک بشپ کو پوپ کا خطاب دے دیا۔ جرمنی کے تنازعوں کا فیصلہ کر کے ہنری چہارم نے روما کا رخ کیا اور ۱۰۸۱ء میں پوپ کو اس شہر میں محصور کر لیا قریب تھا کہ اس قلعہ کی فتح حاصل ہو مگر ملیریا بخار نے اس کو رجعت پر مجبور کیا۔ چند سال کے بعد یعنی ۱۰۸۴ء میں اس نے روما پر پھر حملہ کیا اور تمام شہر پر قبضہ کر کے قلعہ سینٹ اینجیلو کا محاصرہ کر لیا جس میں پوپ گریگوری ہفتم مقیم تھا۔ قریب تھا کہ پوپ اپنے قدیم دشمن کا اسیر ہو جائے مگر کمک پہونچ گئی اور وہ بچ گیا۔ اس نے نارمنوں کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا تھا۔ ان کے سرگروہ رابرٹ گوس کارڈ کے پاس جب یہ حکم پہونچا تو وہ مقام ڈورازو کے محاصرے میں مصروف تھا جو بحیرہ ایڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ گوس کارڈ نے فوراً اطالیہ کی راہ لی۔ اس کا باعث نہ صرف مذہبی جوش یا وہ عقیدتمندی تھی جو اس کو پوپ کی ذات سے تھی بلکہ وہ شہنشاہ کو اپنا رقیب خیال کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ وسطی اطالیہ میں طرفدار ہو۔ اس نے فوراً روما پر دھاوا کر دیا۔ شہنشاہی افواج نارمنوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں اس لئے ہنری چہارم نے کوچ کر دیا اور گریگوری ہفتم کی گلوخلاصی ہو گئی۔ نارمنوں نے پوپ کو اس کے دشمن سے بچا لیا مگر انھوں نے مقدس روما کو خوب لوٹا۔ الارک اور جینسیرک کے ایسے وحشیوں نے بھی روما کو ایسا نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جتنا نقصان کہ پوپ کے ان معتقدین و حلفاء کے ہاتھوں اس شہر کو اٹھانا پڑا۔ اہل روما کے لعن وطعن سے عاجز ہو کر وہ نارمنو کے ساتھ چلا گیا اور چند روز بعد سیلرنو میں انتقال کر گیا۔ "راست بازی سے مجھے عشق تھا اور بدکرداری سے نفرت۔ اسی لئے میں بحالت غریب الوطنی مر رہا ہوں"۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے مگر اس کی موت کے ساتھ اس جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہوا کیونکہ یہ نزاع ہنری چہارم اور گریگوری ہفتم کے درمیان نہ تھی بلکہ من حیث العہدہ شہنشاہ اور پوپ کے درمیان تھی مصالحت کے لئے کوششیں اکثر ہوئیں مگر نزاعات مذکورہ کا سلسلہ دو سو سال کے بعد جا کر اس وقت ختم ہوا جب کہ فریقین میں سے ایک کا خاتمہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ ۱۰۹۵ء میں پہلی جنگ صلیبی کا اعلان ہوا اور عیسائیوں کو اوائل میں جو کامیابیاں ہوئیں اور ان کے سبب سے جو جوش پیدا ہوا اس سے پوپ کا اعزاز اور اقتدار اور بھی بڑھ گیا۔

ہنری چہارم نے ۱۱۰۶ء میں انتقال کیا اور ہنری پنجم اس کا جانشین ہوا مگر شہنشاہ اور پوپ میں حسب سابق کشیدگی باقی رہی۔ مگر زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ دونوں فریقوں میں مصالحت کا خیال پیدا ہو گیا۔ اور امید ہو چلی کہ پوپ پاسکل سے جو نامہ و پیام جاری تھا وہ ضرور مصالحت کا باعث ہوگا۔ بیان کیا گیا ہے کہ پادری اپنی جائدادوں سے دست کش ہونے کو راضی تھے اور شہنشاہ بھی حق تقرر سے دست بردار ہونے پر رضامند تھا ہنری پنجم نے یہ خیال کر کے کہ یہ شرائط تسلیم کر لئے گئے ہیں روما کا رخ کیا اور وہیں تاج شہنشاہی اس کے سر پر رکھا گیا۔ مگر یہ صلح چند روزہ ثابت ہوئی۔ شرائط مذکورہ کو پوپ کی بزدلی پر محمول کیا گیا اور ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ غالباً اصل واقعہ یہ تھا کہ شرائط مذکورہ پر عمل پیرا ہونا منظور نہ تھا۔ تاجپوشی کی رسم خونریزی اور بلوؤں کے سبب سے رک گئی۔ ہنری پنجم روما سے فرار ہو گیا اور پھر جنگ شروع ہو گئی اس موقع پر سالہائے مابعد کے واقعات کا تذکرہ چھیڑنا ہم مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ وہ جنگ سابقہ کے واقعات سے ملتے جلتے ہیں۔ پوپ نے شہنشاہ کے کافر و مرتد ہونے کا حسب سابق فتوےٰ دے دیا۔ شہنشاہ نے اس کا دنداں شکن جواب دیا۔ پوپ نے دوسرا شہنشاہ مقرر کر دیا اور شہنشاہ نے ایک نیا پوپ لا کے کھڑا کر دیا۔ صلح کی گفت و شنید بھی جاری تھی مگر دونوں فریق اصل امر مابہ النزاع کو زیر بحث لانے سے گریز کرتے تھے۔ لیکن اس طویل جنگ اور اس کے لازمی نتائج سے دونوں حریف اُکتا گئے تھے۔ آخر کار ۱۱۲۲ء میں پوپ کیالکسٹس ثانی نے ایک انتظامی نقشہ پیش کیا جس کو فریقین نے منظور کر لیا اور یہ طویل نزاع کم از کم کچھ روز کے لئے ختم ہو گئی۔ اس انتظام کو "مصالحت ورمز" کہتے ہیں۔ در اصل فریقین میں جو امور متنازع فیہ تھے ان کے دائرے کو محدود کر دینے سے مصالحت ممکن ہو گئی اور یہ طے پایا کہ بشپوں کا انتخاب حکام کلیسیہ سے متعلق رہنا چاہیئے اور ان کو انگشتری اور عصا عطا کرنے کا مجاز صرف پوپ ہوگا مگر شہنشاہ کا ایک نائب موقع انتخاب پہ موجود رہے۔ اور اگر انتخاب میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے تصفیہ کا مجاز شہنشاہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کے ممالک مقبوضہ میں اراضی پر قابض ہونے کی وجہ سے بشپوں کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ اس کی سیادت کا اقرار کریں اور اراضی مذکور کا وثیقہ بھی اسی سے حاصل کریں۔ "مصالحت ورمز" سے اس طول طویل قضیئے کا کچھ زمانے کے لئے

خاتمہ ہو گیا جس سے فریقین کو سخت نقصان ہو رہا تھا مگر اصل امور متنازع فیہ کا ابھی تک تصفیہ نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا ذکر تک نہ آیا تھا۔ شہنشاہان سلطنت مقدس روما جیسا کہ ان کے خطاب سے ظاہر ہے تمام یورپ پر حکمرانی یا بہ الفاظ دیگر روما کے قیصروں کی جانشینی کے دعویدار تھے اور ان کا منشا تھا کہ تمدن کے ہر شعبے پر ان کی نگرانی رہے۔ پاپایان روما کو بھی ان کے بالمقابل عالمگیر حکومت کی خواہش تھی اس لئے وہ اصولاً یا عملاً کسی حیثیت سے بھی کسی ایسی با اقتدار ہستی کے روادار نہیں ہو سکتے تھے جو ان کے اختیارات و قوت کو محدود کرنا چاہے۔ جب فریقین کے یہ دعاوی تھے تو صلح کا مدت تک قائم رہنا ناممکنات سے تھا۔

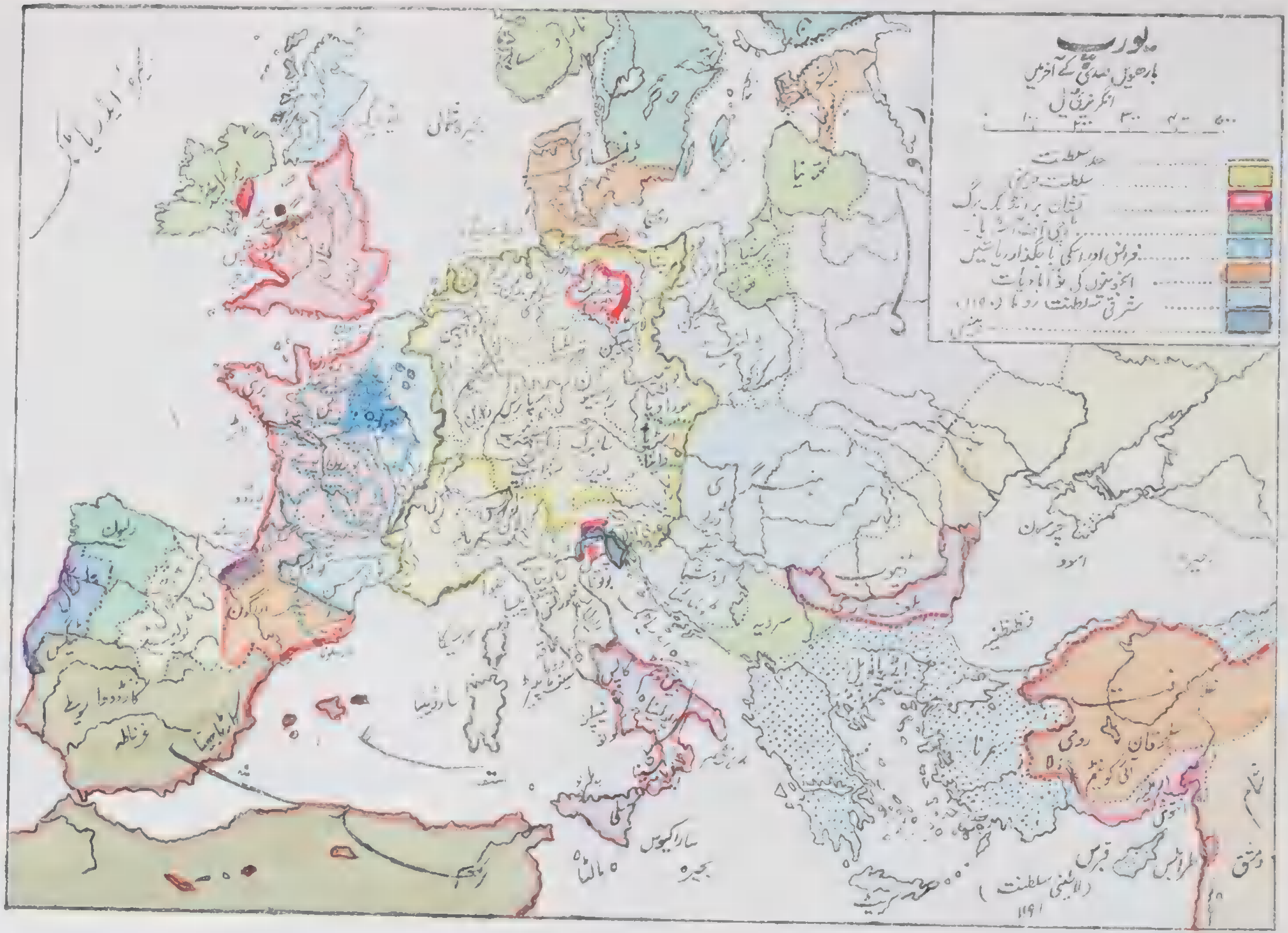
باب نہم

نفس شہنشاہی و پاپائی کا مقابلہ

دور ثانی

نفاذ مصالحت ورمز کے چند روز بعد پوپ نے ایک تحریر میں شہنشاہ ہنری پنجم کو لکھا کہ "آپ کی سلطنت میں بشپ اور ایبٹ (خانقاہوں کے سجادہ نشین) دنیاوی معاملات میں اس قدر مستغرق رہتے ہیں کہ ان کا زیادہ تر وقت عدالتوں یا مشاغل سپہگری میں صرف ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حکام کلیسہ وزرائے دربار ہو کر رہ گئے ہیں" فریڈرک اول نے جس کے عہد حکومت کا ذکر ہم اب کریں گے اس کا یہ جواب دیا کہ جن بشپوں کا تقرر فرائین شہنشاہی سے ہوا ہے وہ بلحاظ علم و فضل، زہد و تورع پوپ کے نامزد کردہ بشپوں سے افضل ہیں۔ پادریوں کا تقرر امور متنازع فیہ میں سے تھا۔ پوپوں کا اصل منشاء یہ تھا کہ شہنشاہوں کو بشپوں کے خدمات سے محروم کر دیں جن پر ان کی حکومت کا دار و مدار تھا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شہنشاہوں کو رومی قیصروں کے جانشین ہونے کے لحاظ سے تمام یورپ کے حاکم اعلیٰ ہونے کا دعویٰ تھا اور اسی طرح پوپ کو سینٹ پیٹر کے جانشین ہونے کی حیثیت سے سیادت کا دعویٰ تھا۔ تقریروں اور کتابوں میں دعاوی مذکور کو ہر دو فریق نہایت کر و فر سے پیش کرتے ہیں مگر عملاً یہ تراع توازن قوت اور سیاسی اغراض پر مبنی تھی۔ پوپ کے مدت تک متعدد معاونین ایسے تھے جن کی فوجی قوت معقول تھی اور جن کے اغراض شہنشاہ کے مخالف ہونے کے لحاظ سے واحد تھے۔ چودھویں



یورپ
بارھویں صدی کے آخر میں
انگریزی میل
فرانس اور اسکی باجگذار ریاستیں
انگریزوں کی نوآبادیات
(لاطینی سلطنت)
۱۱۹۱
سارڈینیا
دمشق
قبرص

صدی تک یہی حالت رہی یہاں تک کہ پوپ بالکل بے یار و مددگار ہو گئے اور ان کے مصائب کا زمانہ ہوا شروع ہو گیا، تجدید سلسلۂ جنگ کے وقت دونوں فریقوں کی کیا حالت تھی اسی پر ہم اب ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

۱۱۲۵ء میں لوتھیر رئیس سیکسنی ہنری چہارم کے بجائے شہنشاہ جرمنی ہو گیا اور ۱۱۳۸ء میں کانراڈ ثالث رئیس ہاہنسٹافن اس کا جانشین منتخب ہوا۔ کانراڈ کا دور دورہ زیادہ تر جرمنی کے صوبجات فرانکونیا و سوبیا میں تھا اور اس کے خاندان کا تعلق ہاہنسٹافن کے قلعہ سے تھا جو سوبیا کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔ تاج شہنشاہی چند مختصر وقفوں کے علاوہ مدت تک اسی خاندان کے قبضہ میں رہا اور یہی شہنشاہی عظمت و قوت کا زمانہ تھا۔ ۱۱۵۲ء میں کانراڈ کا بھتیجا فریڈرک اس کا جانشین ہوا جو زمانۂ مابعد میں فریڈرک باربروسا (سرخ ریش) کے نام سے مشہور ہوا۔ از منۂ وسطیٰ کے شہنشاہوں میں شان و شوکت کے لحاظ سے اس کا کوئی مدمقابل نہیں گزرا، یہ اور بات ہے کہ دوسرے شہنشاہ اس سے زیادہ کامیاب یا قوی گزرے ہوں۔ اس کے عہد حکومت کے بعد جب ملک جرمنی طرح طرح کے آفات میں گھر گیا تو اہل جرمنی اس کے زمانے کی فوجی فتوحات، تجارت کے فروغ، اور علوم و فنون کی ترقی کو مدت تک یاد کرتے رہے لیکن جرمنی کے شہر بھی رفتہ رفتہ ترقی کر کے اسی درجہ پر پہونچ رہے تھے جو اطالیہ کے شہروں کا تھا۔ جرمنی کے شہروں میں کالون، منیر اور آگسبرگ ممتاز شہر تھے۔ ان شہروں کے باشندوں کو اپنے حقوق بلدی کا خاص خیال رہتا تھا اور فنون لطیفہ میں بھی خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اور ان اوصاف میں وہ اطالیہ کے شہروں سے کسی بات میں کم نہ تھے۔ مذکورۂ بالا تینوں شہروں کے علاوہ جنوبی اور مغربی جرمنی میں اور بھی متعدد شہر تھے جن کو حقوق بلدی حاصل تھے جس طرح کہ فرانس کے شہروں کے باشندے بادشاہ کو اپنا مربی و محافظ خیال کرتے تھے اسی طرح جرمنی کے شہروں کے باشندے بھی شہنشاہ کو اپنا مدد و معاون سمجھتے تھے، اور اس کے برعکس امراء کو اپنا دشمن و رقیب شہنشاہ کی حکومت کا دارومدار بھی انہیں شہروں کی امداد پر تھا۔ اس لئے شہروں کی روز افزوں قوت امراء کے اثر کو زائل کر رہی تھی۔ امراء کی قوت کے انحطاط کی یہ ایک وجہ اور بھی تھی کہ قوانین رومی کے مطالعے کا رواج پھر ہو چلا تھا گو اس کے نتائج سرزمین جرمنی میں اس زمانے میں ظاہر نہیں ہوئے۔ قوانین رومی کی اہمیت کے ضمن میں ہم بیان

کر چکے ہیں کہ جب اہل زمانہ اس قانون کی جانب متوجہ ہوئے تو انھیں ایسا معلوم ہوا گویا یہ کہ ایک دوسرا صحیفہ آسمانی ہے۔ قوانین مذکور میں امراء کے اقتدار کا لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ ان کی تدوین ایسے زمانے میں عمل میں آئی تھی جب کہ شہنشاہان روما کے اقتدار پر کسی قسم کے قیود نہ تھے۔ قوانین روما کا لب لباب یہ تھا "کہ حاکم وقت کا فرمان قانون کا حکم رکھتا ہے" اور جن جن ممالک میں قوانین مذکور کی تعلیم جاری تھی وہاں بادشاہ یا حاکم اعلیٰ کے سوا امراء یا دیگر حکام کا اقتدار گھٹتا جاتا تھا۔ امراء کے اقتدار کا قوانین روما میں کہیں بھی ذکر نہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں مجموعۂ قوانین مکمل ہو رہا تھا اسوقت امراء کے اقتدار کا وجود ہی نہ تھا۔

امور مذکورۂ بالا سے ظاہر ہے کہ زمانۂ زیر تذکرہ میں شہنشاہوں کی قوت کے ترقی کرنے کے متعدد اسباب موجود تھے مگر امراء کے بڑے بڑے خانوادوں کا اقتدار ان کے استحکام قوت میں سدراہ تھا۔ شارلیمین کے زمانے ہی سے شہنشاہوں نے اس زبردست رکاوٹ کو محسوس کیا تھا اور آٹو اعظم کی تخت نشینی کے زمانے سے امراء کی حالت اور بھی مخدوش ہو گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ امرائے کبار ڈیوکس کی قوت ٹوٹ گئی تھی اور ان کے علاقے تقسیم ہو چکے تھے مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کئی بڑے بڑے علاقے ایک ہی شخص کے قبضے میں آجاتے تھے اور فریڈرک باربروسا کے زمانے میں تو امراء کی قوت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ شارلیمین اور آٹو اعظم کے عہد میں اس کا عشر عشیر تک نہ تھا۔ امرائے کبار کا سرغنہ ہنری "اسد" تھا جو خاندان گولیف کا سردار اور شہنشاہ فریڈرک کا عزیز بھی تھا۔ علاقہ جات باویریا و سیکسنی کچھ تو اس کو وراثت اور کچھ بیوی کے جہیز میں ملے تھے۔ مقبوضات مذکور میں اس نے اور بھی اضافہ کیا اور جرمنی کے مشرق میں جو ممالک تھے ان کو فتح کر کے وہاں تہذیب و تمدن جرمنی کو رواج دیا۔ بلحاظ ترقی و سرسبزی اس کے مقبوضات شہنشاہ فریڈرک کے ذاتی مقبوضات یعنی فرانکونیا و سوبیا سے کسی صورت میں کم نہ تھے۔ اس لئے فریڈرک کو اس کی رقابت کا ضرور اندیشہ ہوگا۔ مگر ابتداءً دونوں میں دوستی تھی اور شہنشاہ کے ابتدائی فتوحات زیادہ تر ہنری کے زور بازو کے نتائج تھے مگر آخر وقت کہ جب بجائے دوستی کے دونوں میں رقابت پیدا ہو گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف جرمنی کی حالت ابتر ہو گئی بلکہ اطالیہ میں بھی شہنشاہ کو ذلت و خواری

نصیب ہوئی۔ مگر فریڈرک کے عہد حکومت کے اوائل میں شہنشاہت کی حالت بہت بہتر تھی شہنشاہ خود بھی قابل اور اولوالعزم تھا اور اس کی آرزو تھی کہ صفحات تاریخ پر اپنا کوئی زبردست کارنامہ چھوڑ جائے۔

اطالیہ کی حالت اس زمانے میں یہ تھی کہ وہاں کوئی گریگوری ہفتم کا سا زبردست پوپ نہ تھا اس لیئے اس کے جانشینوں کے نام تک گنانے کی ضرورت نہیں لیکن اگر اس زمانے میں کوئی زبردست پوپ نہ تھا تو اس کا نعم البدل ایک ایسے پادری کے وجود سے ہوگیا جس کا از منہ وسطےٰ میں کوئی ثانی نہیں۔ یہ شخص سینٹ برناڈ (سلسلہ ۱۰۹۱ء۔ ۱۱۵۳ء) تھا جو کلیسیہ کے معاملات میں اس وقت اسی قدر حاوی تھا جتنا کہ گریگوری ہفتم اپنے زمانے میں۔ سینٹ برناڈ کو زیادہ تر اپنی قابلیت اور خصائل حمیدہ کی وجہ سے کامیابی ہوئی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ اس کا راہبوں کی ایک باوقعت جماعت سے تعلق تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ راہبوں کی مختلف جماعتوں اور پاپائیت کے درمیان نہایت گہرے تعلقات تھے اور دونوں ایک دوسرے کی ترقی و انحطاط سے متاثر ہوتے تھے۔ پاپائیت کی عظمت اور اُس کی قوت کا استحکام سینٹ بینی ڈکٹ اور راہبان کلونی سے وابستہ ہے اسی طرح راہبوں کی جماعت میں ایک جدید تحریک پیدا ہو رہی تھی جس سے تمام مغربی یورپ میں ایک عام مذہبی جوش پیدا ہوگیا تھا۔ راہبوں کی یہ جماعت سسٹرشین کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے سرگروہوں میں سے ایک انگریز اسٹیفن ہارڈن تھا۔ جو اُس گروہ کے بانی کا دوست تھا اور جس نے ۱۱۱۹ء میں پوپ سے اس جماعت کے قیام کا فرمان حاصل کیا۔ تحریک مذکور سے بھی رہبانیت کا احیاء مقصود تھا۔ ان کے عقائد بھی ویسے ہی تھے جو سینٹ بینی ڈکٹ کے تھے اور انھیں تلقین کی جاتی تھی۔ سسٹرشین فقراء کی جماعتوں کا قیام اکثر اوقات اس طور پر عمل میں آتا کہ چند لوگ پیروان سینٹ بینی ڈکٹ کی کسی خانقاہ سے الگ ہو کر شہروں کے عیش و عشرت سے بچنے کی غرض سے جنگلوں میں جا کر ریاضت و عبادت میں مشغول ہو جاتے مگر جماعت مذکور کے وجود میں آنے سے راہبوں کی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں پیدا ہوئی البتہ اتنا فرق ہوگیا کہ بہ نسبت دیگر فقراء کے سسٹرشین فقراء کے تعلقات لشپوں سے خوشگوار ہوگئے اس کے علاوہ اہل کلونی کی طرح وہ ایک شخص کے تابع فرمان نہ تھے بلکہ ان کی خانقاہوں کے سجادہ نشین

جمع ہوکر اپنی جماعت کے معاملات کا خود تصفیہ کرتے تھے۔ ان کے خانقاہوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ حضرت مریم کے ساتھ انھیں خاص عقیدت تھی اور ان کی پرستش کو اولی خیال کرتے۔

فقرائے مذکور (سسٹرشین) کی جماعت کا اثر یوں تو ہر صورت میں پیدا ہوتا مگر قرن بست میں اسکو زیادہ تر شہرت سینٹ برناڈ کی ذات سے ہوئی جو اس جماعت میں آغاز شباب ہی سے شریک ہوکر خانقاہ کلیرو اکا سجادہ نشین ہو چکا تھا۔ سیاسیات یورپ میں تا حین حیات اس کا خاص اثر تھا۔ اسی نے اس مشہور ملحد ابیلارڈ کی بیخ کنی کی تھی اور اس کے عقائد کو مسترد کردیا تھا) جو پیرس کی یونیورسٹی میں تعلیم دے رہا تھا کہ "اعتقاد مذہبی ہر شخص کی ذاتی رائے ہے"۔ سینٹ برناڈ کا معاملات مذہبی میں اس قدر اثر تھا کہ اس نے اپنے مساعی جمیلہ سے کلیسہ کے شیرازے کو منصب پاپائی کے امیدواروں کے مناقشات میں پراگندہ ہو جانے سے بچا لیا۔ اسی کے ایما سے یورپ کے سلاطین دوسری جنگ صلیبی کی شرکت پر آمادہ ہوئے جب کہ شہنشاہوں اور پوپوں کے فتنۂ باہمی نے پھر سے جنم لیا تھا گو وہ اس وقت بقید حیات نہ تھا۔ مگر کلیسہ جو قوت حاصل کر چکا تھا وہ اسی کے اثر اور اسی کے مساعی جمیلہ کی رہین منت تھی۔

جنگ آئندہ میں مٹلڈا ارئیہ ٹسکنی کے انتقال سے پوپ اپنے ایک زبردست معاون کی امداد سے محروم ہوگئے۔ کیونکہ اس کے انتقال کے بعد اس کے مقبوضات مختلف ورثا میں تقسیم ہوگئے جن سے پوپ کو خاطر خواہ امداد ملنے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔

جنوب میں نارمنوں کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ راجر شاہ سلی ۱۱۵۴ء تک ان پر حکمراں رہا۔ اس کے عہد حکومت کے اواخر میں پوپ سے اس کے تعلقات خوشگوار نہ تھے مگر ۱۱۵۶ء میں اس کے جانشین ولیم اول نے پوپ پر فتح حاصل کرکے صلح کرلی اور دوامی امداد کا اس سے وعدہ کیا۔ اس کے بعد ولیم ثانی سلی کا بادشاہ ہوا (۱۱۶۶-۱۱۸۹ء) جس نے اس سلطنت کو انتہائی ترقی دی۔ سلطنت سلی کی آبادی بالکل مخلوط تھی کیونکہ اس کے باشندوں میں مذہب قومیت اور زبان کا اختلاف تھا۔ جنوبی اطالیہ اور سلی میں اطالیوں کے علاوہ نارمن یونانی اور مسلمان بھی تھے۔ نارمن حکومت کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس کے زیر سایہ مختلف مذاہب کے لوگ امن وامان کے ساتھ رہتے تھے اور یہ ہی مذہبی رواداری اس

سلطنت کی ترقی اور قوت پذیری کا باعث تھی اور اسی وجہ سے مختلف الاصل اور مختلف المذہب
لوگ آپس میں صلح و آشتی کے ساتھ رہتے تھے، دوش بدوش اپنے دشمنوں سے لڑتے تھے
اور اسی اتفاق و یکجہتی سے سلطنت کی تقویت کے ضامن بنے ہوئے تھے شہر پیلرمو
(دار السلطنت سسلی) کی دلفریبی شاندار عمارات سے دوبالا ہو گئی تھی۔ سلاطین مذکور
کے زیر سایہ جنوبی اطالیہ نے علوم اور فنون لطیفہ میں اسقدر ترقی کی کہ پھر کبھی نصیب
نہ ہوئی پوپوں سے سلاطین مذکور بھی اکثر برسر پرخاش رہا کرتے اور کلیسیہ سے ان کو
اس قدر عقیدتمندی نہ تھی جتنی کے زمانۂ سابق میں پائی جاتی تھی مگر بمقابلۂ پوپ وہ شہنشاہ سے
زیادہ خائف تھے کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ اگر شاہ جرمنی کے قدم اطالیہ میں جم گئے تو انکی
ہستی معرض خطر میں آجائے گی اسلئے انھوں نے بلا پس و پیش پوپ کی حمایت کا بیڑا
اٹھا لیا۔

باب ماسبق میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ شمالی اطالیہ کے بلدیات روز بروز
زور پکڑتے جاتے تھے۔ بارھویں صدی عیسوی میں بلدیات مذکورہ نے بلحاظ دولت و ثروت
خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ان کی ترقی کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ شمالی اطالیہ کے شہر
تجارتی راستے پر واقع تھے اور ان کی تجارت حد درجہ فروغ پر تھی۔ جنگ ہائے صلیبی کے
باعث مشرق کی دولت شمالی اطالیہ کے شہروں میں کھنچ کر چلی آئی اور اس طور پر یورپ
کے شہروں میں جینوا، پیسا، فلارینس، مائیلن اور وینس دولت اور شان و شوکت میں
ممتاز ہو گئے اور اس دولت کے زعم میں ان کو اپنے اندرونی انتظامات میں خود مختاری
کا دعویٰ ہو گیا اور بشپوں کی حکومت ان کو شاق گزرنے لگی شمالی اطالیہ میں امرا کی
قوت کبھی زبردست نہ تھی اور اہل شہر نے اپنے آس پاس کے امرا کو اپنے قابو میں کر کے
اکثر اوقات انھیں اپنے قلعوں کو خیرباد کہکر شہر کی فصیلوں کے اندر رہنے پر مجبور کر دیا
تھا۔ جنوبی اطالیہ میں بھی حکومت بلدی کا رواج ہو چلا تھا۔ شہر نیپلز میں بھی چند روز تک
حکومت بلدی نہایت شان سے قائم رہی اور اہل روما میں بھی شمال کے شہروں کی
دیکھا دیکھی آزادی کی ہوس پیدا ہو گئی تھی مشہور عالم اور ملحد ابیلارڈ کے ایک
شاگرد آرنالڈ ساکن بریشیا نے اپنی فصاحت و بلاغت سے اہل روما کے ذہن نشین کر دیا
تھا کہ ان کو اپنے معاملات میں خود مختار ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ امرا یا پوپ کے دست نگر

قریب تھا کہ اس کو ان کوششوں میں پوری کامیابی ہو۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ بلدیات مذکور امرا اور بشپوں کے اثر سے آزاد ہو گئی تھے اس کے بعد شہنشاہوں سے جد و جہد شروع ہوئی کیونکہ حکومت شہنشاہی کے بلدیات پر چند حقوق تھے یعنی سڑکوں اور پلوں اور افواج کی نگرانی اور چند حکام کے تقرر کا اقتدار اس لئے اپنے اغراض کے حصول کے لئے بلدیات پر لازم ہو گیا تھا کہ حکومت شہنشاہی کے دعاوی سے انکار کر دیں۔ اور اسی وجہ سے یہ لوگ ہر چند شاہان نارمن کی طرح ان کے تعلقات بھی پاپائی سے ہمیشہ خوشگوار نہ تھے۔ شہنشاہوں کے مقابلے میں پوپوں کو زیادہ پسند کرتے تھے اور ہر طرح سے ان کی معاونت پر آمادہ رہتے تھے۔

پاپائیت سے شہنشاہ فریڈرک کے تعلقات اس کے اوائل عہد حکومت ہی میں کشیدہ ہو گئے تھے۔ پوپ ہیڈرین چہارم نے ۱۱۵۷ء میں ایک خط فریڈرک کے پاس بھیجا جس کی عبارت سے صاف مترشح ہوتا تھا کہ شہنشاہ پوپ کا ماتحت ہے کیونکہ اس کے بقول شہنشاہی پوپ کا ایک عطیہ ہے۔ چونکہ اس عبارت سے واضح ہوتا تھا کہ شہنشاہ پوپ کا ماتحت ہے اس لئے اس نے فوراً اس دعوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ شہنشاہی اس کو فضل خداوندی اور شاہان ماتحت کے انتخاب سے ملی ہے۔ اس نے اپنے دعوے کی تائید میں انجیل کی وہ آیت بھی پیش کی جس میں خدا ترسی اور احترام سلاطین کا حکم ہے۔ پوپ نے جواب دیا کہ اس کے الفاظ کو لغوی معنے میں نہیں لینا چاہئے۔ عطیے سے یہ مراد نہیں ہے کہ سلطنت پوپ کی بخشی ہوئی ہے بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس کے نفع کی غرض سے لیکن اس تردید کے باوجود پوپ ہیڈرین اور بادشاہ میں مصالحت نہیں ہوئی یہاں تک کہ پوپ کا انتقال ہو گیا۔

شہنشاہوں کو اطالیہ میں ہمیشہ دقتوں کا سامنا ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ علاوہ جرمنی اور برگنڈی کے وہ اطالیہ کے بھی بادشاہ تھے اور ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ تاج شہنشاہی ان کو شہر روما میں پوپ کے ہاتھوں سے ملے۔ اہل اطالیہ میں جذبۂ قومی اس زمانے تک پیدا نہیں ہوا تھا اس لئے اطالیہ کے اکثر شہروں کے باشندے شہنشاہ جرمنی سے ملکر اپنے ہم قوموں پر حملہ آور ہوتے تھے۔ مگر بالعموم اہل اطالیہ شہنشاہوں سے متنفر تھے اور اہل روما خصوصاً اس کے خواہشمند تھے کہ شہنشاہ روما کا خطاب عطا کرنے میں انھیں

بھی کچھ نہ کچھ دخل ہونا چاہیئے اور اس کا کچھ صلہ بھی ملنا چاہیئے۔ جرمن اس دعوے کا یہ جواب دیتے کہ شہنشاہی انھوں نے بزور شمشیر حاصل کی ہے۔ انھوں نے انھیں بخشی نہیں ہے۔ اطالیہ کے شہروں میں دولت فراوان تھی اس لیئے شہنشاہوں کی یہ آرزو تھی کہ ان پر قابض ہوکر حکمرانی کریں اور محاصل وصول کریں۔ اسی وجہ سے اطالیہ کے شہروں کے باشندے حکومت شہنشاہی کے مخالف ہوگئے تھے۔

فریڈرک اول اطالیہ پر چھ مرتبہ حملہ آور ہوا۔ ١١٥٥ء میں پہلی مرتبہ وہ تاجپوشی کی غرض سے آیا مگر رسم تاجپوشی جنگ کے بغیر عمل میں نہ آئی اور وہاں سے بھی اس کی فوج کا نقصان ہوا۔ ١١٥٨ء میں وہ پھر اطالیہ میں اس غرض سے وارد ہوا کہ وہاں کے مغرور شہریوں پر شہنشاہی کی قوت کا سکہ بٹھا کر انھیں ان کی سرکشی کا مزا چکھا دے۔ اس دفعہ اسے پوری کامیابی ہوئی۔ اطالیہ کے متعدد شہروں کی اعانت سے اس نے شہر مائیلن کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد اس نے بمقام رانکاگلیا (قریب بولونیا) ایک ڈائٹ (شہنشاہی مجلس شوریٰ) منعقد کر کے اقتدارات شہنشاہی کا اعلان کیا منجملہ دیگر امور کے اس نے اعلان کر دیا کہ شہنشاہ کے اقتدارات اطالیہ میں بھی وہی ہونگے جو جرمنی میں تھے اور سابقہ شہنشاہوں کے جو مقبوضات اطالیہ میں تھے ان پر وہ قابض ہو جائیگا عام شاہراہوں، ندیوں، بندرگاہوں اور منڈیوں میں محاصل وصول کرنے کا حق اسی کو رہے گا۔ شہروں میں اس کے مقرر کردہ حکام رہیں گے جو حکام بلدی کے افعال کی نگرانی کریں گے۔ اگر زمانہ آئندہ میں اس کے حسب منشا عمل ہوتا تو اطالیہ کی آئندہ تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس کی فلاح و بہبود میں افزائش ہو جاتی مگر ادبیات و فنون لطیفہ میں جو ترقی ہوئی وہ نصیب نہ ہوتی کیونکہ علوم و فنون صرف آزادی کی ہواؤں سے سرسبز ہوسکتے ہیں۔ یہ جدید حکومت لمبارڈی کے اکثر شہروں کو ناگوار تھی۔ شہر مائیلن نے شہنشاہ کی فوج کا تین سال تک مسلسل مقابلہ کیا (١١٥٩ء-١١٦٢ء) مگر آخر کار رسد کے ختم ہو جانے سے اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ فریڈرک نے حکم دے دیا کہ شہر مسمار کر دیا جائے اس کے قلعے توڑ دیئے جائیں اور اہل شہر کسی دوسرے مقام پر منتقل کر دیئے جائیں ان کامیابیوں کی وجہ سے شہنشاہ کا تمام یورپ میں کوئی مدمقابل نظر نہ آتا تھا گویا وہ عروج ترقی پر پہنچ چکا تھا اس کے بعد اطالیہ میں اسے شاذ و نادر ہی کوئی کامیابی ہوئی اس کے آخری ایام

شہر روما منازعات کا مرکز تھا۔ ۱۱۵۹ء میں الیگزنڈر سوم پوپ منتخب ہوا مگر بعض کارڈنل اس انتخاب سے مطمئن نہ تھے اس لیئے انھوں نے اس کو نادرست قرار دیکر ایک دوسرا پوپ بنام وکٹر چہارم کھڑا کر دیا۔ الیگزنڈر سوم نے حکومت شہنشاہی کی مخالفت شروع کردی اس لیئے فریڈرک نے وکٹر کو پوپ تسلیم کر لیا۔ اس زمانے تک پاپائی سے اس کے تعلقات قابل اطمینان تھے کیونکہ وہ بذات خود راسخ الاعتقاد کیتھولک تھا مگر الیگزنڈر سوم اس کا دشمن ہوکر شمالی اطالیہ کے شہروں سے مل گیا۔ الیگزنڈر کو اولاً اطالیہ میں رہنا دشوار ہوگیا تھا اس لیئے وہ فرانس چلا گیا۔ مگر جب لمبارڈی کے بلدیات سے جنگ چھڑ گئی تو اسے بھی واپسی کا موقع مل گیا۔

شمالی اطالیہ کے شہروں کو جنگ ہائے ماسبق سے کافی سبق مل چکا تھا کہ فرداً فرداً بمقابلہ شہنشاہ ان کی کوئی ہستی نہیں اس لیئے انھوں نے ایک زبردست اتحاد قائم کر لیا جسے "اتحاد لمبارڈی" کہتے ہیں۔ اور جس کے وجود میں آنے سے شہنشاہ کا اقتدار معرض خطر میں آگیا۔ اور اس کو دوبارہ اطالیہ کے معاملات میں مداخلت کرنا پڑی۔ چنانچہ ۱۱۶۶ء میں اس نے چوتھی مرتبہ اطالیہ پر فوج کشی کی حسب سابق اس کو ابتداءً کامیابی ہوئی۔ ارکان "اتحاد لمبارڈی" اس کی فوج ظفر موج کی پیش قدمی کو روکنے سے قاصر رہے، چنانچہ شہر روما پر بھی اس نے قبضہ کر لیا۔ مگر عین اس وقت جب کہ وہ اپنی کامیابی سے نفع حاصل کرنے کو تھا اس پر ایک سخت مصیبت نازل ہوئی جس کو اس کے ہمعصر قہر الٰہی سے تعبیر کرتے تھے۔ یعنی اس کی فتحمند فوجوں میں طاعون پھیل گیا اور ہزاروں سپاہی لقمۂ اجل ہوگئے۔ فریڈرک نے جب یہ دیکھا کہ اس کی فوج کا خاتمہ ہوگیا تو وہ مخفی طور پر اطالیہ سے واپس ہوگیا۔ اس معرکے میں اسے سخت ناکامی ہوئی اور اس کے واپس ہوتے ہی اس کے دشمنوں نے پھر سر اٹھایا ٹامس بکٹ (آرچ بشپ کینٹربری) نے اس واقعے کی متعلق رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اول آفرینش سے بانیان ظلم و ستم کو کبھی ایسی سخت سزا نہیں ملی تھی اسی سے خدا کے انصاف اور اس کے قادر مطلق ہونے کا ثبوت ملتا ہے" ۱۱۶۷ء میں "اتحاد لمبارڈی" کو کئی دیگر بلدیات کے مل جانے سے مزید تقویت حاصل ہوئی یعنی وینس سے میلن تک اور بریشیا سے بولونیا تک اطالیہ کے تمام شہر اس

اتحاد میں شریک ہو گئے اور پوپ الیگزینڈر ثالث کی یادگار میں میدان لمبارڈی میں ایک جدید شہر بنام "السانڈریا" بسایا گیا چنانچہ شہنشاہ کا اب اطالیہ پر دوبارہ حملہ آور ہونا بیحد ضروری ہو گیا۔

فریڈرک نے اطالیہ پر پانچویں دفعہ ۱۱۷۶ء میں حملہ کیا مگر اب سے کامیابی کی بہت کم امید تھی کیونکہ اس کے اور ہنری "اسد" کے درمیان سخت رنجش پیدا ہو گئی تھی جو امرائے جرمنی کا سرگروہ اور اس کا خاص دوست تھا۔ ہنری نے محاربات اطالیہ میں شہنشاہ کی بیش بہا امداد کی تھی مگر اس ناچاقی کی وجہ سے اس نے اطالیہ کی طرف اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ فریڈرک کی بلدیات اطالیہ کی فوجوں سے بمقام لیگنانو (Legnano) مڈبھیڑ ہوئی اس فیصلہ کن جنگ میں جرمنی سواروں اور اطالیہ کے پیدل سپاہیوں کا مقابلہ تھا۔ لمبارڈی کے سپاہی ایک عظیم الشان گاڑی کے اردگرد صف بستہ تھے جس پر مختلف شہروں کے جھنڈے آویزاں تھے سپاہیان مذکور میں سے اکثر نے عہد کر لیا تھا کہ اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے جانیں دیدیں گے اور فنون جنگ میں بھی ان کو نہایت کاوش کیساتھ تعلیم دی گئی تھی۔ جنگ نے بہت طول کھینچا مگر آخر کار اہل اطالیہ کی بہادری اور فریڈرک کے بعض معاونین کی غداری نے اس کا فیصلہ کر دیا اور شہنشاہ کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ اطالیہ میں جو کچھ اس کی امیدیں تھیں سب خاک میں مل گئیں اور اس کو مجبوراً اپنے زبردست مخالف یعنی پوپ کو حکم قرار دینا پڑا۔ پوپ الیگزنڈر سے اس نے ۱۱۷۷ء میں کلیسۂ سینٹ مارک واقع وینس میں ملاقات کی بمقام کینوسا میں اس سے ایک صدی قبل اس کے پیشرو ہنری چہارم کو جو ذلت پوپ کے مقابلے میں نصیب ہوئی تھی اس سے یہ اہانت کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ فریڈرک پوپ کے سامنے دوزانو ہو کر معافی کا خواستگار ہوا اور جب پوپ اپنے خچر پر سوار ہونے لگا تو فریڈرک نے اس کی رکاب پکڑ لی اور پوپ انکار نہ کرتا تو خچر کی لگام بھی پکڑ لیتا۔ چند سال کے بعد ۱۱۸۳ء میں صلح نامۂ کانسٹنس کی رو سے بلدیات اطالیہ کو ان کی فتح کا ثمرہ مل گیا یعنے ان کی آزادی اور حکومت خوداختیاری عملاً تسلیم کر لی گئی اور ان کو افواج رکھنے، قلعوں کی تعمیر کرنے اور عدالتی معاملات میں

تصفیہ کرنے کے حقوق مل گئے۔ شہنشاہ صراحتاً سرزمین اطالیہ کے کسی حصہ سے دست بردار نہیں ہوا مگر اس کی حکومت صرف برائے نام رہ گئی۔

فریڈرک بار بروسا اور اس کے دشمنوں یعنے پوپ کے معاونین کا معرکہ اس کے عہد حکومت کے واقعات میں نہایت اہم اور دلچسپ ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسی معرکے سے جرمنی کے معاملات کی طرف وہ کافی توجہ مبذول نہ کر سکا اسی اثناء میں جرمنی میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے جن کا آیندہ اثر نہایت اہم تھا۔ اب ہم بالاختصار ان کا ذکر کریں گے۔ اطالیہ کے جھگڑوں سے نجات ملتے ہی فریڈرک کو اپنے جرمنی مخالفین کی طرف متوجہ ہونا پڑا جن کا سرگروہ ہنری "اسد" تھا اس کے مقبوضات اس قدر وسیع تھے کہ بعض جرمنی مورخین کا خیال ہے کہ شہنشاہ پر اس کا غالب آنا ملک جرمنی کے متحد ہو جانے میں ممد ہوتا مگر طویل سلسلۂ جنگ کے بعد شہنشاہ کو کامیابی ہوئی اور اس کے رقیب کے مقبوضات پارہ پارہ ہو کر مختلف دعویداروں میں تقسیم ہو گئے مگر اس سے خاندان گوئلف کا خاتمہ نہ ہوا گو ملک جرمنی میں کبھی اس کے افراد کو پھر رسوخ حاصل نہیں ہوا۔

ہنری "اسد" کے معرکوں سے چند ایسے اہم واقعات کا بھی تعلق ہے جن سے جرمنی کا تمدن ان ممالک میں پھیلا جو اس کے شرق میں تھے۔ شارلمین کے زمانے ہی میں اقوام سلاو (باشندگان شرقی یورپ جس میں روسی و اہل بلقان شامل ہیں) و مگیار (اہل ہنگری) کے زبردست حملوں سے ممالک مذکور میں جرمنی حکومت و تمدن کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مگر اب پھر اس نواح میں اہل جرمنی زور پکڑتے جاتے تھے۔ اس ضمن میں دو امور قابل ذکر ہیں یعنے سلطنت ہائے پرشیا و آسٹریا کا آغاز ۱۱۵۶ء میں ڈینوب ندی کے نشیبی اضلاع جو باویریا کے مشرق میں تھے ان کی ایک علحدہ ریاست قرار دی گئی جو اولاً باویریا مشرقی کے نام سے موسوم ہوئی اور بعد کو اس کا نام آسٹریا ہو گیا۔ اسی صوبے یعنے آسٹریا میں خاندان ہیپسبرگ نے اپنی قوت مستحکم کر لی اس خاندان میں جرمنی شاہنشاہی پندرھویں صدی سے انیسویں صدی کے آغاز تک رہی اور پھر آسٹریا کی شاہنشاہی اس کے آخری رکن فرانسس جوزیف پر ختم ہوئی جس نے ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کے محاربۂ عظیم کے دوران میں انتقال کیا۔

گوامف اور عجمی اُمنوں کے علاقے



ابتداء میں ریاست آسٹریا گویا قوم مگیار کے مقابلے میں تمدن جرمنی کا مقدمۃ الجیش تھی اور اسی لئے اس کو شروع ہی سے بالکل آزاد رکھا گیا - اس زمانے سے کچھ قبل جرمنی کے شمال میں اس زبردست سلطنت یعنے پرشیا کی بنا پڑی جو زمانۂ دراز کی گمنامی کے بعد سلطنت آسٹریا کی حریف ہوگئی - ایلب ندی کے مشرق کے اضلاع پر جب جرمنوں کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی تو یہ ضروری ہوا کہ وہاں ایک مستحکم اور استوار حکومت قائم کی جائے - اضلاع مذکور کا حاکم اعلیٰ برینڈینبرگ کا مارگریو (رئیس) البرٹ المعروف بہ "خرس" تھا جس کو بلحاظ اس کی خدمات و اقتدار کے سنہ ۱۱۴۲ء میں الیکٹر[1] کا خطاب عطا ہوا - البرٹ کا تعلق خاندان اسکانی سے تھا جو چند روز کے بعد صفحۂ تاریخ سے غائب ہوگیا - دو صدیوں کے بعد ریاست برینڈینبرگ خاندان ہوہنزولرن کے قبضے میں آگئی اور اس کی ترقی شروع ہوئی جس سے رفتہ رفتہ اسی خاندان میں جرمنی شاہنشاہی آگئی اور ملک جرمنی کا یورپ کی زبردست سلطنتوں میں شمار ہونے لگا - اپنے عہد سلطنت کے اواخر میں فریڈرک بشرکت رچرڈ اول شاہ انگلستان و فلپ ثانی شاہ فرانس تیسری جنگ صلیبی میں شریک ہوا اس جنگ کی ابتداء تو نہایت امید افزا ہوئی مگر اس کا نتیجہ عیسائیوں کے حق میں اچھا ثابت نہوا - فریڈرک کے معاونین سمندر کی راہ سے روانہ ہوئے مگر وہ خود ایشیائے کوچک کی طرف سے روانہ ہوا اور اثنائے سفر میں ایک ندی کو عبور کرتے ہوئے اپنی زرہ کے بوجھ سے ڈوب کر مر گیا - (سنہ ۱۱۹۰ء)

---

[1] جرمنی کے وہ رئیس جن کو شہنشاہ کے انتخاب کا حق تھا -

باب یازدہم

شاہنشاہی اور پاپائیت کا مقابلہ

دَورِ آخر

فریڈرک نے ایک جگہ اپنے بیٹے کی نسبت ٹھہرائی تھی جس کے سیاسی اثرات سے نہ صرف اطالیہ، جرمنی اور پاپائیت بلکہ یورپ کے تمام متمدن ممالک متاثر ہونے والے تھے۔ اس نے اپنے بیٹے ہنری کی نسبت کانس ٹنس رئیسۂ نیپلز سے کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی یورپ کی یہ عظیم الشان سلطنت جس کا شمار اب تک شہنشاہ کے خطرناک اور زبردست مخالفوں میں تھا، خاندان ہوہین سٹافین کے شہنشاہوں سے وابستہ ہوگئی اور یہ عیاں ہوگیا کہ شہنشاہی اور پاپائیت میں آئندہ جو مقابلہ ہوگا اس میں یہ سلطنت شہنشاہی کی طرفدار ہوگی حالانکہ اس وقت تک اس نے پاپائیت کے لئے نمایاں خدمات انجام دیے تھے۔

ہنری اپنے باپ کے انتقال کے بعد ۱۱۹۰ء میں ہنری ششم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے مقبوضات نہایت وسیع تھے اور حوصلے بلند۔ اُسے آرزو تھی کہ شہنشاہی کو جو اب تک انتخاب پر مبنی تھی موروثی بنا دے اور اگر اس کو اپنے اس مقصد میں کامیابی ہوجاتی تو آیندہ صدیوں میں جرمنی کے حصے بکھرے نہ ہونے پاتے۔ اس کے علاوہ قسطنطنیہ کی مشرقی شہنشاہی پر حملہ آور ہونے کا بھی اس کے دل میں خیال تھا۔ مگر

یہ مقاصد محض خواب وخیال تھے کیونکہ اس کا پہلا فرض یہ تھا کہ اپنے آبائی مقبوضات میں اپنا اقتدار قائم کرے۔ جرمنی اور نیپلز اور سسلی کا ایک شہریار کے زیر نگیں ہو جانا پاپایان روما کو نہایت شاق تھا۔ اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ ان ملکوں میں سے کسی ایک جگہ بھی اس کی قوت مستحکم نہ ہونے پائے۔ جرمنی میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی اور جنوبی اطالیہ میں تخت کا ایک دعویدار مسمی ٹانکریڈ پیدا ہو گیا تھا جس کی پشت پر خود پوپ تھا۔ ایک زمانے کی جنگ وجدال کے بعد ہنری اپنے دشمنوں پر غالب آ گیا مگر اس کے انتقال (۱۱۹۷ء) کے قبل ہی یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ پاپایانِ روما اس کی قائم کردہ جدید نا جرمن و جرمن حکومت کے مخالف ہیں۔

ہنری نے ۱۱۹۷ء میں انتقال کیا۔ اس کا لڑکا فریڈرک بالکل کم سن تھا اور ایک مدت تک یورپ کی تاریخ پر اس کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ سال ما بعد یعنی ۱۱۹۸ء میں تخت پاپائی پر انوسینٹ ثالث متمکن ہوا۔ یہ پوپ گریگری اعظم اور گریگری ہفتم کا ہم رتبہ تھا جنھوں نے قرون وسطیٰ میں پاپائیت کی قوت کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا۔ نئے پوپ نے پاپائیت کے دعاوی کا نہایت شرح وبسط سے اظہار کیا شہنشاہی اور پاپائیت کے تعلق کو وہ چاند اور سورج کے تعلق سے تشبیہ دیتا تھا یعنی جس طرح کہ چاند سورج کے نور مستعار سے چمکتا ہے، اسی طرح شہنشاہی کی روشنی پاپائیت سے ماخوذ ہے۔ قرون وسطیٰ میں اس قسم کے استعارے دلائل کی حیثیت رکھتے تھے اور اس لئے شہنشاہی کے موئیدوں پر اس تشبیہ کی تردید اسی طرح فرض ہو گئی تھی گویا کہ وہ تشبیہ ایک خاص دلیل تھی اہل اطالیہ کو جرمنوں سے سخت تنفر تھا۔ اس تنفر کا اظہار انوسینٹ نے اپنی زبان سے بھی کیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ میں اطالیہ سے اس قابل نفرت قوم کو خارج کر دوں گا۔ اس کے مکتوبات میں اس قسم کے خیالات درج ہیں مثلاً "تم جانتے ہو کہ یہ خادم (پوپ) کیا ہے جسے حضرت مسیح نے اپنے پیروؤں کا حکمراں بنایا ہے۔ یہ مسیح کا خلیفہ اور پطرس کا جانشین ہے۔ اس کا درجہ خدا اور انسان کے مابین ہے خدا سے نیچے مگر انسان سے اوپر، خدا سے کم مگر انسان سے زیادہ، وہ سب کے اعمال کا حَکَم ہے مگر اس کے اعمال کا کوئی حَکَم نہیں کیونکہ انجیل میں مذکور ہے کہ "میں (مسیح) حَکَم ہوں۔ ایک دوسرے مقام پر اس نے لکھا ہے۔ "حضرت مسیح نے پطرس کیلئے

نہ صرف کلیسا کی حکومت چھوڑی بلکہ تمام دنیا کی حکومت۔ جس پوپ کے خیالات اس قسم کے ہوں اس کا دنیاوی حکام خصوصاً شہنشاہ سے برسرِ پرخاش ہونا لازمی تھا۔ یہ بھی واضح رہے کہ کوئی شہنشاہ تخت نشیں ہوتے وقت خواہ کتنا ہی حسن اعتقاد کا اظہار کیوں نہ کرے گر پوپ کے ساتھ مدت تک دوستانہ تعلقات برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ دونوں کی مخالفت نہ تو شخصی تھی اور نہ اختلاف خیالات ہی پر مبنی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ دونوں کے دعاوی ایسے تھے کہ مصالحت ناممکن تھی۔

تاج شہنشاہی کے امیدواروں میں کسی ایسے شخص کے نہ ہونے کی وجہ سے جو تمام انتخاب کنندہ رئیسوں کے پسندِ خاطر ہوتا شہنشاہی میں سخت ابتری پڑ گئی۔ بالآخر دو امیدوار باقی رہ گئے فلپ (خاندانِ ہوہن اسٹافین) اور آٹو ابن ہنری "اسد" (خاندان گوئلف) پوپ نے آٹو کو اپنے ظلِ عاطفت میں لے لیا اور سنہ ۱۲۰۱ء میں وہ شہنشاہ تسلیم کر لیا گیا پوپ کا وہ مرہونِ منت تھا اور اس احسان کا اعتراف اس نے نہایت فراخ دلی سے کیا اور ایک تحریر میں لکھا کہ میری بادشاہی خاک میں مل جاتی اگر کلیسائے مسیحی نے میرا پلہ بھاری نہ کر دیا ہوتا۔ اطالیہ میں آکر اس نے پوپ کے ساتھ متعدد مراعات کیں اور سنہ ۱۲۰۹ء میں روما کے اندر جشن تاجپوشی منایا۔ لیکن کسی پوپ اور شہنشاہ کی دوستی دیرپا نہیں ہو سکتی آٹو چہارم جب سلطنت نیپلز کا دعویدار ہوا تو پوپ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گیا کیونکہ جنوبی اطالیہ اور جرمنی کا اتحاد اس کے مصالح کے منافی تھا۔ جرمنی میں بہت سے آدمیوں کو اس نے آٹو کی مخالفت پر آمادہ کر دیا اور ہنری ششم کے بیٹے فریڈرک کو فریڈرک دوم کے لقب سے بادشاہ و شہنشاہ تسلیم کر کے اس کے مقابلے پر کھڑا کر دیا۔ گرمی ہنگامہ میں اس طرح پوپ نے نادانستہ ایک ایسے شخص کو آٹو چہارم کے زیر کرنے کے لئے برسرِ اقتدار کر دیا جو آیندہ چل کر تخت پاپائی کا سب سے خطرناک دشمن ثابت ہونے والا تھا۔ اپنے اقتدار کو پوری طور سے قائم کرنے کے لئے فریڈرک کو زمانہ دراز تک جنگ و جدال میں مصروف رہنا پڑا اگر پوپ اور شاہ فرانس کی تائید اس کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ برخلاف اس کے آٹو کا کوئی یار و مددگار جان شاہ انگلستان کے علاوہ نہ تھا۔ سنہ ۱۲۱۴ء میں جنگ بووی نیس ہوئی جس سے آٹو چہارم کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اور فریڈرک کی قوت و اقتدار شہنشاہی کو استحکام پہنچا۔ انگلستان اور فرانس

کی تاریخ میں بھی اس جنگ کی خاص اہمیت ہے۔

پوپ انوسینٹ سوم کی قوت اس وقت یورپ میں نصف النہار پر تھی اور کسی پوپ کو اسقدر عروج حاصل نہ ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنے مخالف کو مرتبۂ شہنشاہی سے معزول کر دیا تھا اور اپنے منتخبہ شخص کو شہنشاہ بنا دیا تھا۔ سسلی، سویڈن، ڈین مارک اراگان، اور پرتگال نے پوپ کی جاگیری سیادت مبہم طریقے پر تسلیم کر لی تھی انگلستان کے معاملات میں بھی اس کی مداخلت کارگر ثابت ہوئی اور اس نے اپنے اثر سے اسٹیفن لینگ ٹن کو کین ٹربری کا اسقف اعظم مقرر کرا دیا۔ شاہ جان سالانہ خراج دینے پر آمادہ ہو گیا اور پوپ کی ماتحتی قبول کر لی۔ یورپ میں اس وقت سب سے زبردست بادشاہ فلپ آگس ٹس شاہ فرانس تھا۔ مگر اس طاقت ور بادشاہ نے بھی پوپ کی مخالفت کی وجہ سے ملکہ ان گی بڑگا کو اپنے محل میں پھر داخل کر لیا اور دوسری بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہوا۔

واضح رہے کہ پاپائیت اور شہنشاہی کے مناقشے کے تیسرے اور سخت ترین دور کے آغاز کے قریب ایک نئی مذہبی تحریک پیدا ہونے اور فقراء کے جدید سلسلوں کے وجود میں آنے سے پاپائیت کو حد درجہ تقویت پہنچی۔ انوسینٹ سوم اور اس کے جانشینوں کو فران سس کن اور ڈومی نی کن فقراء سے وہی مدد ملی جو گریگوری ہفتم کو کلونی کی تحریک سے ملی تھی اور سکندر سوم کو سس ٹرشین تحریک سے۔ فقرا کے ان سلسلوں نے کلیسائے کاتھولیکیہ کی مدد ایسے نازک وقت میں کی جب کہ وہ سخت خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ کلیسا نہایت قوی تھا مگر عوام کو اس کے ساتھ ہمدردی باقی نہ تھی یا ممکن ہے کہ اس کی قوت کے بڑھنے ہی کے سبب سے یہ برگشتگی پیدا ہو گئی ہو۔ اس کے عبادات اور مواعظ میں لاطینی زبان مستعمل تھی جس سے عوام کے دلوں پر اس کی تعلیم کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ غربا اور خصوصاً اہالیان شہر یا تو کلیسا کے مخالف تھے یا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ فرانس کے جنوبی اضلاع، لانگے ڈوک اور پروانس میں ایسی مذہبی اور خلاف مذہب تحریکیں وجود میں آ رہی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل جانے کا اندیشہ تھا یعنی ان اضلاع میں ایسے خیالات کی تبلیغ ہو رہی تھی جن جن کو کلیسا نے ملحدانہ قرار دیا تھا۔ ان میں سے بعض خیالات ایسے تھے جو بمقابلہ کلیسا کی تعلیم کے حقیقی

و مسیحی مذہب سے قریب تر تھے۔ مگر بعض ایسے بھی تھیں "مثلاً الحاد آل بی گین سی" جو مذہب کے بنیادی اصول اور اخلاق کے منافی تھے۔ ان خطرات کی وسعت کو مبالغے کی نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے اور یہ تحریکیں جن کا مرکز جنوبی فرانس تھا۔ اگر اپنے حال پر چھوڑ دیجاتیں تو شاید رفتہ رفتہ ناپید ہو جاتیں۔ مگر روما کے حکام کو اس تحریک سے سخت انتشار ہوا اور اس کو دفع کرنے کا اہتمام ہونے لگا۔ اسی غرض سے سینٹ فران سِس اور سینٹ ڈامی نِک کے سلسلے قائم ہوئے جن کے مقاصد یہ تھے کہ غربا کو پھر کلیسا کی طرف متوجہ کیا جائے وعظ دیسی زبانوں میں ہوں اور ان ملحدانہ خیالات کی تردید کی جائے جو جنوبی فرانس میں پھیلے ہوئے تھے۔

سینٹ فران سِس، اَسِی سی واقع وسط اطالیہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فرانس سے تجارت کرتے تھے اور اگر ان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم واقع نہ ہوتا تو وہ بھی اسی تجارت میں مشغول ہو جاتے۔ مگر انھوں نے دنیادی آرزؤں اور جلب منفعت کے ذرایع کو خیرباد کہہ کے فقر کی دشوار گزار راہ اختیار کی اور کلیسا اور اپنے ہم جنسوں کی خدمت پر کمربستہ ہو گئے۔ ان کی زندگی کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہو گئے ہیں۔ مگر تاریخی ذرایع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی پاک اور بے لوث تھی اور وہ حسن اخلاق کے بہترین نمونہ تھے۔ ابتداءً ان کی تحریک کا کوئی خاص نظام نہ تھا رفتہ رفتہ چند ہم خیال ان کے شریک ہو گئے۔ ان کی جماعت مختلف مقامات کا دورہ کرتی رہی، پند و مواعظ اور خدمت خلق اس کا کام تھا اور خیرات پر اس کا گزارہ۔ کچھ روز کے بعد انھیں فقرا کے ایک خاص گروہ کے قایم کرنے کا خیال آیا جسے وہ "سلسلۂ غربائے اَسِی سی" کہنا چاہتے تھے۔ پوپ نے اولاً اس تحریک کو تسلیم کرنے یا اس کی امداد کو منظور کرنے میں تذبذب کا اظہار کیا کیونکہ یہ ایک بالکل جدید چیز تھی اور کلیسا سے ابتدائی زمانے کے بعد سے فقر و استغنا کے یہ جذبات بالکل معدوم ہو چکے تھے۔ مگر سینٹ فرانسس کے تقدس اور صداقت کو بالآخر کامیابی ہوئی اور ۱۲۱۰ء میں یہ جدید سلسلہ قایم ہو گیا۔

سینٹ ڈامی نِک، سینٹ فران سِس کا معاصر تھا۔ اور اس کی تحریک بھی سینٹ فران سِس کے مماثل تھی۔ "الحاد آل بی گین سی" کی وجہ سے جس کا ذکر آچکا ہے ایک

صلیبی جنگ شروع ہو گئی تھی۔ جس میں سینٹ ڈامی نک بھی شریک تھے۔ ان کا عقیدہ ابتدا سے یہ تھا کہ گو ملحدوں کے ساتھ سختی سے کام لیا جا سکتا ہے مگر ان کا جوش رفع کرنے کے لئے اخلاقی اسلحہ سے بھی کام لیا جائے تو بہتر ہے۔ ان کا قول تھا کہ جوش کے مقابلے کے لئے جوش چاہیے، فروتنی کے مقابلے کیلئے فروتنی مصنوعی تقدس کے مقابلے کے لئے حقیقی تقدس اور باطل عقائد کے مٹانے کے لئے صحیح عقائد کی تبلیغ ہونا چاہیے۔ ۱۲۱۳ء میں ان کے "سلسلۂ واعظین" کا قیام عمل میں آیا جس کا خاص منشا یہ تھا کہ جنوبی فرانس سے ملحدانہ عقائد دفع کئے جائیں۔

فقراء کے ان دونوں گروہوں کا ذکر ہم ایک ہی جگہ کریں گے۔ کیونکہ ان کے خصائل مشترک تھے۔ ان میں اور راہبوں کی قدیم جماعتوں میں یہ فرق تھا کہ انھیں صرف اپنی ذاتی نجات کی فکر نہ تھی کہ وہ ہمیشہ مراقبے ہی میں رہتے بلکہ وہ خلق اللہ کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور اس کو معاصی سے بچانا چاہتے تھے۔ ان جدید فقراء کی خانقاہیں نہ تھیں بلکہ وہ اہل دنیا کے بیچ میں رہتے اور بنی نوع انسان کی خدمت کو عبادت الٰہی خیال کرتے تھے۔ ابتداءً ان کا یہ اصول تھا کہ ان کا کوئی مسکن ہو اور نہ کوئی عمارت خاص ان کے لئے بنائی جائے، لیکن جب عمارتیں تیار ہونے لگیں تو یہ ثابت ہو گیا کہ فقراء کی یہ جماعتیں اپنے مقدس بانیوں کے مقاصد سے ہٹ گئیں۔ ان کے نظام میں امور ذیل قابل غور ہیں:- اولاً کسی قسم کی جائداد اُن کے لئے حرام تھی اور گزر اوقات کی صورت دریوزہ گری پر تھی۔ ثانیاً ان کا خاص کام یہ تھا کہ وعظ کہیں اور ان کے وعظ ہر ملک کے عوام کی زبان میں ہوں۔ ثالثاً انھیں فرماں برداری اور باہمی محبت کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ ان کی ایک چوتھی خصوصیت بھی تھی اور اسی کو انکی قوت کا راز کہہ سکتے ہیں یعنے ان سلسلوں کی ایک شاخ تھی جسے ٹرشیئری (تھیرا) کہتے تھے۔ اس شاخ میں ایسے مرد اور عورتیں داخل تھیں جو نہ تو اس سلسلہ کا لباس پہنتے تھے نہ اس کے اصول کے بالکلیہ تبع تھے۔ یہ لوگ معمولی اہل دنیا کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان سلسلوں سے ان کا تعلق صرف اسقدر تھا کہ ان کی ہر طرح سے تائید کرتے تھے۔

ان دونوں سلسلوں کی ترقی حیرت ناک تھی۔ فرانسسکی (Grey) فقراً اور ڈامی نکی "سیاہ فقرا" کے نام سے مشہور تھے۔ مغربی یورپ کے شہروں میں یہ

بہت جلد پھیل گئے لیکن جنوبی یورپ میں ان کی تعداد و قوت زیادہ تھی۔ ان کی تنظیم نہایت دلچسپ ہے اور فی الجملہ کارگر بھی تھی۔ مگر ان کا اثر صرف تنظیم کی خوبی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کی بانیوں کی یادگار بطور خود ایک مستقل قوت تھی۔ سینٹ ڈامی نِک کی یاد لوگوں کے دلوں میں ایک زمانہ تک قائم رہی جو انھیں "دین کا پہلوان" کہتے تھے۔ مگر سینٹ فرانسس کی زندگی اور خصائل کا اثر خاص کر زیادہ تھا، لوگ ان کی زندگی کو، پارسائی جوش مذہبی اور محبت کا آئینہ سمجھتے تھے۔ ان کے بہت سے قصے مشہور تھے کہ وہ غریبوں کی خدمت کرتے تھے۔ کوئی شخص خواہ کیسے ہی نفرت انگیز مرض میں مبتلا ہو، اس کی تیمارداری بہ طیب خاطر کرتے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اپنی مخالفت یا معاصی کی وجہ سے اُن کی بیدریغ خدمت سے فائدہ حاصل نہ کرسکتا۔ اپنے گوناگوں مشاغل کے باوجود ہر وقت ہشاش بشاش رہتے اور اپنے رفیقوں کے ساتھ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے ان کی محبت کا دائرہ صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ جانور بھی اس میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی چڑیوں کو وعظ سنایا کرتے۔ غرض تیرھویں صدی میں ایک جدید قوت تھی جس کا اثر اب بھی زائل نہیں ہوا۔ فقرا کی ان جماعتوں کے قیام سے پاپائیت کو اپنے دنیاوی مخالف کے مقابلے میں خاطرخواہ مدد ملی۔

اس جدید جد و جہد میں دنیاوی اور شہنشاہی قوت کا نمایندہ ایک عجیب و غریب شخص شہنشاہ فریڈرک دوم تھا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ پوپ کی عنایت اور تائید سے شہنشاہ ہوا تھا، اور پھر مخالف ہو گیا تھا جس سے ظاہر ہے کہ پوپ کے دشمنوں میں سے اکثر وہ لوگ تھے جو ایک زمانہ میں اس کے گہرے دوست تھے۔

بیان کیا گیا ہے کہ شہنشاہ فریڈرک دوم نہایت کم رو اور پستہ قامت تھا اور اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اس کے بال بھی سرخ تھے۔ مگر اس کی دماغی قوتیں غیر معمولی تھیں اور اس کے خیالات اور افعال میں ایک خاص اچھوتا پن پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کے معاصر اسے "اعجوبۂ روزگار" کہتے تھے۔ قرون وسطےٰ کی تاریخ میں کوئی اور بادشاہ اس کے مثل نہیں گزرا۔ کیونکہ وہ بارھویں تیرھویں صدی کے خیالات اور عقائد سے کوسوں دور تھا۔ اس کے خیالات زمانۂ مابعد کے بادشاہوں۔ یعنی ہنری ہفتم (انگلستان) یا لوئی یازدہم (فرانس) یا عہد نشأۃ جدیدہ کے اطالوی خودسر حکام سے

ملتے جلتے تھے۔ جنوبی اطالیہ کے عوام کی زبان میں شعر کہتا تھا اس لیئے اسے ہم اس تحریک
کے آغاز کا بانی کہہ سکتے ہیں جو یورپ کی جدید زبانوں میں ادبیات کے فروغ کا باعث
ہوئی۔ سائنس اور فلسفے کی ترقی میں بھی اسے دلچسپی تھی جس کا اس وقت جنوبی یورپ میں
چرچا تھا۔ نیپلز کی یونیورسٹی کی اس نے بنا ڈالی اپنے منشور میں اس نے لکھا ہے کہ میں نے
یہ یونیورسٹی اس غرض سے قائم کی ہے کہ تشنگان علم اپنے ملک میں رہکر اپنی پیاس بجھائیں
اور انھیں تلاش علم کی خاطر ممالک غیر میں جا کر دریوزہ گری کی ضرورت نہ پڑے۔ سالیرنو میں
اس نے طب کا ایک مدرسہ قائم کیا اور پالیرمو میں ایک چڑیا خانہ بنایا جس میں جنگلی جانور
تھے۔ اس کے عہد حکومت میں جنوبی اطالیہ اور سسلی میں علوم عقلی اور فنون لطیفہ کو ایسا فروغ
حاصل ہوا کہ زمانہ مابعد میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس علمی تحریک میں نہ صرف
ٹامس اکوی ناس (قرون وسطےٰ کا نہایت جید عالم) کی طرح مسیحی علما ہی شریک تھے
بلکہ مسلمان علما کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور ان کے ساتھ بھی شہنشاہ کے تعلقات
نہایت دوستانہ تھے۔ مگر یہ علمی مشاغل اور ان کی ترویج پوپ کو اس عالم میں بھی ضرور
ناگوار گزرتی۔ اگر اس کے اور شہنشاہ کے درمیان مخاصمت کے دوسرے اسباب بھی
نہ ہوتے۔ پوپ نے متعدد فرامین میں شہنشاہ کو کافر اور ملحد قرار دیا۔ مگر ان فرامین سے
یہ نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ بنائے الحاد کیا تھی۔ پوپ نے حالت غضب میں اعلان کیا تھا
کہ شہنشاہ روح کو غیر فانی خیال نہیں کرتا۔ اور حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم اور حضرت
مسیح کو کذاب اعظم کہا کرتا ہے۔ مگر یہ محض واہی تباہی باتیں تھیں۔ فریڈرک اپنے
آپ کو ہمیشہ مسیحی کہا کرتا تھا اور کیتھولک کلیسا کا مؤید تھا۔ اس کا قول تھا کہ میں کلیسا سے
برسر پیکار نہیں ہوں بلکہ اہل کلیسا کی عیاشی اور بد اخلاقی کا دشمن ہوں۔ میں پادریوں کی
جماعت کا دشمن نہیں ہوں میں ادنیٰ سے ادنیٰ پادری کو بھی اپنے باپ کے برابر سمجھتا ہوں
اور عزت کرتا ہوں بشرطیکہ وہ دنیاوی معاملات سے الگ تھلگ رہے۔ کلیسا میں جو
گندگی، کمزوری اور خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کا باعث پادریوں کا خبث باطن،
حرص اور لوٹ مار کی عادت ہے۔ میں بھیڑوں (مسیحیوں) کو ان کے نگہبان (پادریوں)
کے سپرد کر دوں گا، عامۂ خلق کو ان کے اسقف دیدوں گا اور دنیا (عالم مسیحی) کو اسکا
روحانی باپ (پوپ) دوں گا۔ میں اس گرگ صفت ظالم کے چہرے سے تقدس کی نقاب

اٹھادوں گا اور اسے مجبور کردوں گا کہ دنیاوی معاملات اور دنیاوی کرّوفر کو خیرباد کہکے مسیحؑ کے مقدس نقش قدم پر چلے" اس سے ظاہر ہے کہ وہ کلیسا کی تعلیم فقر و استغنا سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ پاپائیت سے جب جد و جہد شروع ہوگئی تو اس کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں افراد قوم بھی کلیسا کے سردار ہو سکتے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ شہنشاہ کی بھی اس قدر عزت و حرمت ہونی چاہیے جتنی کہ پوپ کی، اور ممکن ہے کہ وہ اس عزت و حرمت کا خود بھی خواہشمند ہو۔ ان اقوال سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا رجحان بھی کلیسا کو دنیاوی حکام کے تحت میں لانے کی طرف تھا جیسا کہ انگلستان میں ہنری ہشتم کے زمانہ میں پایا جاتا تھا۔

فریڈرک دوم جرمنی اور شمالی اطالیہ پر شہنشاہ کی حیثیت سے حکمراں تھا اور نیپلز او سسلی پر موروثی بادشاہ کی صورت میں فرمانروا بنا۔ آٹو اعظم کے زمانے سے شہنشاہوں کو جرمنی اور اطالیہ کے متضاد مفاد اور خصایص کی وجہ سے جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہ فریڈرک کے زمانے میں اور بھی بڑھ گئی تھیں اور اس کے عہد حکومت میں ہمیں توضیح کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ اطالیہ میں شہنشاہوں کے اپنی ذاتی سلطنت کے معاملات میں مشغول رہنے سے جرمنی میں کیا خرابیاں پیدا ہوتی تھیں۔ فریڈرک نے پوپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں سسلی اور جرمنی کے تعلق کو مستقل نہ ہونے دوں گا۔ اور جنوبی حکومت (نیپلز و سسلی) اپنے بیٹے کو عطا کردوں گا جو پوپ کے تحت میں رہے گا۔ مگر اس نے وعدہ خلافی کی اور بجائے جرمنی کے اس نے اطالیہ میں حکومت کرنا زیادہ مناسب خیال کیا کیونکہ نیپلز میں وہ فی الحقیقت بادشاہ تھا اور جرمنی میں اس کے زبردست باجگذار رئیسوں کی زبردست قوت کی وجہ سے اس کا اقتدار محض برائے نام تھا۔ سسلی کی سلطنت میں اس نے تمام رقیب قوتوں کو زیر کرکے اقتدار شاہی کو تقویت دی۔ اس نے اگر جاگیرداروں کی قوت کو توڑا نہیں تو ضعیف تو ضرور کر دیا۔ اور امراء کے قلعوں کو مسمار کرکے، ان کے بجائے شاہی قلعے بنوائے۔ شہروں کی آزادی بھی کم کر دی گئی تمام افراد سلطنت شاہی قوانین کے پابند اور شاہی عدالتوں کی تحت میں کر دیئے گئے۔ صوبجات اس کے حکام کے زیر انتظام تھے اور جملہ انتظامی امور پر اس کے امیر عدل (جسٹس ڈی شیئر) کی نگرانی تھی۔ یہ انتظامات قبل از وقت تھے اور ان سے

نشو و نمائے حریت کی امید نہ ہوسکتی تھی مگر انھیں انتظامات کی برکت سے نیپلز اور سسلی کو وہ خوش حالی حاصل ہوئی جو یورپ کے دوسرے ملکوں کو نصیب نہ تھی۔ مگر اس کی فوجی قوت اتنی زبردست نہ تھی کہ سسلی اور جرمنی دونوں پر وہ اپنا اقتدار قایم رکھ سکتا۔ اسی لئے بسا اوقات اسے مجبوراً جرمنی میں اپنے شہنشاہی فرائض سے دست کش ہونا پڑتا تھا۔ اسی لئے اس کے عہد میں جرمنی اور سسلی کے نشو و نما میں ایک بیّن فرق ہے۔ مثلاً نیپلز اور سسلی میں نظام جاگیری یا تو بیخ و بنیاد سے اکھڑ گیا تھا یا بادشاہ کے قابو میں آگیا تھا۔ مگر جرمنی میں جاگیردار شہنشاہ کے خطرناک رقیب ہوگئے تھے۔ ۱۲۳۹ء میں فریڈرک نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے جرمنی کے رئیسوں کو وسیع عدالتی اور فوجی اختیارات حاصل ہوگئے۔ اور بڑے بڑے رئیس تو عملاً مرکزی حکومت سے آزاد ہوگئے۔ جرمنی کے بڑے بڑے شہر اب تک شہنشاہی کے سرگرم موید تھے مگر ان کے ساتھ جو خاص مراعات اب تک ملحوظ تھے وہ امراء کو رام کرنے کے لئے کم کردیئے گئے۔ اور بعض صورتوں میں تو بالکل کالعدم ہی کردیئے گئے۔ مگر باوجود ان رعایتوں کے یا یہ کہیئے کہ انھیں رعایتوں کی وجہ سے امراء نے ان کے خلاف بغاوت کردی اور خود فریڈرک کا بیٹا ہنری ان کے ساتھ ہوگیا جو ولی عہدی کی حالت امید بیم سے گھبرا کے تخت و تاج کا جلد تر مالک ہونا چاہتا تھا۔ ہنری کو شکست ہوئی اور ۱۲۳۵ء میں اسے حبس دوام کی سزا ہوئی۔ اس کے بعد شہنشاہ نے جرمنی میں پھر اپنے اقتدار و جبروت کا سکہ جمانا چاہا مگر امرا کی قوت بہت بڑھ چکی تھی اور شہنشاہ اطالیہ کے انتظامی امور میں منہمک ہوگیا۔ اس لئے حسب سابق شہنشاہی جرمنی میں ایک کارگر حکومت قائم کرنے میں اس دفعہ بھی ناکامی ہوئی اور انیسویں صدی تک اس قسم کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوئی۔

فریڈرک اور پاپائیت کے درمیان جو امور مابہ النزاع تھے وہ دستوری معاملات سے متعلق نہ تھے۔ ہنری چہارم اور پاپائیت میں جنگ اسقفوں کے انتخاب کے اصول پر ہوئی تھی۔ اور فریڈرک اول نے پوپ سکندر سوم کے انتخاب کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ مگر فریڈرک دوم اور پاپائیت کے باہمی مناقشوں کی بنیاد محض شخصی رقابت پر تھی اور دونوں علانیہ طور پر اطالیہ میں اپنے اپنے تفوق کے لئے دست و گریباں تھے۔ فریڈرک تخت نشینی کے بعد ہی پوپ کے احکام کے مطابق جس کا وہ مرہون منت تھا جنگ صلیبی

کی طرف متوجہ ہوا اور پوپ بھی اصرار کر رہا تھا کہ وہ اپنے عہد و پیمان کو پورا کرے۔ جنگ ہائے صلیبی کی تاریخ ہم اس کے بعد کسی باب میں بیان کریں گے جس سے معلوم ہوگا کہ جنگ صلیبی کا جوش اس زمانے میں بالکل سرد ہو رہا تھا۔ اور یہ تحریک اپنے اعلیٰ مقاصد سے ہٹ کر تجارتی اور قومی مفاد کا آلہ بن گئی تھی۔ فریڈرک کو زمانۂ سابق کے حامیان جنگہائے صلیبی سے کوئی نسبت نہ تھی، غیر مسیحیوں پر حملہ آور ہونے کی اسے ہوس نہ تھی اور اس کے علاوہ وہ خوب جانتا تھا کہ اپنی قوت کے مستحکم کرنے کے لئے جنوبی اطالیہ میں اس کا قیام ضروری ہے۔ مگر پوپ اسے مجبور کر رہا تھا اس لئے ۱۲۲۷ء میں وہ برنڈیسی سے مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ مگر چند ہی روز میں ناگہانی بیماری کا بہانہ کر کے واپس آگیا پوپ خوب جانتا تھا کہ یہ اس کی چال ہے، اس لئے اس نے شہنشاہ کو کلیسا سے خارج کر دیا۔ جو شخص کلیسا سے خارج کر دیا گیا ہو، جنگ صلیبی میں شریک نہ ہو سکتا تھا مگر اسکے باوجود فریڈرک ۱۲۲۸ء میں پھر روانہ ہوا۔ اس جنگ صلیبی میں اس کی کارروائیاں اتنی ہی عجیب و غریب تھیں جتنے کہ اس کی روانگی کے حالات تھے۔ اس کا بیان تھا کہ مسلمانوں سے مجھے کوئی پرخاش نہیں اور فی الحقیقت اس میں مذہبی تعصب نہ تھا۔ اس کی دوسری بیوی یروشلم کے نام و نہاد بادشاہ کی بیٹی تھی جس کی بنا پر وہ وہاں کی حکومت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ سفارتی کارروائیوں اور نامہ و پیام سے اس نے مسلمانوں سے مسیحی زائرین کے لئے ایسے مراعات حاصل کر لئے تھے جو حامیانِ جنگ صلیبی کو زمانۂ سابق میں جنگ و جدال سے حاصل نہ ہوئے تھے۔ یروشلم کی برائے نام حکومت بھی اسے مل گئی۔ پھر وہاں جب وہ پہنچا تو اسے کوئی پادری ایسا نہ ملا جو تاج اس کے سر پر رکھتا کیونکہ وہ کلیسا سے خارج ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے قربان گاہ سے تاج اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھ لیا۔ اطالیہ جب وہ واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ پوپ نے اس کے خلاف جنگ صلیبی کا اعلان کر دیا ہے اور پوپ کی فوجیں نیپلز میں لوٹ مار کر رہی ہیں فریڈرک نے ان فوجوں کو وہاں سے نکال باہر کیا۔ ۱۲۳۰ء میں پوپ نے اس سے صلح کر لی اور کلیسا میں اسے پھر داخل کر لیا۔

مگر یہ مصالحت چند روزہ تھی اور اس کے بعد جو جنگ شروع ہوئی وہ اور بھی سخت تھی۔ پوپ گریگوری نہم کی عمر اس وقت قریب قریب سو سال تھی۔ مگر اطالیہ

کے سیاسیات میں اسے اس وقت بھی بہت کچھ دخل تھا۔ موجودہ نزاع ابتداً فریڈرک اور پوپ کے درمیان نہ تھی بلکہ لمبارڈی کے ان شہروں سے تھی جو فریڈرک اول کی تذلیل کے باعث ہوئے تھے۔ اس شہنشاہ کی ہزیمت اور معاہدۂ کانس ٹنس کے بعد سے شہری تحریک کو اطالیہ میں سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی۔ شمال کے اتحاد لمبارڈی کی طرح وسطی اطالیہ میں بھی شہری اتحاد وجود میں آ گئے تھے۔ جو شہنشاہ کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ گزشتہ نصف صدی میں اطالیہ کے شہروں میں ایک خاص تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ دولت اور شان وشوکت میں انھوں نے خاصی ترقی کی تھی اور اپنی قوت کا انھیں احساس ہو گیا تھا۔ مگر ان شہروں میں مخالف طبقات کے مناقشوں سے انکی آزادی طوایف الملوکی سے متبدل ہو رہی تھی۔ اس لئے بعض مقامات میں کسی غیر سلطنت کا باشندہ حاکم اعلیٰ (پوڈیس ٹا) مقرر کر دیا جاتا تاکہ کم از کم کچھ روز تک امن وامان رہے۔ بعض شہروں میں۔ جابر حکام برسر اقتدار تھے۔ جن میں سربرآوردہ ویرونا کا حاکم اے زی لی نو تھا۔ فریڈرک نے شہروں کو محکوم کرنے کا قصد کر لیا اور ذاتی مخاصمت کی وجہ سے ان شہروں میں سے اکثر اس کے حلیف ہو گئے، اے زی لی نو بھی سرگرمی کے ساتھ اس کی مدد کرتا رہا۔ دونوں جانب خونخوار درندوں کی طرح لڑتے رہے اور ابتداءً فریڈرک کو کامیابی ہوئی۔ ۱۲۳۷ء میں متحد شہروں کو شکست ہوئی تھی۔ اور آثار یہ تھے کہ فریڈرک کو فتح کامل حاصل ہو گی۔ مگر اس کے بعد پوپ شہروں کی تائید میں شریک جنگ ہو گیا۔ اس کے اغراض حسب سابق تھے۔ شہنشاہ پھر کلیسا سے خارج کر دیا گیا۔ پوپ گری گوری نہم نے اس اثناء میں انتقال کیا اور پوپ انوسنٹ چہارم جو شہنشاہ کا دوست تھا۔ اس کا جانشین ہوا۔ مگر نیا پوپ اپنی خدمت پر فائز ہو کر دوستی کے حقوق بھول گیا۔ ۱۲۴۵ء میں کلیسا کی ایک کونسل لیان میں منعقد ہوئی جس نے نہایت سختی کے ساتھ فریڈرک پر لعن وطعن کی اور اعلان کیا کہ وہ فرعون ہیروز اور نیرو سے کم نہیں۔ شہنشاہ نے بھی جواب دینے میں کوتاہی نہیں کی اس نے اعلان کیا کہ پوپ اس کو معزول نہیں کر سکتے۔ "تخت وتاج مجھے خدا نے دیا ہے۔ اور پوپ اور کونسل اور شیطان مجھے اس دولت سے محروم نہیں کر سکتے۔ کیا ایک کمینہ اور ذلیل آدمی شہنشاہ کو معزول کر سکتا ہے جس کا دنیا میں کوئی ہمسر نہیں ہے۔" مگر پوپ نے

شہنشاہ کی معزولی کا حکم نافذ کر دیا۔ اور جرمنی میں اس کے بجائے ایک دوسرے شہنشاہ کو کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد مخاصمین کا جوش اور بھی بڑھ گیا۔ فقراء کی جماعتیں جن کا زور بڑھا ہوا تھا عوام میں شہنشاہ کے خلاف نفرت پھیلا رہی تھیں۔ لمبارڈی کے بعض شہر فریڈرک کے طرفدار ہو گئے، مگر زیادہ تر اس کی مخالفت پر آمادہ تھے۔ ۱۲۴۷ء میں فریڈرک پارما کا محاصرہ کر رہا تھا مگر وہاں اسے سخت شکست ہوئی اور تین سال کے بعد جب اس نے ۱۲۵۰ء میں انتقال کیا تو اس جنگ کے نتیجہ کے متعلق کوئی صحیح پیشین گوئی نہیں کیجا سکتی تھی۔

اس کے انتقال سے صورت حال بالکل بدل گئی جس سے سخت تعجب ہوتا ہے سلطنت نیپلز کی قوت میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی اطالیہ اور جرمنی کی حالت وہی تھی۔ بلکہ فریڈرک اپنے دشمنوں کا کم از کم ہم پلّہ تھا۔ مگر اس کے جانشین پوپ اور اس کے حلیفوں کے مقابلے سے عاجز رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جو قابلِ تحسین حکومت اس نے سسلی اور نیپلز میں قایم کی تھی اس کا وجود امراء کو شاق تھا اور عوام ابھی تک کسی شمار میں نہ تھے۔ حکومت کی کامیابی کا انحصار فریڈرک کی زبردست قوت ارادی و تنظیم پر تھا اور اس کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی سلطنت کی یہ عمارت جو اس نے نہایت احتیاط کے ساتھ تعمیر کی تھی، یکایک گر پڑی اور اس کے صرف کھنڈر باقی رہ گئے اس کا بیٹا کونراڈ چہارم اس کا جانشین ہوا۔ کونراڈ جرمنی میں تھا جب کہ اس کے باپ نے انتقال کیا اور چونکہ وہاں کسی زبردست حکومت کے قیام کا امکان نہ تھا اس لئے قسمت آزمائی کے لئے اس نے اطالیہ کا رخ کیا اور نیپلز میں داخل ہوا جہاں اس کے قدم جم گئے ہوتے مگر چند ہی روز کے بعد ۱۲۵۴ء میں موت نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس نے ایک بیٹا چھوڑا جو کونراڈ ونو کے نام سے مشہور ہے مگر نیپلز اور سسلی میں اس خاندان کا سردار مین فریڈ ہوا جو فریڈرک دوم کا ناجایز بیٹا تھا۔ ۱۲۶۱ء میں اربن چہارم پوپ ہوا جو فرانسیسی تھا۔ اور خاندان ہوہن اسٹافین کو جنھیں وہ "بچگان مار" کہا کرتا تھا۔ معزول کرنے کے لئے ہر طرح سے آمادہ تھا۔ پوپ نے سسلی کا تاج چارلس رئیس آنجو کو پیش کیا جو فرانس کے مقدس بادشاہ کا بھائی تھا۔ چارلس نے حکومت قبول کر لی۔ اس لئے مان فریڈ کو فرانسیسی فوجوں سے لڑنا پڑا۔ چارلس کے ساتھ

پوپ نے ایک نہایت سخت معاہدہ کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا طرز عمل کسقدر دنیاداری اور دنائت پر مبنی تھا۔ اس معاہدے کی خاص شرط یہ تھی کہ اگر چارلس پوپ کے خزانے میں اپنا خراج وقت پر نہ داخل کرے گا تو کلیسیا سے خارج کر دیا جائے گا مان فریڈ کچھ روز تک فرانسیسی فوج کا مقابلہ کرتا رہا۔ مگر بالآخر بی نی وین ٹو کے قریب ایک جنگ ہوئی جس میں اسے شکست ہوئی اور وہ خود کام آگیا۔ چالس نے نیپلز اور سسلی پر قبضہ کر کے سخت گیری اور مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے اہل ملک کون راڈنو کی طرف متوجہ ہوئے جس کی عمر ۱۲۶۶ء میں صرف سولہ سال کی تھی۔ مگر یہ لڑکا ہونہار اور ذی حوصلہ تھا۔ اس لئے اپنی موروثی سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اطالیہ پر اس نے شمال کی طرف سے حملہ کیا، خود روما میں اس کا گرم جوشی سے استقبال ہوا مگر جب ٹاگ لیاکورہ میں فرانسیسی فوجیں اس کے مقابلے پر آئیں تو اس کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔ اسی سال اگست میں نیپلز کے بازار میں قتل کر دیا گیا اور اور اس کے ساتھ خاندان ہوہین اسٹافین کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ جس نے قرون وسطیٰ کے درمیانی زمانے میں یورپ کے سیاسیات میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ پاپائیت کو فتح تو ہوئی مگر اس فتح کے حاصل کرنے کے لئے اس نے ایسے ذرائع سے کام لیا جو اس کے لئے باعث ذلت تھے اور یہ فتح کچھ روز کے بعد اس کی قوت کے لئے شکست سے زیادہ مضر ثابت ہوئی۔ اس طویل نزاع میں اعلیٰ ترین مذہبی اصول اقتدارات پاپائیت کی جانب سے ذاتی اغراض کے حصول کے لئے قربان کر دیئے گئے اور پاپائیت کو اس فتح کے صرف ۳۰ سال کے بعد ایسی سخت شکست ہوئی جس کا اس کی تاریخ میں کہیں اور ذکر نہیں۔ اور یہ شکست فرانسیسیوں کے ہاتھوں ہوی۔ جن کو اس موقع پر پاپائیت نے اپنی فتح کا آلہ بنایا تھا۔

مگر قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں جرمنی کے چند واقعات کا ذکر ضروری ہے جنکی اس کی آئندہ تاریخ میں خاص اہمیت ہے۔ دسویں صدی سے سولھویں صدی تک جرمنی کی تاریخ کی بیّن خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اثر مشرق کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایلب ندی اب اس کی مشرقی سرحد نہ تھی بلکہ یہ سرحد اب اُوڈر ندی تک پہنچ چکی تھی۔ اوڈر کے پار تمام مشرقی سرحد پر جرمنی کے مقابلے میں غیر جرمنی قومیں تھیں